مرغزار

اقبال نمبر

گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

اقبال نمبر

پرنسپل

پروفیسر چوہدری محمد نواز

منتظم اعلیٰ

پروفیسر اسلام خاں سعید
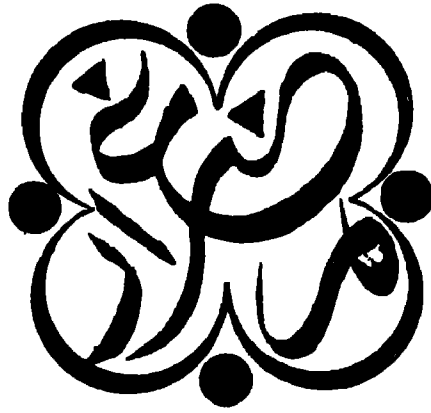
مدیر اعلیٰ

عبدالجبار شاکر

استاد ادبیات اردو

اپریل، ۱۹۸۰ء

— معاونین —

محمد اقبال، سال چہارم

توفیق احمد، سال اول

سخنے چند

"مرغزار" کا "اقبال نمبر" دیر آید درست آید کے مصداق پیش خدمت ہے۔ تعلیمی اداروں کے مجلے بنیادی طور پر طلبہ میں تحریری ذوق اور تخلیقی حس بیدار کرنے کا ایک ذریعہ اور تربیت گاہ ہیں۔ اس لئے ان میں اعلیٰ ادبی پرچوں کا معیار تلاش کرنا بے سود ہوگا، تاہم اس شمارے میں ایک نئے انداز سے اقبال کے فکر و فن پر طلبہ کے حلقہ سے باہر، کچھ ایسی چیزیں جمع کی گئی ہیں۔ جو سرمایۂ فخر و مباہات تو نہیں مگر فکر اقبال کی تفہیم میں ضرور مؤثر ثابت ہوں گی۔

"اقبالیات" اردو ادب کی تاریخ میں اب ایک اہم اور وقیع موضوع ہے۔ جس کا ایک اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ تینتالیس سالوں میں اس موضوع پر (چھوٹی بڑی، کتب یا رسائل کی شکل میں) ۱۲۳۴ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ اگر اس تعداد کا تقابل یورپ کے عظیم ادیب اور ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیئر کے ساتھ کیا جائے جس پر گزشتہ چارسو سالوں میں ۶۵۵ کتب لکھی گئی ہیں، تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اقبال کی شخصیت اور اس کے فکر و فن پر لکھنے والوں کے لئے کتنی جاذبیت ہے۔ "افراطِ اقبال" کے اس ذخیرے میں کام کی چیزیں بہت کم ہیں۔ مگر مستقبل میں اس موضوع پر بہت اہم چیزیں لکھی جائیں گی۔ اب تو عالمی ادب میں بھی اس موضوع کو خاطرخواہ پذیرائی مل رہی ہے۔ اور مختلف جامعات میں "مطالعہ اقبال" کے خصوصی مراکز قائم ہو رہے ہیں۔ جہاں اقبال کے فکر و فن پر جدید علمی انداز اور طریق تحقیق کے مطابق کام ہو سکے گا۔

اس شمارے میں کچھ تحریریں ایسی ہیں جنہیں ۱۹۷۷ء میں "عالمی اقبال کانگرس" کے موقع پر جمع کیا گیا، لیکن ان میں سے کچھ کی اشاعت کا مرحلہ اب طے ہو رہا ہے۔ اس موقع پر ملکی اور غیر ملکی ماہرین اقبالیات یکجا جمع تھے۔ ان سے اقبال کے فکر و فن پر انٹرویو لینے کا موقع ملا اور یہ کوشش اب "ارمغانِ اقبال" کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہے۔ اس میں اُنیس۱۹ انٹرویو اردو میں اور بیس۲۰ انگریزی میں لکھے گئے ہیں۔ اس موقع پر

مجھے ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ ان میں سے بعض حضرات نے "مرغزار" کے لئے خصوصی پیغام بھی عطا فرمائے جواب شاملِ اشاعت ہیں۔ اس ضمن میں جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال اور جناب ممتاز حسین بسمل کی نگارشات کے لئے بھی یہ ادارہ ممنون احسان ہے۔ اس مجلے کا سرورق جناب اسلم کمال کے موقلم کا شہکار ہے موصوف نے مصوری کی دنیا میں اپنے لئے ایک منفرد اسلوب پیدا کیا ہے۔ ادارہ اس پیش کش پر ان کا تہہ دل سے مشکور ہے۔

علامہ کے افکار و نظریات کا مرکز ومحور ان کا فلسفہ خودی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بجا سہی مگر انہوں نے اپنے کلام میں نوجوانوں کو جو خصوصی اہمیت دی ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس مجلے کی بہت سی تحریریں طلبہ کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ان میں اسلوب یا فن کے اعتبار سے کوئی نہ کوئی کمی یقیناً ہوگی۔ مگر اخلاص اور جذبے کی فراوانی نمایاں ہے۔ نوجوان نسل کا یہ حضرت علامہ کی خدمت میں ایک اظہارِ عقیدت ہے۔ جو یقیناً قبول پائے گا۔ ہمیں اس امر کا مکمل احساس ہے کہ اس میں بہت سی فروگزاشتیں ہونگی اور یہ مجلہ وہ نہیں ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہیئے تھا۔

خاطرِ مسلسل است پریشاں چوں زلفِ یار
عیبم مکن کہ در شبِ ہجراں نوشتہ ایم

(ادارہ)

———:———

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش - اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

مجلس اقبال گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

أسعدني وشرفني أن تطلب الى مرغزار مجلة گورنمنٹ کالج شیخوپورہ كلمة اوجهها الى اخوتي الأحبة في وطني الاسلامي پاکستان لقد زرت لاهور منذ بضعة وانا اليوم ازورها ثانية والأمل أن أزورها في مستقبل الأيام إن كان في العمر صلة. فإن لقائي مع اهلي وعشيرتي الأقربين وأخوتي في الدين هو ما يتمناه كل مؤمن موقن بذكر أن الدين الحنيف حض المسلمين اجمعين على التآلف والتعاطف وجعلهم في أخوة وجعلهم في وحدة. فلله الحمد أن يسر لنا هذا.

لقد كان لقاؤنا للاحتفال بذكرى شاعر الاسلام والانسانية محمد اقبال الذي حث المسلمين والعالمين على الاعتصام بحبل الله وهو من ذلك يبشر بأحكام الدين الحنيف. وان النفس لتطيب محققة رغبته بعد طول زمان رحم الله شاعر الاسلام وأحسن له المثوبة، فقد حقق الله على يديه خير الكثير وسلام الله ورحمة وبركاته على اخوتي في پاکستان،

جمعني الله واياهم على خير

ڈاکٹر حسین مجیب المصری

قاہرہ، مصر

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش - اگرچه سر نتراشد قلندری داند

مجلس اقبال گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

الى مجلة مرغزار
قوفرنمنت كولدج شيخوپوره

بمناسبة زيارتي للمدينة العظيمة الشاعرة
لاهور دار اقبال شاعر المشرق والمشتركة في
المؤتمر العالمي لمرور مائة عام على ميلاد
الشاعر العظيم يسعدني أن أحيي المجلة
الزاهرة وشبابها الطامحين وأن أكبر
فيهم الروح الاسلامية الخالدة التي غرسها
رسولنا محمد صلى الله عليه وسلم وأحياها الشاعر
الخالد محمد اقبال راجيا الله جل وعلا أن
يوفقهم في أداء رسالتهم السامية وأن يعيد
للاسلام عزته ومنعته إنه سميع مجيب

مبارك المغربي
القاضي بدار القضاء ام درمان
السودان

لاهور ١٦/٢/٧٧

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش ۔ اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

مجلس اقبال گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

مجھ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ مجلس اقبال گورنمنٹ کالج شیخوپورہ کی طرف سے "مرغزار" برابر نکل رہا ہے، میری تمنا ہے کہ اس میں ایسے مضامین برابر نکلتے رہیں جن کو پڑھ کر وہاں کے طلبہ اقبال کے شاہین بنیں، اور شاہین بن کر اپنی آئندہ زندگی میں مرد مومن بن کر رہیں، پاکستان سے اسلامی دنیا کی توقعات بہت زیادہ وابستہ ہیں، یہ توقعات پاکستان کے نوجوانوں میں پوری ہو سکتی ہیں۔ اس لئے میری دعا ہے کہ وہ اللہ تبارک تعالےٰ کی تمام نعمتوں اور برکتوں سے سرفراز ہو کر اپنی آئندہ زندگی بسر کریں۔

لاہور
۹ دسمبر ۷۷ء

سید صباح الدین عبدالرحمن
سکریٹری دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش ۔ اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

مجلس اقبال گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

مجھے اس اطلاع سے دلی مسرت ہوئی ہے کہ گورنمنٹ کالج شیخوپورہ نے میگزین "مرغزار" کا اقبال نمبر عنقریب شائع ہو رہا ہے ۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبہ اقبال کے فکر و فن پر زیادہ سے زیادہ کام کریں تاکہ کلام اقبال کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آسکیں ۔

اقبال کی از سرِ نو دریافت کا کام اقبال صدی تقاریب کے ساتھ جس طرح شروع ہو رہا ہے اسے اور آگے بڑھانا ہماری نئی نسل کا کام ہے ۔ اس وقت ہم لوگ اقبال کو اپنے فکر و نظر کے سانچوں میں ڈھال رہے ہیں ۔ نئی نسل کا فرض یہ ہے کہ ہمارے ان خود ساختہ سانچوں سے اقبال کی شخصیت کو باہر نکال کے اس کے فکر و فن کا از سرِ نو تعین کریں تاکہ اقبال کا یہ شعر ایک بھرپور معنویت کے ساتھ ہمارے سامنے آسکے

خود کو علامہ سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

جگن ناتھ آزاد

(پروفیسر جگن ناتھ آزاد)

صدر شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں ۔

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش ۔ اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

مجلس اقبال گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

علامہ اقبالؒ کے صد سالہ جشنِ ولادت کے سلسلے میں اِس سال لاہور میں منعقد ہونے والی انٹرنیشنل کانگریس میں شرکت کرنے کے دوران جناب عبدالجبار شاکر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اُن سے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ کالج کی طرف سے علامہ اقبالؒ پر ایک خصوصی مجلّہ شائع کیا جا رہا ہے۔ چونکہ علامہ اقبالؒ پر میں نے تھوڑا بہت کام کیا ہے، اِس لئے قدرتی طور پر مجھے اِس موضوع سے گہری دلچسپی ہے۔ مجھے اُمید ہے، مجوّزہ مجلّہ علامہ اقبالؒ کی تعلیمات کی صحیح عکاسی کرے گا، اور ہماری معلومات میں گراں قدر اضافے کا باعث بنے گا۔

ابوسعید نورالدین
۷ر دسمبر ۱۹۷۷ء

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین
ڈھاکہ، بنگلہ دیش

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش ۔ اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

مجلس اقبال گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

مرغزار مجله شیخوپوره اقبال گورنمنٽ ڪالج شيخوپوره ٻي طرفان ڇاپايو پيو وڃي، جنهن حالت ۾ ان ۾ اقبال تي مضمون هوندا ته مونکي پوري پڪ آهي ته شاگردن جو ڌيان مذهب ۽ اخلاق جي طرف چڱي طرح ڇڪيو، اقبال جي مضمونن ۾ هميشه قرآن حڪيم ۽ رسول اڪرم صلی الله عليه وسلم جي طرف نهايت عمدي طرح اشارا هوندا آهن.

خلیل

صدر حيدرآباد سنڌ

ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل
حیدر آباد (سندھ)

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش - اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

مجلس اقبال گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

بسم الله الرحمن الرحيم

ليسرني أن أعرب عن بالغ سعادتي ومسرّتي لوجودي بين الاخوة الباكستانيين في بلدهم الحبيب باكستان التي تحتفل بالذكرى المئوية لمولد العلامة والمفكر الإسلامي الكبير محمد اقبال، وهي الذكرى التي قدمنا من مصر وقوم الكثير من العلماء والباحثين من مختلف أرجاء العالم للاحتفال بها. وإنني أشكر جامعة البنجاب على توجيهها الدعوة لشخصي لحضور المؤتمر، كما أشكر كل من عاونوا في العمل على نجاح المؤتمر الكبير، ولا يسعني إلا أن أتوجه بالشكر لمجلة «مرغزار» التي خصصت بهذه المناسبة عدداً عن العلامة محمد اقبال يضم عدداً من المقالات والتحقيقات عن شاعر الإسلام وشاعر الشرق. وأدعو الله أن يوفقنا جميعا للعمل على ما فيه خير أمتنا الاسلامية وخير الإنسانية جمعاء. والسلام.

الدكتور محمد السعيد جمال الدين
الأستاذ المساعد بكلية الآداب
بجامعة عين شمس بالقاهرة
مصر

٤/١٢/١٩٧٧

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش ـ اگرچه سر نتراشد قلندری داند

مجلس اقبال گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

پیام به مجلهٔ مرغزار ـ گورنمنت کالج شیخوپوره

اقبال شاعر جماعت است واشعار وی درباره‌ی زندگی جماعت فقیر و کارگر است. اقبال مسلمان واقعی و درست بود. اقبال به انسان و آزادی انسان واجتماع اهمیّت میداد. برای پیشرفت اجتماع پاکستان خواندن کتابها و عقاید اقبال ضروری است. هر فرد باید نفع خود را در بین جماعت ببیند زیرا تنها شیطان از جماعت دور است.

فرد را ربط جماعت رحمت است
جوهر ویرا کمال از ملّت است

۱۱ دسامبر لاهور ۱۹۷۷

دکتر صبری تبریزی

مُمتاز حُسین بسمل

میں نے ۱۹۳۷ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخلہ لیا۔ میں نے ایک گاؤں میں پرورش پائی تھی۔ وہاں ہمیشہ چاروں طرف مانوس چہرے دکھائی دیتے تھے۔ اور اجنبی صورتیں کمیاب ہوتی ہیں۔ اور عام طور پر گاؤں کے باشندے اپنی محدود دنیا کو بیکراں دنیا سمجھتے ہیں۔ میں نے درسی کتابوں نثر نگاروں اور شعرائے کرام کے اسمائے گرامی پڑھے تھے۔ اور انہیں ایک دوسری مگر حیرت انگیز دنیا کے باشندے تصوّر کرتا تھا۔ والد مرحوم نثر نگاروں میں سے محمد حسین آزادؔ اور شعراء میں سے علامہ اقبالؒ کے بہت مداح تھے۔ اس لیے مجھے بھی ان دونوں حضرات سے دلی عقیدت تھی۔

جب میں لاہور آیا تو میری دلی تمنا تھی۔ کہ اڑ کر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ اتفاق سے میرے ایک ہم جماعت شہر سیالکوٹ میں کوچہ حکیم حسام الدین کے رہنے والے تھے۔ اور مذکورہ محلہ کی مسجد میں علامہ اقبال نے قرآنِ پاک کا درس شروع کیا تھا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ علامہ اقبال ان کے عزیزوں میں سے تھے۔ اور ان کی وساطت سے مجھے علامہ مرحوم سے ملاقات کا شرف حاصل ہو سکتا تھا۔

میں ان دنوں فیض باغ میں اپنے مرحوم چچا کے ہاں رہتا تھا۔ ایک دن میرے ہم جماعت وہاں تشریف لائے اور یہ مژدہ سنایا کہ میں اسی روز علامہ کا دیدار حاصل کر سکوں گا۔ وہ مجھے شاہ عالمی کے اندر ایک عمارت میں لے گئے۔ جسے پری محل کہتے تھے۔ اور وہاں کانگرس کمیٹی کا دفتر تھا۔ چونکہ میرے ہم جماعت دوست کانگرسی خیالات کے تھے۔ اسلئے ان کا کانگرس کے دفتر میں جانا میرے لئے تعجب خیز نہیں تھا۔ وہاں ایک نوجوان لڑکا موجود تھا۔ جس کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ وہ سیالکوٹ کے مشہور افسانہ نویس پنڈت سدرشن کا بھتیجا تھا۔ پنڈت صاحب نے ایک رومال میں لپٹا ہوا کپڑے کا ایک گٹھڑا اٹھا لیا۔ میں نے دریافت کیا۔

"یہ کیا ہے؟"

مجھے جواب ملا "تقریب بہر ملاقات"

ان دنوں علامہ مرحوم میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہائش پذیر تھے۔ ہم تینوں اس کے صدر دروازے پر پہنچ گئے مگر میرے ساتھیوں میں سے کوئی بھی اندر داخل ہونے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ اتفاق سے اس وقت میرے محترم استاد جناب پروفیسر محمود شیرانی صاحب مرحوم علامہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اہنوں نے مجھے دیکھ لیا۔ چونکہ وہ مجھ پر

سے زیادہ مہربان تھے۔ اس لیے فوراً باہر تشریف لائے۔ اور دریافت فرمایا "ممتاز کیا بات ہے؟"
میں نے جواب میں عرض کیا "علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کی تمنا ہے" پر دنیسر صاحب فوراً مجھے اور میرے ساتھیوں کو علامہ کی خدمت میں لے گئے۔ میں یہاں ایک امر کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

علامہ اقبال کے مشہور دوست اور ساتھی جناب محمد دین صاحب فوق مرحوم میرے وطن مالوف گھڑتل ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد منشی لدھے خاں مرحوم میرے دادا حکیم فضل الدین افضل کے شاگرد تھے اور جناب محمد دین صاحب فوق نے کچھ عرصہ ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔ لاہور میں منشی لدھے خاں مرحوم اور علامہ مرحوم ایک دوسرے کے قریب رہائش رکھتے تھے۔ اور علامہ کے ہمراہ ادبی محفلوں میں شرکت فرماتے تھے۔ وہ علامہ مرحوم کا کلام بڑے مرحوم دادا جان کے پاس لے جاتے تھے۔ اور ان کا اردو فارسی کا کلام علامہ مرحوم کے ملاحظہ کے لیے لایا کرتے تھے۔ اس طرح علامہ مرحوم منشی لدھے خاں مرحوم اور منشی محمد دین صاحب فوق مرحوم کی وساطت سے میرے مرحوم دادا جان کو جانتے تھے۔

جب میں علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا تو سلام عرض کرنے کے بعد میں نے کہا "میں فوق صاحب کا ہم وطن ہوں"

آپ نے فوراً کہا "وہاں ایک حکیم صاحب تھے"۔

میں نے جواب دیا "وہ میرے دادا جان تھے"

میرا تعارف مکمل ہو چکا تھا۔ اب کرچہ حکیم حسام الدین والے میرے ہم جماعت آگے بڑھے اپنا اور پنڈت جی کا تعارف کرایا۔ پھر رومال میں سے دروازوں اور کھڑکیوں والا ایک دیسی پردہ علامہ مرحوم کے سامنے رکھ دیا۔

پنڈت جی کہنے لگے "جناب یہ پردہ ایک جولاہے نے ایک مہینہ کی محنت شاقہ کے بعد تیار کیا ہے اگر ہم اسے خرید لیں تو اس کے بیوی بچے دو چار مہینے پیٹ بھر کر روزی کما سکتے ہیں"

علامہ مرحوم نے کمال سنجیدگی سے جواب دیا۔

"پنڈت جی آپ کا جذبہ قابل تعریف ہے۔ اگر دس ہزار میں سے نو سو ننانوے آدمی جب کوئی چیز خریدنے جاتے ہیں، تو ان کے سامنے دوکاندار یا محنت کش کا مفاد ہرگز نہیں ہوتا۔ وہ اپنی کمائی میں سے کم از کم قیمت پر بہتر سے بہتر چیز خریدنا چاہتے ہیں۔ یہ پردہ انگلش پردے کے مقابلہ میں بدنما اور مہنگا ہے اسلئے آپ اسے بمقابلہ فروخت نہیں کر سکیں گے۔

پنڈت جی نے دوسروں پر اثر انداز ہونے کے لیے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور پھر کہنے لگے۔
"جب میں اخبارات میں ہندو مسلم فسادات کے متعلق پڑھتا ہوں تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ ہم ایک قوم ہیں۔ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں"
علامہ مرحوم نے فرمایا "پنڈت جی میں آپ سے متفق نہیں ہوں" یہ تمام فسادات ہندو قوم ایک خاص منصوبے

کے تحت کر رہا ہی ہے۔ تاکہ مسلمانوں کو مرعوب کیا جا سکے"۔

"ہندوؤں کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟" پنڈت جی نے انجان بن کر پوچھا۔ پنڈت جی جلد یا بدیر انگریز ہندوستان کے باشندوں کو حکومت خود اختیاری دینے پر مجبور ہوگا۔ برطانوی طریقہ پارلیمانی حکومت دراصل اکثریت کی حکومت ہوتی ہے اگر موجودہ حالات میں ہندوستان آزاد ہوگیا۔ تو یہاں ہندوؤں کی حکومت ہوگی۔ ہندو جانتا ہے کہ مسلمان دبنے والی قوم نہیں ہے۔ اور وہ ہندوؤں کی غلامی پر صاد نہیں کرنے لگی۔ اس لئے وہ جان بوجھ کر فساد کروا رہے ہیں۔ تاکہ مسلمان ڈر جائیں اور وقت آنے پر بلا مزاحمت ہندوؤں کی اطاعت قبول کر لیں۔

"جناب میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ پنڈت جی نے کہا۔" ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں۔ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو غلام بنانے کا تصور نہیں کر سکتے"۔

علامہ اقبال نے ذرا مسکرا کر پنڈت جی سے پوچھا۔

"پنڈت جی آپ کی رہائش کس محلہ میں ہے"؟

"جناب سنت نگر میں رہتا ہوں" پنڈت جی نے جواب دیا۔

"پنڈت جی آپ فیض باغ میں کیوں نہیں رہتے"؟ اس کا جواب مجھ سے سن لیجئے۔ آپ فیض باغ میں اس لئے نہیں رہتے کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی ہے اگر آپ ہندو اور مسلمان کو ایک قوم سمجھتے تو آپ کو فیض باغ یا سنت نگر میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا"۔

پنڈت جی خاموش رہے۔

اس کے بعد علامہ مرحوم نے دریافت کیا" پنڈت جی آپ کا مکان اپنا ہے یا کرایہ کا ہے"؟

"جناب کرایہ کا ہے"۔ پنڈت جی نے جواب دیا۔

آپ نے اپنا مکان بنانے کے لئے کوئی زمین خریدی ہے"؟ علامہ مرحوم نے دریافت فرمایا۔

"جی ہاں" پنڈت جی نے جواب دیا" میں نے کرشن نگر میں ایک پلاٹ کا سودا کیا ہے"۔

"پنڈت جی آپ نے مصری شاہ میں پلاٹ کیوں نہیں خریدا"؟ علامہ مرحوم نے دریافت کیا۔

پنڈت جی خاموش رہے۔

"پنڈت جی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں مسلمان آباد ہو رہے ہیں۔ اور آپ ہندو اور مسلمان کو ایک قوم تصور نہیں کرتے ــــــ پنڈت جی آج لاہور میں ہندو مسلمانوں کی بستیاں الگ الگ آباد ہو رہی ہیں اس لئے کل ان کے شہر بھی الگ الگ ہوں گے۔ اور میری نگاہیں وہ زمانہ بھی دیکھ رہی ہیں، جب ان کے ملک بھی الگ الگ ہوں گے"۔

میں اس وقت چند غیر ملکی شرفاء علامہ مرحوم سے فیض یاب ہونے کے لئے آئے تھے۔
میں اٹھا جھک کر سلام کیا۔ اور اس محفل سے تشنہ واپس آگیا۔

میرا ذہن سیاسی نہیں ہے۔ مجھے اب بھی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اس وقت تو میں اس کے ابجد سے بھی واقف نہیں تھا۔ میں اقبال کو محض ایک خوش گو شاعر اور ترجمان حقیقت سمجھتا تھا۔ گران زریں لمحات پر سیاست طاری رہی۔ اس لئے جب میں واپس آیا۔ تو میرا دل کچھ بجھا بجھا سا تھا۔

"خودی ایک حقیقت ہے جو اگر عمیق اور پختہ تر شخصیت پیدا کر جائے تو ثبات و استحکام حاصل کر سکتی ہے۔"

اقبال ایک باپ کی حیثیت سے

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال

میں نے سن رکھا ہے کہ میری پیدائش سے چند سال قبل ابا جان شیخ احمد سرہندی مجدد الفؒ ثانی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایک بیٹا عطا کرے۔ آپ نے حضرت مجددؒ سے یہ عہد بھی کیا کہ اگر خداوند تعالیٰ نے انہیں بیٹا دیا تو اسے ساتھ لے کر مزار پر حاضر ہوں گے۔

آپ کی دعا پوری ہوئی اور کچھ عرصہ بعد جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے اپنے ہمراہ لے کر دوبارہ سرہند شریف پہنچے اس سفر کے دھندلے سے تصورات میری نگاہوں کے سامنے ابھرتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ ان کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہو رہا ہوں۔ گنبد کے تیرہ و تار مگر پُر وقار ماحول نے مجھ پر ایک ہیبت سی طاری کر رکھی ہے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے میں اپنے چاروں طرف گھور رہا ہوں۔ جیسے میں اس مقام کی خاموش ویرانی سے کچھ کچھ آشنا سا ہوں۔ ابا جان نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا، پھر انہوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ منگوایا اور دیر تک پڑھتے رہے۔ اس وقت ہم دو ہی تربت کے قریب بیٹھے تھے۔ گنبد کی خاموش اور تاریک فضا میں ان کی آواز کی گونج ایک ہولناک ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو امڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔ ایک روز وہاں ٹھہرنے کے ہم گھر واپس آ گئے۔ لیکن مجھ پر اس راز کا انکشاف نہ ہوا کہ آخر اس مزار پر جانے کا مقصد کیا تھا۔ اور وہ آنسو کس لیے تھے؟ مجھے یاد ہے، میں بچپن میں اکثر یہی سوچا کرتا تھا۔

اپنی زندگی میں ابا جان نے مجھے شاذ ہی کوئی ایسا موقع دیا ہوگا جس سے میں ان کی شفقت یا اس الفت کا اندازہ لگا سکتا جو انہیں میری ذات سے تھی۔ والدین بچوں کو اکثر پیار سے بھینچا کرتے ہیں۔ انہیں گلے سے لگاتے ہیں، انہیں چومتے ہیں۔ مگر مجھے آپ کے خدوخال سے کبھی اس قسم کی شفقت پدری کا احساس نہ ہوا۔ بظاہر وہ کم گو اور سرد مہر سے دکھائی دیتے تھے۔ مجھے کبھی گھر میں اودھم مچاتے اِدھر اُدھر بھاگتے دیکھ کر مسکراتے تو مربیانہ انداز سے۔ گویا کوئی انہیں مجبوراً مسکرانے کو کہہ رہا ہو اور اکثر اوقات تو میں انہیں اپنی آرام کرسی یا چارپائی پر آنکھیں بند کئے اپنے خیالات میں مستغرق پاتا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انہیں مجھ سے محبت نہ تھی، سراسر غلط ہے ان کی محبت کے اظہار میں ایک اپنی طرز کی خاموشی تھی۔ جس میں عنفوانِ شباب کے وقتی ہیجان کا فقدان تھا یا اس کی نوعیت فکری یا تخیلی تھی جس تک پہنچنے کی اہلیت میرا ذہن نارسا نہ رکھتا تھا۔ بہر حال جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ میں ان سے محبت تھوڑی کرتا تھا اور خوف زیادہ کھاتا تھا۔

ہر گھر کی باتیں چھوٹی چھوٹی ہوا کرتی ہیں مگر ان سے گھر کے افراد کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض اوقات والدین میں اپنے بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں تنازعہ بھی ہو جایا کرتا ہے۔ اسی طرح ابا جان اور اماں جان میں میری وجہ سے کئی بار تکرار ہو جاتی مثلاً اماں جان کو میرے متعلق ہر گھڑی یہی فکر دامنگیر رہتا کہ جب کبھی میں اکیلا کھانا کھاؤں پیٹ بھر کر نہیں کھاتا۔ اس لئے وہ ہمیشہ مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا کرتیں یہاں تک کہ میں آٹھ نو برس کا ہو گیا لیکن پھر بھی مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھانے کی عادت نہ پڑی ابا جان اس بات پر بارہا ناراض ہوئے کہ تم اسے بگاڑ رہی ہو۔ اگر یہ جوان ہو کر بھی خود کھانا نہ کھا سکا تو کیا ہوگا؟ ہم لوگ رات کو اکثر خشکہ کھایا کرتے تھے لہٰذا اب یوں ہوتا کہ بطور احتیاط چمچہ میری پلیٹ کے قریب رکھ دیا جاتا، مگر کھانا اماں جان ہی کھلایا کرتیں۔ ابا جان کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ دبے پاؤں زنانے میں آیا کرتے۔ اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پاتی بہر حال جب بھی اماں جان مجھے کھلا رہی ہوتیں۔ ان کا دھیان باہر ہی رہتا اور جونہی وہ ابا جان کے قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنتیں اور اپنا ہاتھ پھرتی سے علیحدہ کر کے چمچہ میرے آگے رکھ دیتیں اور میں خود کھانا کھانے میں مشغول ہو جاتا مجھے یقین ہے کہ ابا جان کئی مرتبہ اس کا سراغ لگا چکے تھے۔ لیکن وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے بعد چلے جایا کرتے۔

مَیں بچپن میں بے حد شریر تھا پڑھائی سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے اماں جان سے مار کھانا میرا معمول بن چکا تھا۔ اماں جان بچوں کی پرورش کے سلسلہ میں ایک ایسے اصول کی پابند تھیں جو نہایت سخت تھا۔ وہ اکثر کہا کرتیں کہ اولاد کو کھانے کو دو سونے کا نوالہ لیکن دیکھو قہر کی نظر سے۔ اسی اصول کے پیش نظر، گو میں ان کے ہاں بارہ برس کے شدید انتظار کے بعد پیدا ہوا۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے مجھ پر کبھی ایسی شفقت یا محبت کا اظہار کیا ہو۔ جس کی توقع بچے اپنی ماؤں سے رکھتے ہیں۔ البتہ میں نے اتنا سن رکھا ہے کہ وہ جب کبھی مجھے پیار کرتیں سوتے کے عالم میں کرتیں۔ تاکہ مجھے علم نہ ہو سکے۔ شاید اسی لئے بچپن میں میرے ذہن سے یہ خیال بھی گزرا کرتا کہ میری ماں دراصل میری حقیقی ماں نہیں، بلکہ سوتیلی ماں ہے۔

بہر حال ابا جان سے میں نے بہت کم مار کھائی ہے۔ میرے لیے ان کی جھڑک ہی کافی ہوا کرتی۔ گرمیوں میں دوپہر کے وقت دھوپ میں ننگے پاؤں پھرنے پر مجھے کئی بار کوسا گیا۔ ابا جان جب کبھی بہت برہم ہوتے تو ان کے منہ سے ہمیشہ یہی الفاظ نکلتے "احمق آدمی! بیوقوف!!" مجھے یہاں ابا جان سے مار کھانے کا ایک واقعہ یاد آگیا ہے: بچپن میں مجھے روز ایک آنہ خرچ کرنے کو ملا کرتا اسے خرچ کر چکنے کے بعد خواہ میں اماں جان کی کتنی ہی منتیں کرتا، مجھے مزید کچھ نہ ملتا، بلکہ ہر لحہ ان کے ناراض ہونے کا احتمال رہتا۔ ایک دفعہ اتفاق یوں ہوا کہ کوئی مٹھائی بیچنے والا ہمارے گھر کے سامنے سے گزرا۔ مٹھائی دیکھ کر میں للچا گیا، لیکن جیب خالی تھی۔ اسے بٹھا تو لیا اور اماں جان کے پاس دوڑا آیا کہ شاید کچھ مل جائے۔ مگر انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ طبیعت ضدی تھی خیال آیا کہ اس خوانچہ فروش سے پوچھوں کہ پیتل لے کر مٹھائی دے سکتا ہے یا نہیں۔ بدقسمتی سے اس نے ہاں کہہ دی۔ بس پھر کیا تھا سائے کی طرح ابا جان کے کمرے میں گھسا اور بڑے ٹیبل فین کے پیچھے لگے پیتل کے پُرزے کو اتار کر خوانچہ فروش کو دے آیا اور مٹھائی لے لی۔ لیکن شامتِ اعمال سے ہمارا شوفر ادھر سے گزر رہا تھا، اس نے آکر ابا جان سے شکایت کر دی۔ میں خوشی خوشی اچھلتے کودتے جو گھر کی حدود میں داخل ہوا تو مجھے اطلاع ملی کہ ابا جان بلا رہے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے ان کے کمرہ میں گیا۔ وہ اپنی آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور تین چار تھپڑ میری گردن پر

جما دیتے۔ ابّا جان جب کبھی مجھے مارتے تو گدّی پر مارتے وہ زور سے تو نہ مارتے مگر گدّی جسم کا ایک ایسا حصّہ ہے، جہاں چوٹ زیادہ لگتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر ان سے مار کھانے کا اتفاق ہُوا تو اس کی وجہ نوکروں کو بُرا بھلا کہنا یا جھوٹ بولنا تھی۔

بعض اوقات ایسا بھی ہُوا کہ اگر ابّا جان نے میری کسی شرارت پر مجھے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو امّاں جان درمیان میں آ کھڑی ہوتیں اور انہیں روک دیا۔ یا اگر امّاں جان نے مجھے ضرورت سے زیادہ پیٹا تو ابّا جان خفا ہُوئے کہ بچے کو اس بے دردی سے نہیں مارنا چاہیئے۔ ایک دفعہ میں آنکھوں پر پٹی باندھے اماں جان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ ٹھوکر لگی اور مُنہ کے بل گر پڑا۔ جس کی وجہ سے ہونٹ کٹ گیا اور مُنہ سے خون جاری ہو گیا۔ اتفاق سے اسی لحظہ ابّا جان زنانے میں داخل ہوئے اور اچانک میرے مُنہ سے خون بہتا دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔

ہم گھر میں شور نہ مچا سکتے تھے۔ اگر میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ دالان میں کبھی کرکٹ کھیل رہا ہوتا تو ہمیں حکم ملتا کہ یہاں مت کھیلو اور ہم منہ لٹکائے وہاں سے چل دیتے۔ لیکن بعض اوقات وہ ہمارے کھیل میں خود بھی شریک ہو جایا کرتے۔ ہمارے ہاتھ ان کی طرف گیند پھینکتے پھینکتے تھک جاتے مگر وہ بلا تھامے ٹھپ ٹھپ کرتے رہتے ایک دفعہ وہ اندر بیٹھے تھے میں نے ہٹ جو لگائی تو گیند دروازے کے شیشہ کو توڑتی ان کے کمرہ میں جا گری اس دن سے ہمیں کرکٹ کھیلنے کی ممانعت کر دی گئی کئی بار کھلی بہار میں جب میں کوٹھے پر پتنگ اڑا رہا ہوتا تو وہ دبے پاؤں اوپر آجاتے اور میرے ہاتھ سے پتنگ لے کر خود اڑانے لگتے۔ مگر مجھے یاد ہے کہ انہوں نے جب کبھی بھی کسی اور پتنگ سے پیچ لڑایا تو ہمیشہ ہماری پتنگ ہی کٹی۔

ہمارے گھر میں کھانا امّاں جان پکایا کرتی تھیں۔ ان کی مدد کے لئے ایک اور خاتون بھی تھیں۔ جنہیں میں بڑی اماں کہا کرتا۔ ان کے علاوہ ہماری کوٹھی کے پیچھے ایک نومسلموں کا محلہ بھی تھا۔ جس کی لڑکیاں اماں جان سے قرآن مجید کا سبق لینے آتیں، سینا پرونا سیکھتیں اور گھر کا کام کاج بھی کرتیں۔

مجھے خواب کی طرح یاد ہے کہ ہمارے یہاں ایک مرتبہ ایک مہمان آکر ٹھہرے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار انہیں ابّا جان کو اقبال کہہ کر پکارتے سُنا۔ یہ متناسب جسم، میانہ قد، باریش بزرگ نہایت خوش پوش، خوش باش اور خوش خور تھے۔ بمبئی سے آئے تھے۔ اور مجھے چاکلیٹ کا ڈبہ تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ آپ کے قہقہے سارے گھر میں گونجتے رہتے اور آپ کے لئے امّاں جان روز طرح طرح کے کھانے پکاتیں۔ آپ کا نام مولانا محمد علی تھا۔ یہ وہی محمد علی تھے جن کے متعلق اس زمانے میں مجھے ایک شعر حفظ ہو گیا تھا ؎

بولی امّاں محمد علی کی !! جان بیٹا خلافت پہ دے دو

دو ایک مرتبہ میں ابّا جان اور امّاں جان کے ساتھ سیالکوٹ بھی گیا۔ تب دادا جان بقید حیات تھے، گو بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ اور اپنے کمرہ میں ہمیشہ چارپائی پر بیٹھے رہتے۔ میں ان کے پاس جاتا تو آنکھوں کو اپنے ہاتھ کا سایہ دے کر مجھے دیکھتے اور پوچھتے کون ہے جب میں اتنا بتاتا کہ میں جاوید ہوں تو ہنس پڑتے، طاق میں سے ایک ٹین کا ڈبہ اٹھاتے اور اس میں سے بُرفی نکال کر مجھے کھانے کو دیتے۔ سیالکوٹ کے مکان میں یا محلہ چوڑیگراں کی گلیوں میں جہاں میں بھاگتا پھرتا تھا، وہیں ابّا جان کا بچپن بھی گزرا تھا۔

میرے بچپن میں رمضان کا مہینہ سردیوں میں آیا کرتا اور عید بھی سردیوں میں آتی تھی۔ رمضان کے دنوں میں اماں جان باقاعدہ روزے رکھتیں اور قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتیں۔ گھر کے ملازم بھی روزے رکھتے مجھے سحری کھانے کا بے حد شوق تھا۔ اور ایک آدھ بار ابا جان کے ساتھ سحری کھانا بھی یاد پڑتا ہے۔ وہ روزہ کبھی کبھار رکھتے تھے۔ اور جب رکھتے تو ہر نصف گھنٹہ کے بعد علی بخش کو بلوا کر پوچھتے کہ افطاری میں کتنا وقت باقی ہے۔

جب عید کا چاند دکھائی دیتا تو گھر میں بڑی چہل پہل ہو جاتی۔ میں عموماً ابا جان کو عید کا چاند دکھایا کرتا تھا۔ گو مجھے نہانے سے سخت نفرت تھی، لیکن اس شب گرم پانی سے اماں جان مجھے نہلاتیں اور میں بڑے شوق سے نہاتا۔ نئے کپڑے یا جوتوں کا نیا جوڑا سرہانے رکھ کر سوتا۔ صبح اٹھ کر نئے کپڑے پہنے جاتے۔ عیدی ملتی، کمخواب کی ایک اچکن جس کے نقرئی بٹن تھے، مجھے ہر عید اماں جان پہنایا کرتیں۔ سر پر تلے کی گول ٹوپی پہنتا اور مجھے کلائی پر باندھنے کے لئے سونے کی ایک گھڑی بھی دی جاتی۔ جو افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ نے میرے لئے تحفہ کے طور پر بھیجی تھی۔ سج دھج کر میں ابا جان کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے کے لئے جاتا۔ ان کی انگلی پکڑے شاہی مسجد میں داخل ہوتا اور ان کے ساتھ عید کی نماز ادا کرتا۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم گھر آتے۔ ابا جان کی عادت تھی کہ وہ عید کے روز سیویوں پر دہی ڈال کر کھایا کرتے تھے۔ سارا دن انہیں ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا اور دن کھاتے پیتے، ہنستے کھیلتے گزر جاتا۔ رات آتی تو اماں جان سونے کی گھڑی اور اچکن اتروا لیتیں اور پھر اگلی عید تک مجھے ان کا انتظار کرنا پڑتا۔

کبھی بیمار ہوتا تو اماں جان اور ابا جان بہت پریشان ہو جاتے، میرے سرہانے روپوؤں کے نوٹ رکھے جاتے اور کھیلنے کے لئے اماں جان مجھے لوا اشرفیاں دیتیں۔ جو میری پیدائش کے وقت ابا جان کے مختلف احباب سے بطورِ تحفہ ملی تھیں۔ اماں جان کا خیال تھا کہ اگر بچہ بیمار ہو اور اسے کھیلنے کے روپے یا اشرفیاں دی جائیں تو وہ جلد صحت یاب ہو جاتا ہے۔ ابا جان مجھے بار بار پوچھتے کہ کہیں درد تو نہیں ہو رہا اور اگر میں انکار سے سر ہلا دیتا تو کہتے "منہ سے بولو بیٹا! سر مت ہلاؤ"۔ میرا بچپن زیادہ تر تنہائی میں گزرا۔ ۱۹۱۳ء میں منیرہ پیدا ہوئی، لیکن وہ مجھ سے چھ سال چھوٹی تھی۔ اس لئے ہم اکٹھے کھیل بھی نہ سکتے تھے۔

مجھے وہ دن بھی خوب یاد ہے کہ جب میں پہلی بار سکول گیا۔ میری عمر کوئی پانچ ساڑھے پانچ سال کی ہو گی۔ اماں جان بڑی فکرمند تھیں کہ میں سارا دن گھر سے دور کیسے رہ سکوں گا۔ ابا جان انہیں دلاسا دیتے رہے لیکن ساتھ خود بھی علی بخش سے پوچھتے کہ جاوید کو لینے کوئی نہیں گیا۔ چھٹی ہونے پر جب میں گھر آیا تو اماں جان برآمدے میں کھڑی میری راہ تک رہی تھیں۔ ابا جان بھی اپنے کمرے سے اٹھ کر آ گئے۔ اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کہیں اداس تو نہیں ہو گئے تھے۔ بعد میں سکول جانا ایک معمول بن گیا۔

مجھے موسیقی سے بھی خاصا لگاؤ تھا۔ لیکن ہمارے گھر میں نہ تو ریڈیو تھا اور نہ گراموفون بجانے کی اجازت تھی کیونکہ ابا جان ایسی چیزوں کو پسند نہ کرتے تھے۔ البتہ گانا سننے کا انہیں شوق ضرور تھا۔ اور اچھا گانے والوں کو جب کبھی گھر بلوا کر ان سے اپنا یا اوروں کا کلام سنتے تو مجھے بھی پاس بٹھا لیا کرتے تھے۔ فقیر نجم الدین مرحوم ابا جان کو اکثر ستار بجا کر سنایا کرتے تھے خود ابا جان کو جوانی میں ستار بجانے کا شوق رہ چکا تھا۔ لیکن جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ گئے تو اپنی ستار کسی دوست کو دے گئے۔ ۱۹۳۱ء میں جب گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لئے ابا جان انگلستان گئے۔ تو اس وقت میری عمر کوئی سات سال کے لگ بھگ تھی۔ میں نے انہیں ایک اوٹ پٹانگ سا خط لکھا اور خواہش ظاہر کی کہ جب وہ واپس تشریف لائیں تو

میرے لئے گراموفون لیتے آئیں گراموفون تو وہ نہ لے کر آئے لیکن انہیں انگلستان میں لکھا ہُوا خط ان کی مندرجہ ذیل نظم کی شانِ نزول کا باعث بنا ؎

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مری طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اماں جان کی بڑی آرزو تھی کہ ابا جان تمام دن گھر پر پڑے رہنے کی بجائے کہیں ملازمت کر لیں۔ یہ سُن کر ابا جان عموماً مسکرا دیا کرتے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ بچپن میں میں نے بھی اس معمے کو سلجھانے کی بارہا کوشش کی کہ میرے ابا جان کیا کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی مجھ سے یہ سوال پوچھ بیٹھتا تو میں خاموش ہو جاتا، کیونکہ میں خود نہ جانتا تھا۔ اسی طرح اماں جان اس بات پر مصر رہتیں کہ کرایہ کا گھر چھوڑ کر اپنا گھر بنوایئے ان ایّام میں ہم میکلوڈ روڈ پر رہا کرتے تھے۔

چند سالوں بعد اماں جان کے گھر کے اخراجات سے بچائے ہُوئے روپوؤں سے زمین خریدی گئی۔ اور "جاوید منزل" کی تعمیر شروع ہُوئی۔ زمین اور مکان اماں جان کے نام تھے اور انہی کی ملکیت تھے۔ بہر حال جب تعمیر مکمل ہو گئی۔ تو ہم میو روڈ پر اُٹھ آئے۔ لیکن اماں جان نئے گھر میں بیمار گاڑی پر ہی لائی گئیں کیونکہ ان دنوں وہ سخت علیل تھیں۔ انہیں چارپائی پر لیٹے اندر لایا گیا دوسرے دن ابا جان جب انہیں دیکھنے کے لئے زنانہ میں آئے تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں کچھ کاغذات اٹھا رکھے تھے۔ آپ نے اماں جان سے کہا کہ اس مکان کو جاوید کے نام ہبہ کر دو۔ لیکن اماں جان نہ مانتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے کیا معلوم کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر کیسا نکلے گا۔ میں انشاءاللہ جلد صحت یاب ہو جاؤں گی۔ آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں۔ لیکن ابا جان نے انہیں آگاہ کیا کہ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ اس پر انہوں نے ہبہ نامہ پر دستخط کر دیئے۔ یُوں 'جاوید منزل' میرے نام منتقل ہو گئی ابا جان نے ایک کرایہ نامہ بھی تحریر کیا جس کی رُو سے آپ میرے کرایہ دار کی حیثیت سے رہنے لگے۔ آپ سامنے کے تین کمروں میں رہائش کا کرایہ ہر ماہ کی ۲۱، تاریخ کو ادا کرتے تھے۔

نئے گھر میں قدم رکھنے کے تیسرے یا چوتھے روز اماں جان پر اچانک غشی کا عالم طاری ہو گیا۔ کوئی شب بجے شام کے قریب جب مجھے ان کے پاس لے جایا گیا تو وہ بستر پر بے ہوش پڑی تھیں۔ میں نے ان کے حلق میں شہد ٹپکایا اور روتے ہُوئے کہا

کہ اماں جان میری طرف دیکھنے۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں لمحہ بھر کے لئے میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اسی شام انہوں نے غشی کے عالم میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور رات کو دفن کردی گئیں۔ ان کی وفات کے وقت میری عمر دس برس تھی، اور منیرہ کی چار برس۔

اماں جان کے انتقال کے بعد ہم دونوں بچے ابا جان کے زیادہ قریب آگئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس وقت اماں جان فوت ہوئیں تو ہم دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے روتے روتے ابا جان کے کمرے کی طرف گئے۔ وہ حسب معمول اپنی چارپائی پر نیم دراز تھے۔ کیونکہ ان دنوں خود بھی بیمار رہتے تھے۔ گلا بیٹھ چکا تھا اور صاف بول نہ سکتے تھے۔ میں اور منیرہ ان کے دروازے پر پہنچ کر ٹھٹک سے گئے۔ یوں روتے کھڑا دیکھ کر انہوں نے انگلی کے اشارے سے ہمیں قریب آنے کو کہا اور جب ہم ان کے قریب پہنچے تو ایک پہلو میں مجھے اور دوسرے میں منیرہ کو بٹھا لیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ پیار سے ہمارے کندھوں پر رکھ کر قدرے رنجیدگی سے مجھ سے گویا ہوئے "تمہیں یوں نہ رونا چاہیئے۔ یاد رکھو تم مرد ہو اور مرد کبھی نہیں رویا کرتے" اسکے بعد اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے ہم دونوں بہن بھائیوں کی پیشانیوں کو باری باری چوما۔

اماں جان کی بے وقت موت نے ابا جان کو پژمردہ سا کردیا۔ لیکن اب وہ ہم دونوں بچوں کا بے حد خیال رکھنے لگے ہمیں حکم تھا کہ ان سے مل کر اسکول جایا کریں۔ جانے سے پہلے اور آنے کے بعد وہ ہم دونوں کی پیشانیوں کو بوسہ دیا کرتے مگر مجھے اس بوسے میں شفقت کی بجائے ہمیشہ معمول کی جھلک دکھائی دیتی۔ گویا وہ ہمیں اس لئے چومتے ہیں کہ کہیں ہم دونوں یہ تصور نہ کرلیں کہ ہمیں ابا جان کی محبت میسر نہیں ہے۔ بہرحال منیرہ کو ان کا قرب حاصل تھا۔ اور رات کو وہ عموماً انہی کے بستر میں سو جایا کرتی۔ اس کی ہر خواہش بغیر کسی حیل وحجت کے پوری کردی جاتی۔ اور اگر کبھی میں اسے جھڑکتا یا مار بیٹھتا تو میری شامت آجاتی۔ انہیں ہم دونوں بہن بھائیوں کے جھگڑے پر بہت رنج ہوتا تھا۔ وہ اپنے احباب سے اکثر مایوسانہ انداز میں کہا کرتے کہ یہ دونوں آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ اور احباب کے یہ کہنے کے باوجود کہ جس گھر میں بچے ہوں وہاں لڑائی جھگڑا ہوا ہی کرتا ہے، ان کی تسلی نہ ہوتی۔ مجھ سے بارہا جل کر کہا کرتے "تمہارا دل پتھر ہے تم بڑے سنگ دل ہو۔ اتنا نہیں جانتے کہ اس بہن کے سوا تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں"

اماں جان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد وہ مجھے اس خیال سے اپنے ہمراہ بھوپال لے گئے کہ ان کی عدم موجودگی میں میں منیرہ سے لڑتا نہ رہوں۔ اس سفر کی دھندلی سی یاد اب تک میرے ذہن میں موجود ہے۔ بہت لمبا سفر تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کئی دن اور کئی راتیں گاڑی میں ہی گزریں۔ رات کو علی بخش مجھے اوپر کے برتھ پر سلا دیتا اور ابا جان نیچے کے برتھ پر سوتے۔ ناشتہ دوپہر اور رات کا کھانا بھی وہیں منگوا لیا جاتا۔ جب ہم بھوپال پہنچے تو اسٹیشن پر محمد شعیب استقبال کے لیے موجود تھے۔ ہم موٹر کار میں شیش محل پہنچے جہاں ابا جان کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ شیش محل ایک پرانی وضع کی نہایت وسیع و عریض عمارت تھی۔ اتنے بڑے بڑے کمرے تھے کہ مجھے رات کو ان میں گزرتے ڈر آیا کرتا۔

ہم بھوپال میں کوئی دو ایک ماہ ٹھہرے۔ وہاں ڈاکٹر باسط ابا جان کے معالج تھے۔ اور ان کے گلے کا علاج برقی شعاعوں سے کرتے تھے مجھے روز پڑھانے کے لئے ایک استاد بھی شیش محل آیا کرتے۔ شیش محل کے قریب ایک جھیل کے کنارے

میں ڈاکٹر باسط کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا۔ ڈاکٹر باسط کا گھر شیش محل کے مقابل تھا۔ اور اس کے سامنے غالباً ایک وسیع میدان تھا۔

تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز میں ابا جان کے ساتھ سید راس مسعود کے ہاں "ریاض منزل" جایا کرتا۔ وہ میری زندگی میں دوسری ایسی شخصیت تھے۔ جنہیں میں نے ابا جان کو اقبال کہہ کر پکارتے سُنا۔ سید راس مسعود قد میں ابا جان سے بہت اونچے، قوی ہیکل اور گورے چٹے بزرگ تھے۔ مجھ سے ہر وقت مذاق کرتے رہتے۔ میں اور ابا جان ہفتہ میں دو ایک بار رات کا کھانا سید راس مسعود اور بیگم امت المسعود کے ساتھ "ریاض منزل" میں کھایا کرتے۔ بسا اوقات ہم اور جگہوں پر بھی مدعو ہوتے۔ ایک مرتبہ ہم کسی کھانے سے واپس لوٹ رہے تھے اور گاڑی میں ابا جان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی فربہ سی ہنس مکھ خاتون بیٹھی تھیں۔ وہ مجھ سے نہایت شفقت سے پیش آئیں۔ بعد میں ابا جان نے مجھے بتایا کہ وہ سروجنی نائیڈو تھیں۔ اسی طرح ایک شام بیگم صاحبہ بھوپال کے ہاں چائے پر مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ کیونکہ بیگم صاحبہ نے فرمائش کر رکھی تھی کہ جاوید کو اپنے ساتھ لائیے۔ سید راس مسعود بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ جب ان دونوں بزرگوں نے بیگم صاحبہ بھوپال کو جھک کر فرشی سلام کیے تو مجھے بڑی ہنسی آئی۔

ہر حال بھوپال میں میرا بیشتر وقت ابا جان کی نگاہوں کے سامنے ہی گزرتا تھا۔ رات کو کھانے کی میز پر مجھے سکھایا کرتے، کہ چھچہ اس طرح پکڑنا چاہیئے، اور کانٹا یوں۔ میں فطرتاً کچھ شرمیلا واقع ہوا تھا۔ اس لئے جب کبھی انہیں وہاں ملنے آتے یا وہ لوگوں کے ہاں جاتے تو مجھے ہمیشہ کہ وہ لوگوں کے سامنے خاموش بیٹھے رہنے کی بجائے ان سے بات چیت کرنی چاہیئے۔

بھوپال سے واپسی پر ہم چند دنوں کے لئے دہلی ٹھہرے۔ وہاں ابا جان بذاتِ خود مجھے تاریخی مقامات کی سیر کرانے کے لئے گئے۔ پہلے لال قلعہ دیکھا پھر نظام الدین اولیا گئے۔ اور پھر نئی دہلی سے ہوتے ہوئے قطب پہنچے۔ میرا دل چاہا کہ قطب مینار کے اوپر چڑھ جاؤں اور میں نے ابا جان کو بھی ساتھ آنے کے لئے کہا مگر وہ بولے "تم جاؤ میں اتنی بلندی پر نہیں چڑھ سکتا۔ اور جب اوپر پہنچو تو نیچے کی طرف مت دیکھنا۔ کہیں دہشت سے گر نہ پڑو۔" بالآخر ہم واپس لاہور آ گئے۔

گرمیوں میں ابا جان باہر سوتے اور میری چارپائی ان کے قریب ہوا کرتی رات گئے تک وہ جاگتے رہتے۔ کیونکہ انہیں عموماً رات کو تکلیف ہوتی تھی۔ اور جب شعر کی آمد ہوتی تو ان کی طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہو جایا کرتی۔ چہرے پر تغیر رونما ہو جاتا۔ بستر پر کروٹیں بدلتے کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے اور کبھی گھٹنوں میں سر دے دیتے اکثر اوقات وہ رات کو دو یا تین بجے علی بخش کو تالی بجا کر بلاتے اور اسے اپنی بیاض اور قلم دوات لانے کو کہتے۔ جب وہ لے آتا تو بیاض پر اشعار لکھ دیتے۔ اشعار لکھ چکنے کے بعد ان کے چہرے پر آہستہ آہستہ سکون کے آثار نمودار ہو جاتے اور آرام سے لیٹ جایا کرتے۔ بعض اوقات تو وہ علی بخش کو اس غرض سے بھی بلواتے کہ میری پائینتی پر پڑی ہوئی چادر کو میرے اوپر ڈال دو۔

ابا جان کی عادت سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر بستر پر ایک طرف سونے کی تھی۔ اس حالت میں ان کا ایک پاؤں اکثر ہلتا رہتا جس سے دیکھنے والا یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ ابھی سوئے نہیں، بلکہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ لیکن جب وہ گہری نیند سو جاتے تو خراٹے لیا کرتے۔ اور نہایت بھیانک قسم کی آوازیں نکلتیں۔ کئی بار میں ان کے خراٹوں سے ڈر جایا کرتا۔

ابا جان کو میں نے بیسیوں مرتبہ خود بخود مسکراتے یا روتے دیکھا ہے۔ جب کبھی تنہائی میں بیٹھے اپنا کوئی شعر گنگناتے تو ان کا بے جان سا ہاتھ عجیب تغافل کے عالم میں اٹھتا اور ہوا میں گھوم کر اپنی پہلی جگہ پر آ گرتا۔ ساتھ ہی ان کے سر کو ہلکی سی جنبش

ہو جاتی۔ صبح کی نماز بہت کم چھوڑتے تھے۔ گرمیوں میں باہر رکھے ہوئے تخت پر ہی نیت باندھ لیتے، دھوتی اور بنیان زیبِ تن ہوتی اور سر پر تولیہ ہی رکھ لیتے۔ ان کے کمرے کی حالت پریشان سی رہتی تھی، دیواریں گرد وغبار سے اَٹی ہوتیں۔ بستر ان کی اپنی دھوتی اور بنیان کی طرح میلا ہو جاتا مگر انہیں بدلوانے کا خیال نہ آتا۔ منہ دھونے اور نہانے سے گھبراتے اور اگر کبھی مجبوراً باہر جانا پڑتا تو کپڑے بدلتے وقت سرد آہیں بھرا کرتے۔ وہ فطرتاً سُست تھے۔ اس لئے اگر کہیں وقت کی پابندی ہوتی تو انہیں ہمیشہ دیر ہو جایا کرتی۔ ویسے چارپائی پر نیم دراز پڑے رہنے میں بڑے خوش تھے۔ کئی بار دوپہر کا کھانا کسی کتاب میں منہمک ہونے کی وجہ سے بھول جایا کرتے۔ اور جب وہ کتاب ختم ہو جاتی تو مولا بخش کو بلا کر معصومانہ انداز میں پوچھتے "کیوں بھئی! میں نے کھانا کھا لیا ہے؟" شام کو گھر کے دالان میں ہی دو ایک چکر لگا لیا کرتے۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی میں بظاہر کامل جمود تھا۔

اماں جان کی وفات کے بعد ابا جان صرف ایک بار زنانہ میں آئے اور وہ بھی جب مجھے بخار آتا تھا۔ آپ کو پہلی بار تب معلوم ہوا کہ زنانہ حصّہ میں کمروں کی تعداد کتنی ہے اسی طرح اماں جان کی وفات کے بعد ابا جان نے خضاب لگانا بھی ترک کر دیا تھا ایک دن میں نے انہیں سر پر خضاب شروع کرنے کو کہا تو مسکرا کر بولے "میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں"۔ میں نے پھر کہا "لیکن ابا جان! ہم تو آپ کو جوان دیکھنا چاہتے ہیں"۔ چنانچہ شاید اس خیال سے کہ بچے میرے سفید بالوں کو دیکھ کر مجھے ضعیف سمجھنے لگے ہیں انہوں نے پھر خضاب لگانا شروع کر دیا۔ مگر چند ہی مہینوں بعد پھر چھوڑ دیا۔ اور میری ہمت نہ پڑی کہ انہیں دوبارہ شروع کرنے کو کہوں۔

اماں جان کی وفات کے کوئی دو ایک سال بعد منیرہ کی دیکھ بھال کے لئے ابا جان نے ایک جرمن خاتون کو علی گڑھ سے بلوایا اور وہ ہمارے یہاں رہنے لگیں۔ ہم انہیں 'آپا جان' کہا کرتے۔ ان دنوں ہماری گھریلو زندگی میں ایک ترتیب سی آ گئی۔ ہم سب ابا جان سمیت دوپہر اور رات کا کھانا کھانے والے کمرہ میں کھایا کرتے منیرہ اور 'آپا جان' ہر شام ابا جان کے پاس بیٹھا کرتیں۔ ابا جان جرمن زبان بخوبی جانتے تھے۔ اس لئے 'آپا جان' سے جرمن ہی میں گفتگو کیا کرتے اور منیرہ کو بھی کہتے کہ جرمن زبان سیکھو، جرمن عورتیں بڑی دلیر ہوتی ہیں۔ منیرہ ان دنوں جرمن زبان کے چند فقرے سیکھ گئی تھی۔ اس لئے وہ بھی ان سے جرمن میں بات چیت کرتی۔ اور خوب ہنسی مذاق ہوتا۔

مجھے مصوری سے بھی دلچسپی تھی لیکن ابا جان کو میرے اس شوق کا علم نہ تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ایک تصویر بنائی۔ جو اتفاق سے خاصی اچھی بن گئی۔ ان دنوں تایا جان سیالکوٹ سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ اور ہمارے ہاں مقیم تھے۔ تایا جان خود انجینئر تھے لیکن جب انہوں نے میری بنائی ہوئی تصویر دیکھی تو بے حد خوش ہوئے۔ فوراً تصویر ہاتھ میں لے کر ابا جان کو دکھانے چلے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ ابا جان کو پہلے تو یقین نہ آیا کہ تصویر میں نے بنائی ہے لیکن جب یقین آ گیا تو میری حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے فرانس، اطالیہ اور انگلستان سے میرے لئے خاص طور پر آرٹ کی کتب منگوائیں۔ انہیں خیال تھا کہ دنیا کے بہترین مصوروں کے شاہکاروں کو دیکھ کر میرا مصوری کے لئے شوق بڑھے گا۔ لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا جب میری نظر سے مصوری کے شاہکار گزرے تو میں نے اس خیال سے ہمت ہار دی کہ اگر میں ساری عمر بھی کوشش کروں تو ایسی خوبصورت تصاویر نہیں بنا سکتا۔

اباجان کی تمنا تھی کہ میں تقریر کرنا سیکھوں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ میں کشتی لڑا کروں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں میرے لئے گھر میں ایک اکھاڑہ بھی کھدوا دیا گیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ اکھاڑے کی مٹی میں ڈنڈ پیلنا یا لنگوٹی باندھ کر لیٹ رہنا صحت کے لئے نہایت مفید ہے پھر بڑی عید کے روز مجھے ہمیشہ تلقین کیا کرتے کہ بکرے کے ذبح ہوتے وقت میں وہاں موجود رہوں۔ لیکن ان کا اپنا یہ حال تھا کہ کسی قسم کا خون بہتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ اباجان میں قوت برداشت کی انتہا تھی، مگر جب ایک مرتبہ کسی سے ناراض ہو جاتے تو پھر ساری عمر اس کا چہرہ دیکھنے کے روادار نہ ہوتے۔ انہیں کبوتربازی کا شوق بھی رہ چکا تھا۔ آخری عمر میں ان کی خواہش تھی کہ گھر کی چھت پر ایک وسیع پنجرہ بنوایا جائے جس میں لاتعداد کبوتر چھوڑ دیئے جائیں اور ان کی چارپائی ہر وقت کبوتروں کے درمیان رہا کرے انہیں یقین تھا کہ کبوتروں کے پروں کی ہوا صحت کے لئے فائدہ مند ہوتی ہے۔

اباجان کے عقیدت مندوں میں ایک حجازی عرب بھی تھے۔ جو کبھی کبھار انہیں قرآن مجید پڑھ کر سنایا کرتے تھے، میں نے بھی ان سے قرآن مجید پڑھا ہے ان کی آواز بڑی پیاری تھی۔ اباجان جب بھی ان سے قرآن مجید سنتے، مجھے بلا بھیجتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ایک بار انہوں نے سورۂ مزمل پڑھی تو آپ اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ جب وہ ختم کر چکے تو سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مرتعش لہجے میں بولے "تمہیں یوں قرآن پڑھنا چاہیئے" اسی طرح مجھے ایک مرتبہ مسدس حالی پڑھنے کو کہا، اور خاص طور پر وہ بند ...... جب قریب بیٹھے ہوئے میاں محمد شفیع نے دہرایا ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

تو آپ سنتے ہی آب دیدہ ہو گئے۔ میں نے اماں جان کی موت پر انہیں آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا۔ مگر قرآن مجید سنتے وقت یا اپنا کوئی شعر پڑھتے وقت یا رسول اللہ کا اسم مبارک کسی کی نوکِ زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں بھر آتیں۔

اباجان کو انگریزی زبان سے سخت نفرت تھی۔ مجھے ہمیشہ شلوار اور اچکن پہننے کی تلقین کیا کرتے۔ منیرہ بھی اگر اپنے بالوں کو دو حصوں میں گوندھتی تو ناپسند کرتے اور کہتے "اپنے بال اس طرح مت گوندھا کرو۔ یہ یہودیوں کا انداز ہے"۔ اور اگر میں کبھی غلطی سے اپنی قمیضوں یا شلواروں کا کپڑا بڑھیا قسم کا خرید لاتا تو بہت خفا ہوتے۔ اور کہتے "تم اپنے آپ کو کسی رئیس کا بیٹا سمجھتے ہو؟ تمہاری طبیعت میں امارت کی بو ہے۔ اور اگر تم نے اپنے یہ انداز نہ چھوڑے تو میں تمہیں کھدر کے کپڑے پہنوا دوں گا۔ میرے لیے بارہ آنے گز سے زاید قمیض کا کپڑا خریدنا یا آٹھ روپے سے زاید کا بوٹ خریدنا جرم تھا۔ جس کی سزا کافی کڑی تھی۔ لیکن اگر انہیں کبھی یہ معلوم ہو جاتا کہ میں آج پلنگ پر سونے کے بجائے زمین پر سویا ہوں تو بڑے خوش ہوا کرتے۔

اپنی زندگی میں انہوں نے صرف ایک بار مجھے سینما دیکھنے کی اجازت دی۔ وہ ایک انگریزی فلم تھی جس میں نپولین کا عشق دکھایا گیا تھا مجھے یاد ہے کہ اباجان کو یہ نہ بتایا گیا بلکہ ان سے کہا گیا کہ اس فلم میں نپولین کے حالات زندگی ہیں۔ اباجان دنیا بھر کے جری سپہ سالاروں سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ مجھے اکثر خالد بن ولیدؓ اور فاروق اعظمؓ کی باتیں سنایا کرتے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے بتایا کہ نپولین کے اجداد عرب سے آئے تھے۔ اور واسکوڈی گاما کو عربوں نے ہی ہندوستان کا راستہ دکھایا۔

مجھے کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ باغ و بہار (قصہ چہار درویش) حاتم طائی، طلسم ہوشربا اور عبدالحلیم شرر کے سب ناول پڑھ ڈالے تھے۔ ساتویں جماعت کے امتحان کے قریب میرے ہاتھ الف لیلیٰ لگ گئی۔ اور کتاب سے میں اس قدر مسحور ہوا کہ رات گئے تک اسے پڑھتا رہتا۔ امتحان سر پر آ گئے لیکن میں نے الف لیلہ کو نہ چھوڑا۔ بلکہ رات کو امتحان کی تیاری کرنے کی بجائے الف لیلہ پڑھتا رہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساتویں جماعت کے امتحان میں ناکامیاب ہو گیا۔ جب ابا جان کو علم ہوا کہ میں الف لیلہ میں منہمک ہونے کی وجہ سے امتحان میں ناکامیاب ہو گیا۔ تو برہم نہ ہوئے۔ کہنے لگے "اگر تم امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد الف لیلیٰ پڑھتے تو تمہیں اور بھی لطف آتا"۔

ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں ابا نے کشمیر جانے کا ارادہ بھی کیا کیونکہ ان کے احباب کا اصرار تھا کہ وہ تبدیلیٔ آب و ہوا کی خاطر لاہور سے تھوڑے عرصہ کے لئے کہیں باہر چلے جائیں۔ انہوں نے منیرہ اور مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا ہم بڑے خوش تھے کہ ابا جان کے ہمراہ کشمیر جا رہے ہیں۔ لیکن کشمیر میں ابا جان کا داخلہ ممنوع تھا۔ لہٰذا انہوں نے حکومت سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی عرصہ تک خط و کتابت جاری رہی۔ مگر جب اجازت ملی تو گرمیوں کا موسم نکل چکا تھا۔ یوں وہ اپنی زندگی میں آخری بار وادیٔ کشمیر میں کچھ دن گزارنے سے محروم رہ گئے۔ اسی طرح بیت اللہ کے حج پر جانے کا قصد بھی کیا۔ لیکن وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔

ابا جان کو معلوم تھا کہ مجھے بڑی بڑی شخصیتوں کے آٹوگراف لینے کا شوق تھا کہ وہ میری اس عادت کو نہ تو برا سمجھتے تھے اور نہ سراہتے لیکن ایک شام انہوں نے مجھے خاص طور پر بلوا کر کہا کہ ہمارے یہاں ایک مہمان آ رہے ہیں۔ جب وہ آ کر بیٹھ جائیں تو تھوڑی دیر بعد میں کمرہ میں داخل ہوں۔ اور ان سے آٹوگراف لینے کی استدعا کروں۔ چنانچہ جب مہمان تشریف لے آئے، تو میں ان کے حکم کے مطابق کمرہ میں داخل ہوا۔ ابا جان کے پاس ایک دبلے پتلے مگر نہایت خوش پوشش شخص بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں عقاب ایسی پھرتی تھی۔ اور ان کے ساتھ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک دبلی پتلی خاتون بھی تھیں۔ ابا جان نے ان سے میرا تعارف کرایا اور میں نے آٹوگراف کی کتاب آگے بڑھا دی۔ مہمان نے مجھ سے انگریزی میں کہا تم بھی شعر کہتے ہو؟ میں نے کہا "جی نہیں" اس پر انہوں نے سوال کیا "پھر تم بڑے ہو کر کیا کرو گے؟" میں خاموش رہا۔ وہ ہنستے ہوئے ابا جان سے مخاطب ہوئے "کوئی جواب نہیں دیتا"۔ "وہ جواب نہیں دے گا" ابا جان بولے "کیونکہ وہ اس دن کا منتظر ہے جب آپ اسے بتائیں گے کہ اس نے کیا کرنا ہے"۔ میری آٹوگراف کی کتاب پر دستخط کر دیئے گئے۔ یہ میری خالق پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اور محترمہ فاطمہ جناح سے پہلی ملاقات تھی۔ تب قائداعظم کو پنجاب میں زیادہ لوگ نہ جانتے تھے۔ اور مسلم عوام پاکستان کے تصور سے ابھی روشناس نہ ہوئے تھے۔ بہرحال میں نے اس مختصر سے عرصہ میں یہ اندازہ لگا لیا کہ ابا جان ان کی کس قدر عزت کرتے ہیں۔

آخری ایام میں ابا جان کی نظر بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس لئے مجھے حکم تھا کہ انہیں ہر روز اخبار پڑھ کر سنایا کروں۔ اگر کسی لفظ کا تلفظ غلط ادا کر جاتا تو بہت خفا ہوتے۔ اسی طرح رات کو میں انہی کی کوئی غزل گا کر بھی سنایا کرتا۔ ان دنوں مجھے ان کی صرف ایک غزل یاد تھی ؎

گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر

ابا جان کے سامنے وہ غزل پڑھنا میرے لئے ایک عذاب ہوا کرتا۔ اگر کوئی شعر غلط پڑھ جاتا تو وہ ناراض

ہوتے اور کہتے :

" شعر پڑھ رہے ہو یا نثر ؟ "

ان کی وفات سے کوئی دو ایک ماہ بیشتر ایک شام پنڈت نہرو نے انہیں ملنے کے لئے آنا تھا۔ ابا جان نے مجھے بلا کر حکم دیا کہ پنڈت نہرو کے استقبال کے لئے ڈیوڑھی میں کھڑا رہوں۔ میں نے تعجب سے پوچھا کہ پنڈت نہرو کون ہیں ؟ کہنے لگے "جس طرح محمد علی جناح مسلمانوں کے قائد ہیں۔ اسی طرح پنڈت نہرو ہندوؤں کے سربراہ ہیں"۔ میں باہر کھڑا پنڈت جی کا انتظار کرتا رہا جب وہ تشریف لائے تو میں نے انہیں 'السلام علیکم' کہا اور انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کا جواب دیا، میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر نہایت شفقت سے میری کمر میں بازو ڈال کر میرے ساتھ ابا جان کے کمرہ میں داخل ہوئے۔ ابا جان انہیں بڑے تپاک سے ملے اور صوفہ پر بیٹھنے کو کہا لیکن پنڈت جی نے نیچے فرش پر بیٹھنے پر اصرار کیا۔ بالآخر وہ فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئے اور ابا جان بستر پر لیٹے ان سے باتیں کرنے لگے۔

ابا جان کو لوگ گھر پر ہی ملنے آتے۔ ہر شام احباب کی محفل جما کرتی۔ ان کی چارپائی کے گرد بہت سی کرسیاں رکھی ہوتیں اور لوگ ان پر آکر بیٹھ جایا کرتے۔ آپ چارپائی پر لیٹے ان سے باتیں کرتے رہتے۔ اور ساتھ ساتھ حُقّہ بھی پیتے جاتے۔ رات کا کھانا نہ کھاتے تھے۔ صرف کشمیری چائے پینے پر اکتفا کرتے۔ رات گئے تک علی بخش ان کے پاؤں دباتا اور اگر میں کبھی دبانے بیٹھتا تو منع کر دیتے اور کہتے " تم ابھی چھوٹے ہو۔ تھک جاؤ گے"۔

مجھے خاص طور پر حکم تھا کہ جب بھی ان کے پاس لوگ بیٹھے ہوں اور کوئی بحث مباحثہ ہو رہا ہو تو میں وہاں ضرور موجود رہوں۔ لیکن مجھے ان کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ ہوا کرتی کیونکہ وہ میری سمجھ سے بالاتر ہوتیں۔ سو میں عموماً موقع پاکر وہاں سے کھسک جایا کرتا۔ جس پر انہیں بہت رنج ہوتا اور وہ اپنے احباب سے کہتے کہ " یہ لڑکا نہ جانے کیوں میرے پاس بیٹھنے سے گریز کرتا ہے"۔ دراصل اب وہ تنہائی بھی محسوس کرنے لگے تھے اور اکثر اوقات افسردگی سے کہا کرتے " سارا دن یہاں مسافروں کی طرح پڑا رہتا ہوں، میرے پاس آکر کوئی نہیں بیٹھتا"۔

آخری رات ان کی چارپائی گول کمرہ میں بچھی تھی۔ عقیدت مندوں کا جمگھٹا تھا۔ میں کوئی نو بجے کے قریب اس کمرے میں داخل ہوا تو پہچان نہ سکے۔ پوچھا " کون ہے ؟" میں نے جواب دیا " میں جاوید ہوں"۔ ہنس پڑے اور بولے " جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں" پھر اپنے قریب بیٹھے ہوئے چوہدری محمد حسین سے مخاطب ہوئے۔ "چودھری صاحب، اسے جاوید نامہ کے آخر میں وہ دعا 'خطاب بہ جاوید' ضرور پڑھوا دیجئے گا"۔

اس رات ہمارے ہاں بہت سے ڈاکٹر آئے ہوئے تھے۔ ہر کوئی ہراساں دکھائی دیتا تھا کیونکہ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ آج کی رات مشکل سے کٹے گی۔ کوٹھی کے صحن میں کئی جگہوں پر دو دو تین تین کی ٹولیوں میں لوگ کھڑے باہم سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ابا جان سے ڈاکٹروں کی یہ رائے مخفی رکھی گئی۔ مگر وہ بڑے تیز فہم تھے۔ انہیں اپنے احباب کا بکھرا ہوا شیرازہ دیکھ کر یقین ہوگیا تھا کہ بساط عنقریب الٹنے والی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس رات ضرورت سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔

مجھے بھی حالات سے آگاہ نہ کیا گیا۔ اس لئے میں معمول کے مطابق اپنے کمرہ میں جاکر سو رہا۔ مگر صبح طلوع آفتاب سے پیشتر مجھے علی بخش نے آکر جھنجھوڑا اور چیختے ہوئے کہا کہ "جاؤ دیکھو تمہارے اباجان کو کیا ہو گیا ہے۔"

نیند اچانک میری آنکھوں سے کافور ہو گئی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ گھر کے مختلف حصوں سے کراہنے اور سسکیاں بھرنے کی بھنچی ہوئی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ میں اپنے بستر سے اس خیال سے نکلا کہ جاکر دیکھوں تو سہی کہ انہیں کیا ہو گیا ہے۔ جب میں اپنے کمرے سے گزرتا ہوا ملحقہ کمرہ میں پہنچا تو منیرہ تخت پر اکیلی بیٹھی اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے رو رہی تھی۔ مجھے اباجان کے کمرہ کی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ میری طرف لپکی اور میرے بازو سے چمٹ گئی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ میرے ساتھ چل رہی تھی۔ ہم دونوں ان کے کمرہ کے دروازے تک پہنچ کر رک سے گئے۔ میں نے دہلیز پر کھڑے کھڑے اندر جھانکا ان کے کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں وہ چارپائی پر سیدھے لیٹے تھے۔ انہیں گردن تک سفید چادر نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جو کبھی کبھار ہوا کے جھونکوں سے ہل جاتی۔ اباجان کی آنکھیں بند تھیں، چہرہ قبلہ کی طرف تھا، مونچھوں کے بال سفید ہو چکے تھے اور سر کے بالوں کے کناروں پر میرے کہنے سے آخری بار لگائے ہوئے خضاب کی ہلکی سی سیاہی موجود تھی۔

منیرہ کی ٹانگیں دہشت سے کانپ رہی تھیں۔ اس نے میرے بازو کو بڑے زور سے پکڑ رکھا تھا۔ اور مجھے اس کی سسکیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ مگر میں کوشش کے باوجود بھی نہ رو سکتا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ اگر میں رو دیا تو وہ بھی اٹھ کھڑے ہوں گے اپنی انگلی کے اشارے سے ہمیں قریب آنے کو کہیں گے۔ اور جب ہم ان کے قریب پہنچ جائیں گے تو وہ اپنے ایک پہلو میں مجھے اور دوسرے میں منیرہ کو بٹھا لیں گے، پھر اپنے دونوں ہاتھ پیار سے ہمارے کندھوں پر رکھ کر قدرے کرختگی سے مجھ سے کہیں گے: "تمہیں یوں نہ رونا چاہیئے۔ یاد رکھو تم مرد ہو اور مرد کبھی نہیں رویا کرتے۔"

"ضبطِ نفس افراد میں ہو تو خاندان کی تعمیر ہوتی ہے۔ قوموں میں ہو تو سلطنتیں قائم ہوتی ہے۔"

اقبالؒ کا ایک شعر

پروفیسر حبیب مخزی

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

مندرجہ بالا شعر اقبالؒ کے مشہور ترین شعروں میں سے ہے۔ وہ لوگ جو ادب و شعر سے چنداں دلچسپی اور اس کا ذوق نہیں رکھتے یہ شعر ان کے بھی پسندیدہ شعروں میں سے ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا اس کی زبردست شہرت کا سبب یہ ہے کہ یہ شعر شاعری کے بہترین نمونوں میں سے ہے اور کیا اس کی بے انتہا مقبولیت کا راز یہ ہے کہ اس میں آرٹ کا بھرپور مظاہرہ ہے؟ میرا ناچیز خیال ہے کہ شاید ایسا نہیں۔ میں اس شعر کو اقبالؒ کے ان اشعار میں شمار کرتا ہوں جن کو "خطیبانہ" کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ اقبالؒ کے کلام کا ایک اچھا خاصا حصہ ایسے اشعار پر مشتمل ہے۔ خصوصاً "ضربِ کلیم" اقبال کے ایسے اشعار کی نمائندہ تصنیف ہے۔ خطیبانہ لہجے کو شاعری کی کوئی اعلیٰ وارفع خوبی نہیں کہا جا سکتا۔ خیالات، جذبات اور احساسات کا ریلا اور براہِ راست اظہار اچھی شاعری کی صفات میں شامل نہیں۔ خود اقبال کا قول ہے ؏ حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایمائیست

اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔ ؏

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائیست

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ اقبالؒ کے کلام کا ایک حصہ خطیبانہ اشعار پر مشتمل ہے۔ جی بس ایک حصہ۔ ورنہ ان کی شاعری کا ایک اور حصہ ایسا بھی ہے۔ اور یہ حصہ اوّل الذکر حصے سے کسی طرح کم نہیں، جو سوز و گداز، درد و اثر، سرمستی و رعنائی میں اپنی مثال آپ ہے۔ متعدد نظمیں اور خصوصاً بالِ جبریل کی متعدد غزلیں تاثیر میں ایسی ڈوبی ہوئی ہیں کہ ان پڑھتے ہوئے دل گداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور بعض موقعوں پر تو قاری پر رقت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ البتہ میں پھر یہی عرض کروں گا کہ میرے مضمون کا زیرِ بحث شعر ؎ نہیں تیرا نشیمن .... الخ اقبالؒ کے خطیبانہ اشعار کے زمرے ہی میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس کا لہجہ بلند آہنگ، تخاطب براہِ راست اور اظہارِ بیان برملا اور تکلف سے دور ہے۔ اس میں ایک ڈانٹ ڈپٹ کی سی کیفیت پائی جاتی ہے ظاہر ہے ایسا لہجہ طبعِ لطیف پر گراں گزرتا ہے۔

اس شعر میں بیان کے لحاظ سے کچھ اور باتیں بھی محلِ نظر ہیں۔ مثلاً دوسرے مصرعے میں "پہاڑوں کی چٹانوں میں"

کا ٹکڑا بڑی ناگواری لئے ہُوئے ہے اس کی جگہ محض "پہاڑوں" یا محض "چٹانوں" ہونا چاہیئے تھا "پہاڑوں کی چٹانوں" ایک ایسا تکلف ہے جسے عجزِ بیان ہی کہا جا سکتا ہے۔ پھر حرفِ جار "میں" نے اسے اور بھی بدنما بنا دیا ہے۔ یہ بالکل انگریزی کے The mountain میں In کا لفظی ترجمہ لگتا ہے۔

جب کہ اُردُو محاورے میں۔ پہاڑوں پر یا چٹانوں پر بسیرا کرنا کہا جانا چاہیئے تھا۔ "شاہین ہے" کے الفاظ کا عیب تنافر بھی محتاجِ نشاندھی نہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ شعر عام لوگوں کا نہایت پسندیدہ شعر رہے۔ میں نے اس پسندیدگی کی وجوہ کو سمجھنے کی جتنی بھی کوشش کی اسی نتیجے پر پہنچا کہ اس شعر کی عام مقبولیت کا راز ایک تو آزادی کی فضاؤں میں زندگی گزارنے، بستی بسانے اور کار آشیاں بندی کے جھنجھٹوں سے نفرت کرنے اور بلندیوں سے محبت رکھنے والے شاہین کی انتہائی موزوں علامت ہے۔ دوسرے شعر کی سادگیٔ بیان اور تیسرے شعر کا وہ انداز کہ سُنتے یا پڑھتے ہی دِل میں اُتر جائے، میرے خیال میں اس شعر کی یہی نمایاں خوبیاں ہیں اور اپنی انہی خوبیوں سے وہ زبان زدِ عام ہوگیا ہے ——— خود مجھے بھی یہ شعر بے حد پسند ہے۔ لیکن میری پسندیدگی کا سبب کچھ اور ہے۔ آیئے میں بتاؤں کہ مجھے یہ شعر کیوں پسند ہے لیکن پہلے دو ایک باتیں ہو جائیں۔

اقبالؒ اور شاہ پرستی

اقبالؒ پران کے بعض نکتہ چیں اعتراض کرتے ہیں کہ وہ شاہ پسند ہی نہیں شاہ پرست بھی تھے۔ مثال کے طور پر اردُو کے مشہور ناول نویس اور نقاد جناب عزیز احمد فرماتے ہیں کہ

" باوجود فقر کے فلسفے کو کمال تک پہنچانے کے لئے اقبالؒ کسی نہ کسی طرح کی شاہ پرستی سے آخر تک اپنے دماغ کو چھٹکارا نہ دلا سکے۔ چنانچہ امان اللہ خاں، نادر خاں، شاہ افغانستان، ظاہر شاہ یہاں تک کہ فرمانروائے بھوپال کو بھی مخاطب کرکے انہوں نے نظمیں لکھیں۔ اقبالؒ کی حمایت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان کی نظموں سے مدح کا پہلو بالکل خارج ہوتا گیا۔ اور موعظت اور عمل کا پہلو بڑھتا گیا۔ لیکن موعظت اور خیر کی تلقین سعدیؒ کی زبانی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور سعدیؒ کے زمانے کے لحاظ سے موزوں بھی تھی۔ بادشاہوں کا ذکر اور ان کا گوارا کر لینا ہی اقبالؒ کی تعلیم میں خارج ہوتا ہے۔ اور اس سے ایک ایسا تضاد پیدا ہوتا ہے جس کی تاویل نہیں ہو سکتی۔"

(اقبالؒ ایک نئی تشکیل ص ۸۲ - ۸۳)

نظر حیدرآبادی اور صہبا لکھنوی کے جواب

کچھ اسی قسم کے اعتراضات بعض دوسرے نقادوں اختر حسین رائے پوری نے کئے ہیں۔ اس موضوع پر بعض اعتراضات کا جواب دیتے ہُوئے حیدرآباد کے ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب جناب نظر حیدرآبادی اپنی تصنیف "اقبال اور حیدرآباد"

میں یوں لکھتے ہیں :-

"موعظت" اور "عمل" کی تلقین کے ہر زمانے میں کسی نہ کسی سعدی نے کسی نہ کسی بغداد پر آنسو بہائے اور مایوس دلوں میں امید کی کرن دوڑا دی۔ اقبال نے جس زمانے میں یہ فرض ادا کیا۔ اس وقت پوری ملّت اسلامیہ سراپا بغداد کی تباہی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ وہ اس مسلسل اندھیرے میں جن کھوئے ہوؤں کی جستجو میں نکلے تھے۔ انہیں جہاں کہیں بھی روشنی کی کوئی کرن، کبھی نادر، کبھی ظاہر شاہ، کبھی نواب بھوپال یا ہز نظام دکن کی شکل میں نظر آتی تھی۔ وہ اسے دلیل راہ سمجھتے تھے، چراغ منزل نہیں اقبال کو شاہ پرست یا قصیدہ گو قرار دینے سے پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ کس کس کا "وظیفہ خوار" اور کس کس کا مصاحب رہا اور کہاں کہاں "اترا تا" پھرا۔ مرض الموت کے زمانے میں گوشہ گیری اور جہد معاش کے لئے ناقابل ہو جانے کی وجہ سے اگر انہوں نے نواب صاحب بھوپال کی دوستانہ اعانت قبول کر لی تھی تو یہ کوئی "جرم" نہیں۔ ایسے فعل مجبوری کی مثال دے کر یزدان شکار اقبال کی پیشانی پر شاہ پرستی کا لیبل چسپاں کرنا نہ صرف یہ کہ نامناسب ہے بلکہ تکلیف دہ ہے ؎

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ"

(اقبال اور حیدر آباد صفحہ ۸۴)

اسی طرح اردو کے ایک دوسرے مشہور ادیب اور ماہنامہ "افکار" کے مدیر جناب صہبا لکھنوی اپنی مقتدر تصنیف "اقبال اور بھوپال" میں جناب عزیز احمد کے اعتراض کے جواب میں یوں رقم طراز ہیں۔

"عمر کے آخری حصے میں اقبالؒ اپنی مسلسل علالت، بیوی کی لگاتار بیماری، مالی حالت کی ابتری اور محدود وسائل کے سبب جن صبر آزما مرحلوں سے گزر رہے تھے۔ عزیز احمد نے شاید ان کا تجزیہ ضروری نہیں سمجھا اور اقبالؒ کو صرف ایک عظیم مفکر، بلند پایہ فلسفی اور انقلابی سمجھ کر "شاہ پرستی" کا رسمی اعتراض کر دیا حالانکہ اپنی گوناگوں شاعرانہ خصوصیات وصفات کے باوجود اقبالؒ ایک انسان بھی تھے؛ اور ان کو بھی ایک عام انسان کی طرح مادی ضرورتوں کا سامنا تھا ..... سوال یہ ہے کہ اقبال کو مالی پریشانیوں سے نجات دلانا کیا معاشرے یا افرادِ معاشرہ کی ذمہ داری نہیں تھی اور کیا نواب بھوپال سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد اقبالؒ کی ساری فکر قصیدہ گو شاعروں کی طرح شاہ پرستوں کے لئے وقف ہو کر رہ گئی .... اقبالؒ نے نواب شاہ بھوپال کو کبھی شاہوں کے زمرے میں نہیں رکھا اقبالؒ اور نواب صاحب کے قریبی روابط کا تفصیلی تذکرہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے لہٰذا ایک ذی حیثیت دوست کی بروقت رفاقت کو "شاہ پرستی" کا الزام دینا نہ حق گوئی ہے۔ نہ تنقیدی دیانت۔"

(اقبالؒ اور بھوپال صفحہ ۹۱، ۹۲)

غلام السیدین کی شہادت

خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے لائق نواسے اور ممتاز ادیب و نقاد اور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین نے بھی اقبالؒ کے فقر و درویشی اور اس پر ان کے نکتہ چینوں کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"آخری عمر میں ان کا (اقبالؒ کا) فقر اور بے نیازی کا انداز اور بڑھ گیا تھا جس نے ان کو دنیا کی اوچھی اور مصنوعی عزتوں کی طرف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اور خود شناسی اور انسان دوستی کے راستے خدا شناسی کی منزل تک پہنچا دیا جب وہ خلوص کے ساتھ کہہ سکتے تھے ؎

میرا نشیمن نہیں درگہ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخ نشیمن بھی تو

اس شان فقر کے ایک دو دلچسپ واقعات قابل ذکر ہیں۔ سر راس مسعود کی خواہش تھی کہ اقبالؒ کو آخری عمر میں اطمینان کے ساتھ ادبی اور علمی کام کرنے کا موقع ملے اور کسی طرح فکر معاش سے آزادی حاصل ہو جائے ان کے توجہ دلانے سے نواب صاحب بھوپال اور ایک دوسرے دولت مند رئیس نے یہ سعادت حاصل کرنی چاہی کہ وہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیں۔ اقبالؒ بہ مشکل بھوپال کی کمتر رقم کو اس سے دو چند رقم کے مقابلے میں قبول کرنے پر راضی ہوئے اور وجہ یہ بیان کی کہ اول تو اتنی رقم میری ضروریات کے لئے کافی ہے۔ میں زیادہ کیوں لوں۔ دوسرے جب تک میرے دل میں کسی شخص کی کوئی خاص وقعت نہ ہو۔ اس کی امداد قبول نہیں کر سکتا۔ یہ تھا غیرتِ فقر کا تقاضا، ایک ایسے زمانے میں جب روپے کے بازار میں تقریباً ہر شخص کی قیمت لگائی جا سکتی ہے اور بڑے بڑے مشاہیر منصب و جاہ دولت کی خاطر ہر قسم کا "ایثار" کرنے کو تیار ہیں۔"

"ایک اور واقعہ انہیں (علامہ اقبالؒ کو) سر اکبر حیدری کیساتھ پیش آیا۔ واقعہ جانا بوجھا لیکن قابل ذکر ہے۔ انہوں نے یوم اقبالؒ پر" توشہ خانہ حضور نظام" کی طرف سے ایک ہزار روپے کی خطیر رقم بطور تواضع کے پیش کی۔ جب وہ چیک اس تمہید کے ساتھ اس قلندر کے پاس پہنچا تو اس نے ان اشعار کے ساتھ واپس کر دیا جو بعد میں" ارمغان حجاز" میں شائع ہوئے ؎

تھا یہ فرمانِ الٰہی کہ شکوہِ پرویز	دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر	حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات!
میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش	کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول	جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات"[1]

---

[1] آندھی میں چراغ صفحہ ۱۴۴ تا ۱۴۶

ایک غلام اسیدین، نظر حیدر آبادی اور صہبا لکھنوی ہی نہیں بے شمار دوسرے معزز و محترم اُدَبا و ناقدین نے جناب عزیز احمد اور ان کے ہم خیال لوگوں کی ایسی آرا سے نہ صرف اختلاف کیا ہے۔ بلکہ متعدد واقعات کی شہادت پیش کر کے انہیں غلط قرار دیا ہے۔ ان شہادتوں میں ایک اور کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ ہے خود اقبالؒ کی داخلی شہادت۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ بھوپال کے آخری نواب حمید اللہ خاں نے اقبالؒ کے آخری چند سالوں میں ان کا پانچسو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اقبالؒ نواب بھوپال کی اس نوازش کے دلی شکر گزار اور ممنون احسان تھے اور اس کے اظہار میں کبھی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وظیفے کی منظوری پر انہوں نے اپنے دوست سر راس مسعود سے فرمائش کی تھی کہ اس تاحیات وظیفے کے احکام نواب صاحب اپنے قلم سے لکھ کر انہیں بھیج دیں تاکہ وہ اسے فریم کرا کے رکھ لیں۔ اقبالؒ کی اس خواہش کی تہہ میں جذبۂ شاہ پرستی نہیں بلکہ ایک وسیع القلب، کشادہ دماغ اور ایک حساس شخص کا وہ جذبۂ ممنونیت تھا جو کسی کی ایک نگاہِ لطف پر اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ نگاہِ لطف احسان دھرنے کے لئے نہ کی گئی ہو ورنہ ایسے لطف و کرم کا جواب اقبالؒ کی طرف سے جو ہو سکتا ہے اس کی جھلک اس سے پہلے آپ اکبر حیدری کے قصے میں دیکھ آئے ہیں۔ نواب حمید اللہ خاں نے اقبالؒ کے ایک نہایت قدر دان دوست کی حیثیت سے اقبالؒ کے آڑے وقت میں ان کے کچھ کام آنے کی سعادت حاصل کرنی چاہی تھی۔ اور چونکہ اس پیش کش کا دامن احسان کی آلودگی سے پاک تھا اقبالؒ نے اسے کشندہ پیشانی قبول کر لیا۔ لیکن اب دیکھنا تو یہ ہے کہ اس پیش کش کے قبول کرنے سے اقبالؒ کے ان افکار و خیالات پر کیا اثر پڑا جنہوں نے ہمیشہ آزاد فضاؤں میں پرواز کی تھی اور جو کسی بڑے سے بڑے دام میں گرفتار ہونے کو تیار نہ تھا۔

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ　　کہ عنقا را بلند است آشیانہ

سوال یہ ہے کہ کیا شہنشاہیت و ملوکیت اور جمہوریت کے متعلق اقبالؒ کے جو عام خیالات ہمیشہ سے چلے آرہے تھے وہ اس پانچسو روپے وظیفے کے بوجھ تلے دب گئے۔ کیا اقبالؒ نے شہنشاہیت و ملوکیت کے ادارے کی تنقید و مذمت بند کر دی اور اپنی جمہوریت پسندی کا گلا گھونٹ دیا۔ کیا ان کی گفتار و کردار میں ان کا غازی پن ختم ہو گیا، کیا ان کی قلندری اور درویشی پانچسو روپے کے حقیر رقم کے عوض فروخت ہو گئی ــــ نہیں ہرگز نہیں۔ ان کی مابعد زندگی اور ان کا آئندہ کلام شاہد ہے کہ ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہو سکا۔ انہوں نے ایک بار ایک مردِ درویش، ایک راست گفتار اور بلند کردار شخص کا جو کردار اپنے لئے منتخب کیا تھا مرتے دم تک انہوں نے اسے نبھا دیا۔ فرماتے ہیں

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر
کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر میرا کیا ہے شاعری کیا ہے؟

اسی طرح سے

اٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقان کو میسّر نہ ہو روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
سُلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ! — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

بھوپال سے باہر بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ نواب بھوپال کے محل کا نام "قصرِ سلطانی" تھا۔ اقبالؒ کئی بار نواب بھوپال کے مہمان ہو کر بھوپال گئے اور دوسری جگہوں کے علاوہ انہوں نے سر راس مسعود کے مشہور بنگلے "ریاض منزل" میں بھی قیام کیا۔ ضربِ کلیم کی متعدد نظمیں انہوں نے ریاض منزل ہی کے قیام کے دوران میں کہیں جن کا حوالہ خود انہوں نے دیا ہے۔ ریاض منزل سے نواب صاحب کا قصرِ سلطانی اور اس کا گنبد اور اس کا پرچم نظر آتا تھا خود ریاض منزل بھوپال کے مشہور تالاب کے پانی کی ایک پتلی شیریں ندی کے عین دامن میں کھڑی تھی۔ سامنے وسیع و عریض تالاب اور اس کے آگے شملے کی قدرتی پہاڑی کی وسیع چٹانیں اور اس پہاڑی کی فضا میں تیرتے ہوئے باز، شاہین، عقاب اور تبکرے۔ غرضیکہ ایسا عجیب خوبصورت اور دل کش منظر کہ اقبال اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اور ابھی جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اقبالؒ نے اس پُرکیف اور ولولہ انگیز فضا میں متعدد غزلیں اور نظمیں کہیں جن کی تفصیل یہ ہے ریاض منزل میں کہی ہوئی نظمیں۔

(۱) سلطانی ص ۲۶ (۲) تصوف ص ۲۹۔ (۳) وحی ص ۳۳ (۴) مقصود ص ۶۶ (۵) حکومت ص ۹۶
(۶) نگاہ ص ۱۰۲ (۷) امید ص ۱۰۸ (ضربِ کلیم)

شیش محل میں کہی ہوئی نظموں کی فہرست یہ ہے۔

صبح، مومن، ابلیس کا فرمان اپنے فرزندوں کے نام، جمعیت اقوام اور مسولینی۔ (ضربِ کلیم)

میرے مضمون کے زیرِ بحث شعر میں "قصرِ سلطانی کے گنبد" کا فقرہ بلکہ خود "قصرِ سلطانی" کی ترکیب محض اتفاقی اور عام سی ترکیب نہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس شعر کا محرک بھی نواب صاحب کا محل "قصرِ سلطانی" اور اس کا گنبد شملہ پہاڑی کی چٹانیں اور اس کی فضاؤں میں تیرتے ہوئے شاہین ہیں۔ شعر میں شاہین کا لفظ اقبالؒ نے خود اپنے لیے استعمال کیا ہے۔ وہ نواب بھوپال کے مہمان ہوتے ہوئے بھی دل میں بخوبی سمجھتے تھے کہ ان کی اصل جگہ نواب بھوپال کا محل نہیں بلکہ پہنائے فطرت کی کھلی اور آزاد فضا اور وادیاں ہیں۔ وہ اس شعر میں اپنے آپ کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ نواب بھوپال کی چند روزہ مہمانی سے متاثر ہو کر وہ اس کے قصرِ سلطانی کے گنبد کی محدود فضا ہی کو اپنا نشیمن نہ سمجھ

بیٹھیں کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ۔ وہ تو پرندوں کی دنیا کا درویش ہے اور جہاں رزق کا نام آب و دانہ ہو وہ اس خاکداں سے کنارا کرنا ہی بہتر سمجھتا ہے۔ اسے تو بیابان کی خلوت ہی راس نہیں آتی ہے۔ کہ ازل سے اس کی فطرت راہبانہ اور زاہدانہ ہے، پورب، پچھم، اتر اور دکھن چکوروں کی دُنیا ہے جب کہ اس کا "نیلگوں آسماں بے کرانہ ہے" اس زیر بحث شعر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال اگرچہ نواب بھوپال کے نہایت ممنون احسان تھے تاہم ان کا جذبۂ ممنونیت "قصر سلطانی" کے سے خوبصورت محرک الفاظ کو اپنے شعر میں ایک اعلیٰ خیال کے استعمال سے باز نہیں رکھ سکا کہ مبادا اسے کسی ایسے صاحبِ اقتدار کی شان میں گستاخی پر محمول سمجھ لیا جائے جو صاحبِ اقتدار ہونے کے علاوہ ان کا محسن بھی تھا اور جس کے درِ دولت کا نام بھی اتفاق سے یہی تھا۔ ایک آزاد منش، درویش صفت، بے لاگ، صاف گو اور دنیوی مصلحتوں سے پاک اور باوقار انسان کی یہی شان ہے کہ وہ اپنے سچے خیالات و جذبات کے اظہار میں کسی تکلف اور کسی مصلحت کو سنگِ راہ نہیں بننے دیتا۔

اس شعر کو میرے پسند کرنے کی وجہ یہی ہے۔

"بلند حوصلگی، عالی ظرفی، سخاوت اور اپنی روایات پر جائز فخر ایسی چیزیں ہیں، جو شخصیت کے احساس کو مستحکم کرتی ہیں۔"

اقبال کی اردو غزل

پروفیسر صدیق علی مرزا

اردو شاعری کی زندگی غزل سے ہے۔ یہ ہمارے مزاج کا جزو بننے اور ہمیشہ بنے رہنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے تنہائی میں جب کوئی شعر گنگناتا ہے تو وہ غزل ہی کا شعر ہوتا ہے۔ نظم کا نہیں۔ جوا سے کے شعروں میں بھی آپ کو غزل ہی کے اشعار ملیں گے۔ اس سے قطعاً یہ مراد نہیں کہ نظم کوئی غیر اہم چیز ہے۔ نظم کی اپنی انفرادیت اور اہمیت ہے۔ اور اس سے انکار محال ہے ایک وقت تھا جب نظم اور غزل کی بحث میں غزل کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن جب ہم نے اپنے دور کی غزل دیکھتے ہیں تو بلاشبہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ معترضین کو اب اپنے اعتراضات پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ آج کی اردو غزل میں مضامین کا ایسا بے پناہ سرمایہ سمٹ آیا ہے کہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ اور غزل کے موجودہ ارتقار کو دیکھ کر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کی غزل ہمہ نوع مضامین کو اپنے دامن میں سمیٹ لے گی۔

غزل کا ارتقار دراصل ہماری تہذیب کا ارتقار ہے۔ اس جہت سے دیکھا جائے تو ہماری طبیعتوں سے اس کی مناسبت محتاج تشریح نہیں رہتی۔ اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ہوگا جس نے اس صنف شعر سے صرف نظر کیا ہو۔ جن شاعروں نے نظم گوئی کے میدان میں جھنڈے گاڑے ہیں وہ بھی غزل کی راہ سے اس طرف آئے ہیں۔ پروفیسر کلیم الدین احمد اور جوش ملیح آبادی کی غزل دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ کلیم الدین نے اسے 'نیم وحشی صنف سخن' کہا اور جوش صاحب نے غزل کی ضرورت و اہمیت سے ہمیشہ انکار کیا۔ وہ اپنی مسلسل غزلوں کو نظم کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کا اصل موضوع تغزل ہی ہے۔ ان کی بعض پوری کی پوری نظمیں غزل کے تحت آتی ہیں۔ جب کہ ان کی عام نظموں میں بھی غزل کے برتے ہوئے اشعار مل جائیں گے۔ پھر بھی انہیں اصرار ہے کہ وہ نظم کہتے ہیں۔ بھلا وہ اپنی اس نظم کی غزلیت سے کیسے انکار کر سکتے ہیں[1]۔

لے لیا دل اک ہوش ربا نے   کان شوخی، جان حیا نے
آفت جانے فتنۂ شہرے   جان جہانے، روح روانے
بکھری الجھی زلف سیہ میں   شام طرب کے لاکھ فسانے
رخ پر کافر زلف کی لہریں   جیسے ملے سب کے سہانے
گاہ بہ شوخی مست غزالے   گاہ بہ مستی خواب گرانے
گاہ بہ نور صبح یقینے   گاہ بہ ابر شام گمانے!!

---

[1] ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ـــــ (غزل کا نیا رنگ ترنم)

گاہ بہ مسند گفت حدیثے گاہ بہ پہلو راز ہنانے
شکر کہ بخت جوش کے عقدے
کھول دیئے پھر زلف رسانے

یہ غزل مسلسل ہے اور اس نوع کی اور بہت سی مسلسل غزلیں ان کے ہاں مل جائیں گی. جنہیں وہ بہر حال نظم ہی کا نام دیتے ہیں۔
جوش صاحب کی غزلیت والی بات ایک حد تک اقبال کے بارے میں بھی درست ہے ان کا پیغام غزل کے بجائے نظم کا پیکر چاہتا تھا۔ اسی لئے نظم کی طرف ان کی توجہ زیادہ رہی لیکن اس کے باوصف وہ غزل سے پہلو نہ بچا سکے۔ یہ غزل کبھی انہوں نے غزل کے رنگ میں کہی اور کبھی نظم کے پردے میں. میری مراد بالِ جبریل کی غزلوں سے ہے جنہیں بعض لوگ اس لحاظ سے غزلیں نہیں مانتے کہ ان میں سے بیشتر کے مضامین مسلسل ہیں۔ اور تسلسل مضامین نظم کا خاصہ ہے۔ اس سلسلے میں جناب شمیم احمد نے جوش کے ایک حوالے سے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک بار جلال لکھنوی کے سامنے کسی نے غالب کی غزل "مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے" پڑھی اور بہ حیثیت غزل اس کی بہت تعریف کی. تو انہوں نے فرمایا کہ میاں صاحبزادے یہ قطعہ ہے، غزل نہیں۔ غزل میں مسلسل مضمون نہیں ہوتا۔ بات کچھ بھی ہو، اقبال کو غزل کے سربرآوردہ شاعروں میں بہرحال شامل کرنا پڑے گا۔
اقبال نے اپنی شاعری کی ابتدا سیالکوٹ اور لاہور کے طرحی مشاعروں سے کی اور ابتدائے شاعری ہی میں اردو غزل کو ایک ایسا شعر دیا[1] جسے سن کر اساتذۂ سخن بھی دم بخود رہ گئے۔ لیکن کچھ دیر بعد وہ نظم کی طرف مڑ گئے۔ اس دور میں انہوں نے کئی لازوال نظمیں تخلیق کیں. لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا وہ غزل سے اپنا دامن کبھی نہ چھڑا سکے۔ جب کبھی دل سے راز و نیاز کی گفتگو چھڑی، غزل ہو گئی۔ انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں معرکے کی غزل کہی۔ یہ غزل اپنے رنگ و آہنگ میں ایک مخصوص انفرادیت کی حامل ہے۔ اس کا لہجہ توانا ہے۔ اور صدا کے اعتبار سے دل کشا ہے۔ اس مختصر مضمون میں اقبال کی اردو غزل پر کچھ باتیں ہوں۔ فارسی غزل سردست ہمارا موضوع نہیں۔
مجموعی طور سے دیکھا جائے تو اقبال کی آواز نے ایک انقلاب پیدا کر دیا جس سے نہ صرف زبان و ادب میں وسعت پیدا ہوئی۔ بلکہ ہمارے تصورِ حیات کی نئی راہیں کھل گئیں۔ مطلعِ شاعری پر اقبال کے طلوع سے اردو غزل ایک نئی روایت سے آشنا ہوئی جس میں مضمون و معنی اور فکر و خیال کی لامحدود وسعتیں سرِ فہرست ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کی غزل کا لب و لہجہ اچھوتا ہے، اس کے علائم و رموز نئے ہیں۔ تراکیب میں جدت ہے اور زبان دوسرے شعرا سے منفرد ہے۔
مضامین و خیالات کے اعتبار سے اقبال کی غزل میں جدّت، وسعت، عظمت اور رفعت پائی جاتی ہے فکر و فلسفہ اور جذبہ و تخیل کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ عشق و عاشقی کے روایتی مضامین، معاملہ بندی اور مجازی عشق کے لذّت انگیز واردات کا بیان ان کی غزل میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ انہوں نے ایک نئے عشق کا پیکر تراشا جو عاشق کی مریضانہ ذہنیت کے گرد نہیں گھومتا بلکہ ہمہ پہلو حیات منکشف کرتا ہے۔ زندگی میں خون کی گرمی پیدا کرتا ہے اور جہدِ حیات سکھاتا ہے۔ اس میں صرف حسن و جمال کی رعنائی ہے بلکہ جلال کا پہلو بھی موجود ہے۔ اقبال کا عاشق جارحیت پسند ہے اور دامنِ یزداں چاک کرنے

[1] موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چن لئے ÷ قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

سے بھی گریز نہیں کرتا ۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا ۔۔۔ یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

عروجِ آدم کا تصور اقبال کی تمام شاعری کا موضوع ہے اور یہ غزل بھی جاری و ساری ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں ۔۔۔ کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

اقبال نے اپنے فلسفۂ شاعری کو جذبات کی دھڑکن اور تڑپ سے ہم کنار کر دیا ہے۔ ان کے خیالات میں خلوص و صداقت ہے۔ اس چیز نے ان کی غزل میں رندانہ سرمستی اور قلندرانہ رنگ پیدا کیا ہے۔ ان کی غزل کا مخصوص جوش و جذبہ اسی رندانہ سرمستی اور قلندرانہ رنگ کا مرہونِ منت ہے۔ ان کے یہاں عشق و حسن کا باہمی خلوص ملتا ہے۔ پاک بازی و پاک بینی ہے اقبال کس تڑپ سے کہتے ہیں۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں! ۔۔۔ کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں ۔۔۔ نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں!

یا پھر۔

ترا جلوہ کچھ بھی تسلیِ دلِ ناصبور نہ کر سکا ۔۔۔ وہی گریۂ سحری رہا وہی آہِ نیم شبی رہی!

ان اشعار میں تغزل کی جو کیفیت محسوس ہوتی ہے وہ نہایت درجہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ ایک وجدانی کیفیت ہے جو سرمستی لئے ہوئے ہے۔ خودی، بے خودی، عشق و عقل، ابلیس و یزداں، اشتراکیت و جمہوریت ان کے معرکتہ الآرا تصورات ہیں لیکن خالص شاعر اور وہ بھی غزل کے شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی غزل کا جمالیاتی اور فنکارانہ پہلو اپنے اندر بے پناہ حسن رکھتا ہے۔ شاعر کو استعمالِ الفاظ اور وضعِ تراکیب پر کتنا عبور حاصل ہے۔ یہ اندازہ کرنا ہو تو مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے۔

عشق میں پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم ۔۔۔ عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق ۔۔۔ شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم

نہ چھین لذتِ آہِ سحر گہی مجھ سے ۔۔۔ نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز!

نہ مے، نہ شعر، نہ ساقی، نہ شورِ چنگ و رباب ۔۔۔ سکوتِ کوہ و لبِ جوئے و لالۂ خودرو

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم ۔۔۔ کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرمِ سیر ۔۔۔ شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں

یہاں نوائے زندگی، سوزِ دمبدم، بادِ سحرگاہی کا نم، التفات آمیز، لالۂ خودرو، ذوقِ شکر خند اور شانۂ روزگار کی تراکیب قابلِ لحاظ ہیں۔ اقبال سے پہلے اردو شاعری میں ان کا وجود کہیں نہیں ملتا۔ یہ جدا بات ہے کہ بعض لوگ اقبال کی بیشتر غزلوں کو غزل ماننے کے لئے تیار نہیں[1]۔ ان کے نزدیک یہ غزلیں لطفِ مضامین سے خالی ہیں اور خود علامہ مرحوم کو بھی اس کا اعتراف ہے اگرچہ

---

[1] بحوالہ مولینا عبدالسلام ندوی

معاملہ اس کے برعکس ہے،

؎ حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو — نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا
نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں — کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

شاعری کا اصلی ضمیر تغزل یعنی داخلی یا اندرونی تحریک ہے۔ دوسرے لفظوں میں تغزل ہی غزل کی روح ہے۔ غزل میں تغزل کا رچاؤ نہ ہو تو غزل کا بکھیڑا کرنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ اقبال نے جو غزلیں داغ کے زیر اثر کہی ہیں۔ ان میں مجاز کا گہرا رنگ اور تغزل کا نکھرا ہوا روپ ملتا ہے۔

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد — مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا — فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی
میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن — دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
چھپتی نہیں ہے یہ نگہ شوق ہم نشین — پھر اور کس طرح انہیں دیکھا کرے کوئی
نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے — نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی
کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں — دو چار دن میری تمنا کرے کوئی
ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی — کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

تغزل کا رنگ ان کی غزلوں تک ہی محدود نہیں۔ ان کی مشہور و معروف نظموں میں بھی تغزل کی نرم اور شیریں کیفیتیں ملتی ہیں وہ حقیقتاً جذباتی انسان تھے۔ جن پر فکر و فلسفہ کا رنگ غالب آ گیا تھا۔ ان کے اندر جو شاعر تھا۔ وہ حسن پرست تھا، اور کہیں بھی حسن کی دلربا کیفیتوں کو نظر انداز نہیں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع کی نظموں میں بھی یہ شاعر انگڑائی لئے بغیر نہیں رہتا۔ کبھی مناظرِ فطرت کا بیان تغزل کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور کبھی کوئی دوسرا جذبہ۔ مسجد قرطبہ کے یہ اشعار تغزل کا دلآویز رچاؤ رکھتے ہیں۔

؎ آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال — اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
سادہ و پرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت، — کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب

اقبال کی فارسی غزل ہمارا موضوع نہیں، لیکن تغزل کے سلسلے میں ان کا ایک فارسی شعر درج کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

یک نگہ ، یک خندۂ دزدیدہ ، یک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبت نیست سوگندے دگر

یورپ کے سفر کے بعد جب اقبال وطن واپس آئے تو ان کے خیال و فکر میں بے حد وسعت پیدا ہو چکی تھی۔ اب ان کی شاعری کا رنگ بھی بدل چکا تھا۔ کیونکہ ان کے پاس شاعری کے نئے معانی تھے۔ لیکن شاعر کے وہ عاشقانہ جذبات جو بظاہر ان کے عظیم تر مقصدِ شاعری کے باعث کچھ دب سے گئے تھے۔ کبھی نہ کبھی لو دے جاتے۔ اب ان کی

سلطو کبھو کا یہ شعر بے اختیار آ گیا ہے ؎ ہم تیری صورتِ انکار کو پہچانتے ہیں ؛ وہ تبسم تو شریکِ لبِ گویا ہی کر!

زیادہ سنجیدہ تھی، لب ولہجہ باوقار ہو گیا تھا، غزل نئی تہذیب وتزئین سے آشنا ہو چکی تھی۔ اور جذبات میں ستھرا پن پیدا ہو
تغزل نے بھی انگڑائی لی۔

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ	وہ ادب گہ محبت وہ نگہ کا تازیانہ
نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں	نہ پوچھ اے ہم نشیں مجھ سے وہ چشم سرمہ سا کیا ہے
نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دور پیمانہ	فقط نگاہ سے روشن ہے بزم جانانہ
کلی کو دیکھ کے لے تشنۂ نسیم بہار	اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ

آخری شعر کا لطف کچھ اہل ذوق ہی جانتے ہیں۔ خیال کے ساتھ ساتھ الفاظ کا دروبست، جذبے کی شدت اور آسودگی کی خواہش خاص طور پر ملاحظے کی چیز ہے۔

اقبال کی غزل میں یوں تو صوتی خوش آہنگی ہر مقام پر نمایاں ہے لیکن ان کی بعض غزلوں میں ترنم اور موسیقیت کا رچاؤ انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ ان غزلوں میں مستی کی ایک منفرد کیفیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ قاری پر جذب وشوق کا ایک نشہ سا چڑھ جاتا ہے۔ اس موسیقیت کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ دل کو مسحور تو کرتی ہے لیکن سلاتی نہیں۔ یہ حیات پرور ہونے کے ساتھ ساتھ حیات افروز بھی ہے۔ اسی کے اثر اقبال کی غزل کے افکار وخیالات میں تغزل کی چاشنی بڑھ جاتی ہے۔ موسیقیت وترنم کی سحر آفرینی ان اشعار میں خوب نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز	اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز
جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن	جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز
یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ	یک رنگی و آزادی اے ہمت مردانہ
دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی	دل ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی
جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی	کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی
پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ ودمن	پھر مجھے نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن
نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے	خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

کلام کی موسیقیت میں اضافے کا ایک سبب تکرار الفاظ بھی ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ در اصل موسیقی اور لفظوں کے امتزاج سے ہی اچھے شعر کی تخلیق ہوتی ہے۔ میر نے یہ موسیقیت الفاظ، قوافی اور مترنم بحروں کے انتخاب سے پیدا کی۔ ان کے اشعار پڑھ کر اسی واسطے روح اہتزاز کرنے لگتی ہے۔ میر نے ان شعروں میں جو جادو جگائے ہیں۔ ان کا اسیر کون نہیں۔

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے	پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا	دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا!

جب ملنے کا سوال کروں زلف و رخ دکھلاتے ہو
برسوں مجھ کو یوہیں گزرے صبح و شام بتاتے ہو
صبر کہاں جو تم کو کہئے لگ کے گلے سے سوجاؤ
بولو نہ بولو، بیٹھو نہ بیٹھو کھڑے کھڑے ٹک ہوجاؤ
صبح وہ آفت اٹھ بیٹھا تھا تم نے نہ دیکھا صد افسوس
کیا کیا فتنے سرجوڑے پلکوں کے سائے سائے گئے
خوب ہے اے ابر یک شب آؤ باہم روییے
پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر کم کم رویئے
پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے!
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

اقبال کی غزل اپنے آہنگ کے اعتبار سے میر کی غزل سے مختلف چیز ہے لیکن اقبال بھی صوتی دلآویزی اور جملوں کی تکرار کے اثر سے بے خبر نہیں۔ ان کے یہاں بھی ہم آواز الفاظ اور جملوں کی صوتی کھنک اپنا مخصوص اثر دکھاتی ہے ان کی رمزیت اور تغزل چاشنی اس میں مزید رنگ بھرتی ہے۔ جب ان کے جذبے کا رچاؤ اس میں شامل ہوجاتا ہے۔ تو ایسے شعر نکلتے ہیں۔

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف
کھول کے کیا بیان کروں تجھ سے مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیاتِ بے شرف
نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی!
کہ میری زندگی کیا ہے یہی طغیانِ مشتاقی
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن
تو میری نظر میں کافر، میں تیری نظر میں کافر
ترا دیں نفس شماری، مرا دیں نفس گدازی

ان کی ایک خصوصیت موزوں الفاظ اور مناسب بحروں اور زمینوں کا انتخاب ہے۔ انہیں الفاظ کے انتخاب اور ان کی ترتیب میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ وہ جذبہ و خیال کے مطابق ہی بحور و قوافی کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس سلیقہ مندی نے ان کی غزلوں میں بلا کی بلند آہنگی پیدا کردی ہے۔ ان کی غزلوں کا مخصوص تغزل بھی اسی کی دین ہے۔ یہ تغزل حد درجہ اثرانگیز ہے۔ الفاظ و بحور کی سلیقہ مندی کا کچھ اندازہ ان شعروں سے ہوگا۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
متاعِ بے بہا ہے دردو سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دُنیا نہ وہ دُنیا ۔۔۔ یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی
گزر و اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں ۔۔۔ کہ شاہین کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

اقبال اکثر ردیف اڑا جاتے ہیں اور قافیہ پر ہی اپنی لے کی تان توڑتے ہیں جس کا اثر یہ ہوا کہ ردیف کو مرکزی خیال سے ہم کنار کرنے کی طرف زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی ۔ اپنا خونِ جگر انہوں نے قافیوں میں ہی سمو دیا ۔ اکثر قافیے زیادہ عالمانہ اور نامانوس آتے ہیں ۔ لیکن ان کی جذب و مستی ان میں ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہے قافیوں کی گرانی کے باوجود ان میں تاثیر کا سحر بدرجۂ اتم موجود ہوتا ہے ۔ اس سے باوقار ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے یا ایک مفکرانہ قطعیت[2]، جو اقبال کے ساتھ خاص ہے ۔ ان کی قلندرانہ سرمستی اور بحروں کی غنائیت اسے مزید خوشگوار اور لطیف بنا دیتی ہے ۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی ۔۔۔ کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی ۔۔۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ۔۔۔ ہو جس کی فقیری میں بوئے اسداللّٰہی
آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بے باکی ۔۔۔ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل ۔۔۔ اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل
فریب خوردۂ منزل ہے کارواں ورنہ ۔۔۔ زیادہ راحتِ منزل سے ہے نشاطِ رحیل[3]
مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں ۔۔۔ کہاں حضور کی لذت کہاں حجابِ دلیل

ہر بڑا شاعر اپنی زبان ساتھ لے کر آتا ہے ۔ کیونکہ روزمرہ اور عام زبان اس کے وقیع خیالات کا ساتھ دینے سے عاجز ہوتی ہے ۔ اس کا اندازہ غالبؔ کے کلام سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے ۔ زبان کے سلسلے میں انہوں نے کیا کیا خارشگافی نہیں کی ۔ ابتدا میں بیشک ایسی زبان نامانوس ہوتی ہے ۔ لیکن اس زبان کو جب شاعر کی قد آور شخصیت کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے تو یہی زبان اس کے خیال و فکر کی گرہیں کھولنے کے لئے موزوں سمجھی جاتی ہے اقبال نے بھی ایسی ایسی تراکیب اختراع کیں جو جدت کے اعتبار سے بالکل اچھوتی ہیں ۔ بلکہ اردو غزل اور شاعری میں بھی وہ صرف اقبال سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہیں ۔ ان تراکیب میں فارسی کا اثر صاف ظاہر ہے ۔ ان کی شاعری کا موضوع زندگی ہے اور زندگی کی ترفیع و تہذیب کے لئے انہوں نے اردو اور فارسی کی بڑی خوبصورت بندشوں اور ترکیبوں سے کام لیا ہے ۔ طغیانِ مشتاقی، جہانِ اضطراب، سوز و سازِ ہستی لذت گیرِ وجود، سرمستِ مئے نمود ایسی ہی چند ایک ترکیبیں ہیں ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں کہ " اس (اقبال) نے اپنے کلام میں زندگی کی نسبت جس قدر تشبیہیں، استعارے اور ترکیبیں استعمال کی ہیں، ان کی مثال فارسی اور اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی ۔ ان ترکیبوں کی قدرت اور طرفگی سے فارسی اور ادب کو چار چاند لگ گئے ۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے موضوع کو فارسی اور اردو میں سب سے پہلے اسی نے پیش کیا ۔ اس کی تشبیہیں اور ترکیبیں اس کی وسعتِ فکر پر دلالت کرتی

---

[1] ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ــــــ غزل کا نیا رنگ ترنم)   [3] اس خیال کی صدائے بازگشت خضر راہ کے اس شعر میں بھی ملتی ہے ۔
ــــــ اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں ÷ گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل

ہیں۔ ہم چند ایک تشبیہیں درج کرتے ہیں:۔

شرابِ زندگی، حبابِ زندگی، سرودِ بربطِ ہستی، مذم گاہِ خیر و شر، آرزوئے ناصبور، شورشِ بزمِ طرب، ذوقِ جدت، ذوقِ نمو، خاتمِ ہستی، آئینہ دارِ ہستی، ذوقِ آگہی، تابِ دوام، لطفِ خرام، کوششِ ناتمام، منت کشِ ہنگامہ، کشاکشِ پیہم، انگبینِ زندگانی، قافلۂ رنگ و بو، لذتِ یکتائی، تخلیقِ تمنا، تقویمِ حیات، شرارِ زندگی وغیرہ وغیرہ۔

اقبال نے اُردو شاعری کی قدیم علامتوں کو بھی بدل دیا اور اردو شاعری کو نئی رمزیت اور ایمائیت عطا کی پرانی شاعری میں شمع و پروانہ، ساقی و مے خانہ، جام و بادہ، شراب و نغمہ، زلف و خال، وغیرہ کی اصطلاحات میں عام طور سے ایک قسم کی پژمردگی اور بے جانی سی تھی۔ اقبال نے ان اصطلاحات میں نئی زندگی کی لہر دوڑا دی۔ ایک نئی گرمی، جوش اور پُر لطف رمزیت پیدا کر دی جو بالکل انہیں سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کی رمزیت ایک نیا جہانِ معنی ہمارے سامنے لاتی ہے۔ جس سے وجدان اور جذبے کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ قلندر، شاہین باز اور لالہ وغیرہ کے الفاظ کو انہوں نے نئے سیاسی، قومی اور فلسفیانہ معنی پہنائے۔ سید عابد علی عابدؔ کے مطابق نئی رمزیت کا یہ کام اقبال سے پہلے حالیؔ نے شروع کیا لیکن اقبال ان سے بھی آگے بڑھ گئے۔ ان کی نئی رمزیت سے زبان و بیان کو بے پناہ وسعت ملی ہے۔

بعض معترضین اقبال کی زبان کو کتابی زبان کا طعنہ دیتے ہیں۔ یہ بات ایک حد تک درست سہی، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی زبان بالکل بے مزہ ہے۔ اس میں سادگی ہے، سلاست ہے، غنائیت اور شیرینی ہے زبان کے اعتبار سے ان کی کئی غزلیں نہایت سادہ ہیں۔ ہم اپنے دعویٰ کے ثبوت میں یہ غزلیں پیش کرتے ہیں اور فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں:

عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ نور دل کا نور نہیں!!
علم میں بھی سرور ہے، لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حُور نہیں
کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں — ایک بھی صاحبِ سرور نہیں

..........(پوری غزل)

ہر شے مسافر ہے ہر چیز راہی — کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی
تو مردِ میداں تو میرِ لشکر — نوری حضوری تیرے سپاہی
دل ہے مسلماں تیرا نہ میرا — تو بھی نمازی، میں بھی نمازی
میں جانتا ہوں انجام اس کا — جس معرکے میں ملا ہوں غازی

بہرحال ان کی سادگی کو داغؔ، امیرؔ اور جلالؔ لکھنوی وغیرہم کی سادگی کے مقابلے میں مختلف زاویۂ نگاہ سے

دیکھنا ہوگا۔ انہوں نے خیالات و افکار کے اظہار کو اولیت دی ہے۔ زبان و بیان کی مرصع سازی اور لفظی قلابازیاں ان کا مقصود نہیں تھا۔ وہ ایک پیغام لے کر آئے تھے۔ جسے انہوں نے ایک باوقار شعری زبان میں ادا کر دیا۔ ان کا یہ کمال کیا کم ہے کہ انہوں نے اردو غزل کو لامحدود وسعتوں سے روشناس کرایا۔ اسے نئی علامتیں اور اصطلاحیں دیں۔ ان کی نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں اور نئی امیجری اردو غزل کے پیرہن کے لئے باعث زینت بن گئی ہے۔ انہوں نے غزل کو ایک نیا لب و لہجہ اور نیا آہنگ دیا ہے۔ لیکن روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے۔ انہوں نے آئندہ آنے والوں کے لئے غزل میں نئے امکانات کی نشاندہی کی ہے اور اپنے فکر و خیال سے اردو زبان کو جو وسعت عطا کی ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

"مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی، اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لئے برسوں چاہئیں۔"

اقبالؒ ـــ مکاتیب کے آئینہ میں

پروفیسر افضل حسین علوی

علامہ اقبالؒ کے خطوط بے شمار ایسے ادبی، علمی اور فنی نکات کے حامل ہیں جو ان کی برسوں کی سوچ اور مطالعہ و تحقیق کا نچوڑ ہیں۔ علامہ موصوف کے فکری ارتقاء اور تحول سے مکمل آگاہی کے لیے ان خطوط کا مطالعہ ایک حد تک ناگزیر ہے۔ اسلوب و انشاء کے لحاظ سے بھی یہ خطوط بہت دلکشی کا سامان رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان میں وہ آورد، وہ تصنع اور زبردستی کی انشاء پردازی نام کو نہیں جو بیسویں صدی کے بعض ان مشاہیر کے مکاتیب میں موجود ہے جو غالباً لکھے ہی اس لیے گئے کہ بعد میں ایک باقاعدہ صنفِ ادب کے طور پر اشاعت پذیر ہوں۔ لیکن اقبال کے خطوط اپنی سادگی کے باوجود اپنے اندر ندرت بھی رکھتے ہیں اور اثرانگیزی بھی، جو ہر اس سخن کا خاصہ ہے جو دل کی گہرائی سے نکلتا ہے اور سیدھا دل ہی میں جا کر گھر کر لیتا ہے۔

تاہم سطورِ ذیل میں مکاتیبِ اقبالؒ پر اسلوب و انشاء کے حوالے سے روشنی ڈالنا مقصود نہیں بلکہ اس کرب اور تڑپ کی نشاندہی مطلوب ہے۔ جو ملت اسلامیہ کی زبوں حالی پر اقبالؒ کو بے قرار کئے رکھتی تھی۔ ان عقائد کو واضح کرنا مقصود ہے جو ان کے کلام کے پس منظر میں کارفرما ہیں اور ادب وفن کے بارے میں ان کے قضایا کے محک و معیار ہیں۔ ان خطوط کے مطالعہ سے ملتِ اسلامیہ کی فکری اور عملی توتوں کے زوال کے اسباب و علل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اور میں نے زیادہ تر اسی نقطۂ نظر کے ساتھ خطوط سے خوشہ چینی کی ہے۔

ان خطوط کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اقبال کے نزدیک تصوف نے مسلمانوں کی اجتماعی اور ادبی زندگی میں کیا نقش ادا کیا ہے۔ اور ان کے عقائد کے سنوارنے یا بگاڑنے میں کہاں تک اس کا ہاتھ ہے۔ میرے پیش نظر اس وقت وہ خطوط ہیں جو اقبال نامہ کے نام سے جناب شیخ عطاء اللہ نے جمع کئے ہیں، یا پھر ان خطوط کا مجموعہ جو عطیہ فیضی نے اقبال کے بارے میں اپنی یادداشتوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یوسف سلیم چشتی صاحب کی شرح اسرارِ خودی میں دیئے گئے کچھ خطوط سے بھی استفادہ کیا گیا۔

عطیہ فیضی کے نام خطوط میں اقبال کے بعض خانگی امور پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ دلچسپ امر بھی سامنے آتا ہے کہ نابغۂ سخن غالب کی طرح اقبال بھی بامر مجبوری یا بطور ایثار ہی اپنے رفیقِ حیات سے نباہ کرتا رہا۔ چنانچہ عطیہ کے نام ایک خط میں رقم طراز ہیں۔

"میری بدقسمتی ایک وفادار کتے کی طرح میرا پیچھا کر رہی ہے (ندرت تشبیہ دیکھئے راقم)

اور میں نے اس خاتون کو پسند کرنا سیکھ لیا ہے۔ بہ سبب اس کی نہ جھکنے والی وفاداری کے جو اسے اپنے بدنصیب اور ناشاد بادشاہ سے ہے"

اول الذکر مجموعہ خطوط میں اقبال کے فکری تحول وارتقاء، عقاید ونظریات اور ملت اسلامیہ کے بارے میں ان کی سوچوں کے مختلف گوشوں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ راقم نے سطور ذیل میں اسی مجموعہ خطوط کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے۔

اقبال کو یہ احساس بڑی شدت سے تھا کہ مسلمانوں کی عملی قوتوں کے مفلوج ہوتے اور غلامی سے مصلحت کوشانہ سمجھوتہ کر لینے میں بھی ادب کے افکار و اثرات کو خاصا دخل حاصل ہے، چنانچہ منشی سراج الدین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض وغایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں"

اقبال کے نزدیک یہ تاثر پذیری ملت اسلامیہ کے لئے بوجوہ مہلک ہے۔ چنانچہ مثنوی اسرار ورموز میں

؎ فکر صالح در ادب می بایدت — رجعتے سوئے عرب می بایدت — کا

نعرہ لگاتے ہیں اور حافظ شیرازی کے ادب وفن کی دلکشیوں اور رعنائیوں کا اس حد تک مسحور ہونے کے باوجود کہ بروایت عطیہ فیضی:

"میں جب حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں تو اس کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت شاعر کی شخصیت میں گم ہو جاتی ہے۔ اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں"

اقبال ملت اسلامیہ کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ؎ بے نیاز از محفل حافظ گزر

کیونکہ ؎ محفل او در خور ابرار نیست — ساغر او قابل احرار نیست

(حوالہ بالا شعر اسرار ورموز کے پہلے ایڈیشن میں تھے۔ بعد میں حافظ کے پرستاروں کے احتجاج پر حذف کر دیئے گئے) ایرانی ادب کے بارے میں علامہ کے اس ردعمل کا سبب ہمیں اس خط سے معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے ۱۰ر جولائی ۱۹۱۶ء کو سراج الدین پال کو لکھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا۔ تاہم وقت پاکر ایران کا طبعی اور آبائی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب وغریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید وتنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو

ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجہ کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعارِ اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔" مثلاً:

غازی زپئے شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تر ازوست
در روزِ قیامت ایں باو کہ ماند
ایں کشتۂ دشمن است واں کشتۂ دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابلِ تعریف مگر انصاف سے دیکھئے تو جہاد اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ شاعر نے کمال یہ کہ جس کو زہر دیا ہے۔ اس کو احساس بھی اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے۔ بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے آبِ حیات پلایا گیا ہے۔ آہ مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے تھے۔ اس نکتہ خیال سے نہ صرف حافظ بلکہ تمام شعرائے اسلام پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ اگر آپ حافظ پر لکھیں تو اس نکتہ خیال کو ملحوظ رکھیں۔ جب آپ اس نگاہ سے شعرائے معروف پر غور کریں گے۔ تو آپ کو عجیب و غریب باتیں معلوم ہوں گی۔

اقبال کو جو بات معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ شعرائے عجمی تصوف کے زیرِ اثر (بقول اقبال لٹریچر میں دلفریبی اور حسن تو پیدا کرتا ہے لیکن ایسا کہ طبائع کو پست کرنے والا (بنام اکبر الٰہ آبادی) اسلامی عقائد و تعلیمات میں باطنی مفہوم تلاش کر کے لوگوں کو اسلام کے حلقۂ اطاعت و تسلیم سے نکلنے میں حیرت انگیز طریقے سے مدد پہنچاتے ہیں۔ علامہ صاحب ان کے رویئے پر یوں احتجاج کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب یا قوم کے دستور العمل میں یا شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا۔ اصل میں اس دستور العمل کو منسوخ کر دینا ہے۔ یہ ایک طریق تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔" (بنام سراج الدین پال)

علامہ صاحب کا یہ تجزیہ بہت خیال افروز اور معنی خیز ہے۔ اسلام کی گزشتہ صدیوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو یہ حقیقت ام نشرح ہو جائے گی کہ اسلام کے ایوانِ رفیع و منیع میں نقب زنی "باطنی مفہوم پڑھنے" کے راستے سے ہوئی ہے۔ اکثر مذاہب باطلہ اور جھوٹے اور "بروزی" نبیوں نے خواہ وہ ہندوستان میں ہوئے یا ایران میں اپنا جال اس "باطنی مفہوم" کے میدان نیرنگ اثر میں بچھایا ہے اور عامۃ المسلمین زبانِ عربی اور محاورۂ عرب سے ناواقفیت کی بنا پر آسانی سے اس جال میں پھنس جاتے رہے ہیں۔ اقبال کو مسلمانوں کی اس کم علمی کا بھی شدید احساس تھا چنانچہ سراج الدین پال ہی کو لکھتے ہیں:

"ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب

سے بالکل کام نہیں لیتے یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معنی لئے جاتے ہیں جو عربی میں ہرگز نہیں اسطرح ان لوگوں نے (باطنی مفہوم تلاش کرنے والے) نہایت بے دردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دیئے ہیں"

اس خط میں آگے جا کر علامہ صاحب نے محی الدین ابن عربی کی کتاب "فصوص الحکم" کے بارے میں ذرا متشددانہ رنگ میں جو لکھا ہے کہ "جہاں تک معلوم ہے۔ فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں" تو یہ بھی ایک شدید احتجاجی عکس العمل ہے اس روش باطن پر رہی کا جس نے اسلام کی شریعت کی واضح اور صاف تعلیمات کو فلسفیانہ اور وجودی مباحث کے گرد و غبار میں چھپا دینا چاہا۔

اقبال صاحب حال صوفی کے بیٹے اور خود بھی صوفی منش تھے۔ اہل اللہ کی خدمت میں حاضری دینا میں سعادت خیال کرتے تھے۔ اور جس مرد مومن یا مرد حق کے ترانے وہ اپنے کلام میں جا بجا گاتے ہیں وہ بھی اہل اللہ ہی ہیں لیکن اس تمام تر عقیدت کیشی کے باوجود تصوف کی آڑ میں جب وہ ملحد و زندیق عناصر کو اسلام کے چشمۂ صافی کو گدلا کرتے دیکھتے ہیں۔ تو وہ ایسے خیال کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جو جادۂ اعتدال سے کچھ ہٹا ہوا اور متشددانہ رنگ لئے ہوئے تھے۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی کو جنہیں وہ استاذ الکل اور جوئے علوم اسلامیہ کا فرہاد قرار دیتے ہیں ۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے" (بنام سید سلیمان مورخہ ۱۳، نومبر ۱۹۱۷ء)

لطف کی بات یہ ہے کہ اس خط میں آگے جا کر وہ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ وہ سلسلہ قادریہ میں خود بیعت بھی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک سلسلہ تصوف میں بیعت نابغہ میں یہ فکری تحول کیسے رونما ہوا کہ وہ اسے سرزمین اسلام میں اجنبی پودا قرار دینے پر مجبور ہو گیا اس بات کا جواب خواجہ حسن نظامیؒ کے نام اقبالؒ کے خط میں ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی تیز ہو گیا ہے۔ کیونکہ یورپین فلسفہ بحیثیت مجموعی وحدۃ الوجود کی طرف رُخ کرتا ہے، مگر قرآن میں تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا۔ اس مقصد کے لئے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات سے ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔"

وسیع مطالعے کے بعد ہی علامہ صاحب پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ بہت سے عجمی عناصر نے تصوف کے پردے میں رہبانہ عقاید و نظریات کو فروغ دیا اور قیود شرعیہ کو معطل کیا۔ قرملی تحریک نے بھی اپنے ملحدانہ عقاید کی ترویج کے لئے تصوف ہی کا لبادہ اوڑھا۔ چنانچہ اقبالؒ خواجہ صاحب کے نام محولہ بالا خط میں لکھتے ہیں۔

"رہبانیت عیسائی مذہب کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ ہر قوم میں پیدا ہوئی۔ اور ہر جگہ اس نے قانون

شریعت کا مطالبہ کیا۔ اسلام دراصل اسی رہبانیت کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔"
تاہم اس خط میں وہ اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ کون سا تصوف ہے۔ جو ان کے نزدیک شریعت سوز و کردار ادا کرتا ہے۔ لکھتے ہیں :

"اس جگہ تصوف سے مراد ایرانی تصوف ہے۔ اس نے ہر قوم کی رہبانیت سے فائدہ اٹھایا اور ہر وہی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ قرمطی تحریک کا مقصد بھی بالآخر نیود سرسیہ اسلامیہ کو فنا کرنا تھا۔ اور بعض صوفیا کی نسبت تاریخی شہادت موجود ہے کہ وہ اس تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔"

لہٰذا ایسے شخص سے جو عمیق مطالعہ کا حامل ہو اور جس کے پاس بعض "صوفیا" کے قرمطی تحریک سے وابستگی کی تاریخی شواہد موجود ہوں۔ یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ عامۃ المسلمین کی طرح تصوف کے ہر رنگ کو عین اسلام اور ہر لبادہ تصوف اوڑھے ہوئے شخص کو خادم اسلام اور صوفی سمجھ لے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال عجمی تصوف اور اسلامی تصوف میں واضح خطِ امتیاز کھینچتے ہیں۔ چنانچہ اکبر الٰہ آبادی کو لکھتے ہیں۔

"عجمی تصوف سے لٹریچر میں دلفریبی اور حسن تو پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ایسا کہ طبائع کو پست کرنے والا اور اس کے برعکس اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے۔"

سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں :

"تصوف سے مراد اگر اخلاص فی العمل ہے تو اس سے مجھے کوئی اختلاف نہیں۔"

حافظ اسلم جیراجپوری کو لکھتے ہیں۔

"تصوف سے مراد اگر اخلاص فی العمل مراد لی جائے (اور یہی مفہوم قرونِ اولیٰ میں لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور ذات باری تعالیٰ کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔"

اور یہ بغاوت اتنی شدت اختیار کر جاتی ہے کہ وہی حسین بن منصور حلاج ہیں جس کو وہ بندۂ حق قرار دیتے ہیں۔ اور گلہ کرتے ہیں کہ ؎ بندۂ حق را بدار آویختند (جاوید نامہ)

اقبال جب اس کا مؤلفہ رسالہ "کتاب الطواسین" مطالعہ کرتے ہیں تو خود بھی اسے گردن زنی سمجھنے لگتے ہیں چنانچہ مذکورہ بالا خط میں وہ لکھتے ہیں۔

"حسین بن منصور حلاج کا رسالہ کتاب الطواسین جس کا ذکر ابن حزم کی فہرست میں ہے۔ فرانس میں شائع ہو گیا ہے۔ حسین بن منصور کے اصلی معتقدات پر اس رسالہ سے بڑی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مسلمان اس کی سزا دہی میں بالکل حق بجانب تھے۔ ابن حزم نے کتاب "الملل والنحل" میں جو کچھ منصور کے متعلق لکھا ہے۔ اس کی اس رسالہ سے پوری تائید ہوتی ہے۔

لطف یہ ہے کہ قدیم صوفیا سب کے سب اس سے بیزار تھے۔ معلوم نہیں متاخرین اس کے اس قدر کیوں دلدادہ ہو گئے۔

مذہب آفتاب پرستی کے متعلق جو تحقیقات موجودہ زمانے میں ہو رہی ہیں اس سے امید ہوتی ہے کہ عجمی تصوّف کے پوشیدہ مراسم کی اصلیت بہت جلد دنیا کو معلوم ہو جائے گی۔"

اس خط کے مندرجات سے یہ بات بڑے مسکت انداز سے واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کا ہدفِ تنقید اور موردِ تنقیص تصوّف کونسا ہے اور کیوں ہے اور اپنے کلام میں وہ جن صوفیوں پر چوٹیں کرتے ہیں وہ کس دائرۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

عقائد اسلامیہ میں نقب زنی کا جو کام قرونِ وسطیٰ میں عجمی تصوف اور اس کے مختلف اداروں اور تحریکوں (جیسے قرمطی تحریک) نے سرانجام دیا وہی کام انیسویں بیسویں صدی میں یورپ کی مختلف یونیورسٹیاں تحقیق کے پردے میں سرانجام دے رہی ہیں۔ اقبال کو اس تلخ حقیقت کا بھی احساس تھا چنانچہ علوم اسلامیہ میں ریسرچ کے لئے یورپ کا رُخ کرنے کا ارادہ رکھنے والے ایک فاضل نوجوان کو لکھتے ہیں :

"جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے۔ فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد "خاص" ہیں۔ جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاقِ حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے۔ سادہ لوح مسلمان طالب علم اس طلسم میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے۔ میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے لئے یورپ جانا بے سود ہے۔

؎ میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں"

(بنام حافظ فضل الرحمٰن انصاری ۲۷ جولائی ۱۹۳۷ء)

فرنگ مآب پہلے بھی اور آج بھی ہر مغربی اور جدید چیز کو محمود اور ہر مشرقی اور "قدیم" قدر کو بہ نظرِ استخفاف عامر دیکھنے کے عادی ہیں۔ غالباً اسی روشِ فکر کے پیش نظر ہی سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے" (۱۷ ستمبر ۱۹۳۳ء)

اور المیہ یہ ہوا کہ عصرِ حاضر میں مسلمانوں کی رہبری اور رہنمائی کی باگ ڈور بیشتر ممالک اسلامیہ میں اسی طبقے کے ہاتھوں میں آئی۔ جنہیں علامہ صاحب پست فطرت قرار دے رہے ہیں۔ راقم کے پاس اس امر کے ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ انگریز نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اپنے زیر انتداب مسلمان ملکوں میں ان عناصر کو آگے کیا۔ اور مسلمانوں کی قیادت و رہنمائی انہیں سونپی جو اسماً اور صورتاً نہیں تو معناً انگریز تھے۔ مگر یہ سطور اس بحث کی متحمل ہو سکتی ہیں اور نہ ہی یہ بحث موضوع سے مطابقت رکھے گی کہ غرض تو اقبال کے خیالات و نظریات کی پیش کش ہے۔ مگر جملۂ معترضہ کے طور پر اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آج اگر اسلام مظلوم ہے اور بہ حیثیت مکمل ضابطۂ حیات کے اس کی تنفیذ، بھرپور تنفیذ سوائے ایک دو ممالک کے دیکھنے میں نہیں آ رہی تو

اس کی وجہ یہی مغرب زدہ طبقہ ہے جو بدقسمتی سے مسلمانوں کا قائد و رہنما بن بیٹھا ہے چنانچہ سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں،

"میں آپ کو سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے"

اقبال کا اضطراب عامتہ المسلمین کی علوم اسلامیہ سے بے خبری اور تعلیم یافتہ طبقے کی فرنگ مآبی زندگی کی وجہ سے تھا۔ لہٰذا سلیمان ندوی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں قدیم ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ جدید، بلکہ میرا ذاتی میلان قدیم کی طرف ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی ممالک میں عوام اور تعلیم یافتہ دونوں طبقے علوم اسلامیہ سے بے خبر ہیں۔ جس سے یورپ کے "معنوی استیلاء" کا اندیشہ ہے (اور آج یہ اندیشہ حرف بحرف درست ثابت ہو رہا ہے۔ راقم)" ۱۷ر اپریل ۱۹۲۶ء

خود علامہ صاحب کو بھی یہ احساس تھا کہ علوم اسلامیہ پر کماحقہٗ دسترس حاصل نہیں چنانچہ صوفی تبسم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے البتہ فرصت کے اوقات میں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ ہو۔"

اسی احساس کے زیر اثر سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا۔"

آخر عمر میں اس احساس میں مزید شدت آگئی تھی۔ چنانچہ اپنی بہن کو لکھتے ہیں۔ (حافظے سے لکھ رہا ہوں۔ خط سامنے نہیں ہے ڈاکٹر اکرام نے اپنے تحقیقی مقالے "اقبال در راہ مولوی" میں یہ خط دیا ہے)

"اللہ تعالیٰ نے جس قدر توانا ذہن مجھے دیا تھا اگر میں اس کو مغرب کے بے کار علوم پڑھنے کے بجائے دینیہ کی تحصیل میں صرف کرتا تو میں اسلام کی بہت خدمت کر سکتا تھا۔ (مگر آج انہی بیکار علوم مغربیہ کی تدریس میں قوم کی توانائیاں صرف کی جا رہی ہیں۔ راقم)"

تلافی مافات کے طور پر علامہ صاحب آخری عمر میں مطالعہ کتب ترک کر کے صرف قرآن و مثنوی پڑھتے تھے۔ لیکن اس حقیقت کے اظہار میں پھر بھی کوئی تامل نہیں کیا کہ

"مثنوی کبھی شروع سے لے کر آخر تک پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔" (۲۴ اگست ۱۹۲۳ء بنام سید سلیمان ندوی، اقبالنامہ)

علم کی دنیا میں ہلدی کی گرہ لے کر پنساری بن بیٹھنے والے لوگوں کو سطور بالا کچھ غور سے پڑھنا چاہیئے اور انہیں علوم اسلامیہ پر چند کتابیں پڑھ کر مجدد بن بیٹھنے کی دھن میں مبتلا ہونے کی بجائے اپنے مبلغ علم کو بڑھانے کی فکر کرنی

چاہیئے۔ خود علامہ صاحب آخر عمر تک ایک طالب علم رہے اور علومِ دینیہ کے مشکل مسائل میں وقت کے جید علماء سے استفادہ کرتے رہے اور انہوں نے کسی کے سامنے کبھی کوئی عار محسوس نہیں کی۔ اور یہی روش ان کی عظمت کی ایک بین دلیل ہے۔ علامہ صاحب نے سید سلیمان ندویؒ کے تبحر علمی کے سامنے ہمیشہ سر جھکایا۔ اس سے سید سلیمان ندوی کے تبحر علمی کا ہم لوگوں کو بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جب سید سلیمان ندویؒ حکیم الامت اشرف علی تھانوی سے بیعت ہوتے ہیں اور ان کی عالمانہ گفتگو اور تقریر سنتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں: "میرا علم اس شخص (یعنی شاہ اشرف تھانوی) کے علم میں گم ہو گیا"۔۔۔ تو کیا شان ہو گی۔ شاہ اشرف کے تبحر علمی کی مگر افسوس کہ اقبالؒ کے پرستاران ماخذوں اور سوتوں سے سیراب نہیں ہوتے۔ جہاں سے اقبال اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ بلکہ اس منکر اسلام کے کلام کی من مانی تاویلیں کرنے اور اپنے لئے شہرت کے محل تعمیر کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ کبھی کوئی اسے اشتراکی ثابت کرتا ہے تو کوئی ملا دشمن (حالانکہ اقبالؒ علمی استفادے کے لئے ان مسٹروں کے پاس نہیں، بلکہ ان ملاؤں ہی سے رجوع لاتے تھے)

لیکن اقبالؒ کہتے ہیں کہ

"میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں، مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا۔ باقی رہا سوشلزم تو اسلام خود ایک سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے بہت کم فائدہ اٹھایا" (خط بنام غلام السیدین)

الحمد للہ اقبال مسلمان تھے اور اول و آخر مسلمان تھے۔ ان کی تمام ترنے نوازی ملت اسلامیہ کو جگانے اور اسے اس کا بھولا سبق یاد دلانے کے لئے تھی۔ اور ان کا فکر جو فہم دین میں چالاک و چست تھا ؎

فکرِ من در فہمِ دیں چالاک و چست

ہر اس فتنے کی نشاندہی اور سرکوبی کے لئے مستعد رہتا تھا۔ جس سے اسلام کو کسی پہلو سے بھی گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ یہ ان کی تیزیٔ فکر کا ہی نتیجہ تھا کہ انہوں نے برصغیر میں قادیانی فتنے کے مضرات کا ایک حد تک سب سے پہلے اندازہ لگایا اور ان کو مسلمانوں کو ایک ایک اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ اقبالؒ کو اس فتنے کے علمی سرچشمے کا بھی علم تھا۔ چنانچہ "قادیانی مذہب" کے مصنف جناب پروفیسر محمد الیاس برنی کو لکھتے ہیں۔

"قادیانی تحریک یا یوں کہئیے کہ بانی تحریک کا دعویٰ مسئلہ بروز پر مبنی ہے۔ مسئلہ مذکور کی تحقیق تاریخی لحاظ سے از بس ضروری ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے۔ نبوت کا سامی تخیل اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ میری ناقص رائے میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کرنے کے لئے کافی ہو گی"

دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں، کہ فتنۂ قادیانیت مابعد الطبیعیاتی گورکھ دھندوں کی ایک سیاسی شکل ہے جس نے سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے مختلف ادوار کی مختلف زندیق عجمی تحریکوں کی ان مصطلحات کا

بیدردانہ استعمال کیا ہم کو قرآن و سنت میں کوئی حیثیت و اصلیت نہیں۔

آج ہم فکر و نظر کے جس دور سے پر ایک بحرانی اور بے عملی کی کیفیت کا شکار ہیں اس کا سبب وہی ہے جس کا احساس اقبال کو برسوں پہلے ہو گیا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس صداقت احساس پر الہام کا گمان گزرتا ہے لکھتے ہیں۔

"علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیہ اسلام سے بے پرواہ اور حکام میں سے ہیں: اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے۔ لیکن ان کا کوئی بے غرض راہنما نہیں"۔ (بنام چوہدری نیاز علی ۲ / جولائی ۱۹۳۷ء)

کتنی سچی بات ہے اس قوم کو ڈبونے والے خود غرض لیڈر ہی ہیں۔ ان کی خود غرضیوں نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ اب تو اتنے فریب کھائے ہیں کہ تمیز مخلص ہی ختم ہوتی جا رہی ہے یا خدا مدد دے۔

رنگ و نسل کی بنیاد پر مخلوق خدا کی حد بندیوں کا اقبال سخت مخالف تھا۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اقبال ہی کے دیس میں صوبائی عصبیتوں کے نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ ایک ہی کلمے، ایک ہی خدا اور ایک ہی نوبہار کے پروردگان کو سندھی، بلوچی، سرحدی اور پنجابی کے خانوں میں بانٹا جا رہا ہے۔ اور زمین باوجود وسعت کے مخلوق خدا پر تنگ کی جا رہی ہے دیکھئے اقبالؒ کیا کہتے ہیں:

"رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ اسلام اور سائنس باہم متناقض ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور نسلی امتیاز باہم متناقض ہیں۔ اسلام بلکہ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ یہی رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ بنی آدم سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اختراع کے خلاف پوری قوت سے جہاد کریں"۔ (خط بنام پروفیسر نکلسن)

لیکن افسوس کہ ابلیس کی اختراع کے خلاف جہاد کے بجائے ایسے حیلے بہانے فروغ دینے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اور ساتھ ساتھ خدمت اسلام کے بلند بانگ دعوے بھی کئے جا رہے ہیں۔ ؎

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

بعض کچھ فکر حلقے اقبالؒ کے اشعار کے پس منظر سے عدم آگاہی کی وجہ سے اسے فاشسٹ قرار دیتے ہیں۔ لیکن ذیل میں مولوی ظفر احمد صدیقی صاحب کے نام ایک طویل خط کے اقتباس سے اس الزام کا بودا پن بخوبی واضح ہو جائے گا۔

"معترض کا یہ کہنا ہے کہ اقبالؒ اس دور ترقی میں جنگ کا حامی ہے غلط ہے۔ میں جنگ کا حامی نہیں ہوں۔ اور نہ کوئی مسلمان شریعت معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے۔ قرآن کی رو سے جہاد یا جنگ کی دو صورتیں ہیں، محافظانہ اور مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جب مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے۔ مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے (نہ حکم) دوسری صورت جس میں جہاد کا حکم ہے آیت ۹:۹۴ میں بیان ہوئی ہے۔ ان آیات کو غور سے پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیز جس کو سیموئل ہور جمعیت اقوام کے اجلاس میں COLLECTIVE SECURITY

کہتا ہے۔ قرآن نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ہے۔ اگر گزشتہ زمانہ کے مسلمان مدبرین اور سیاسیین قرآن میں تدبر کرتے تو اسلامی دنیا میں جمعیت اقوام بنے ہوئے آج صدیاں گزر گئیں ہوتیں۔ جمعیت اقوام جو زمانہ حال میں بنائی گئی ہے اس کی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ جب تک عوام کی خودی قانون الٰہی کی پابند نہ ہو۔ امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ دکتنی زبردست حقیقت ہے اس پابندی کے بغیر کوئی کیمبرج مشن کوئی تاشقند یا شملہ معاہدہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ راقم) جنگ کی مذکورہ بالا دو صورتوں کے سوائے، میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا۔ جوع الارض کی تسکین کے لئے جنگ کرنا دین اسلام میں حرام ہے۔ علیٰ ھذا القیاس۔ دین کی اشاعت کے لئے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے۔" (مورخہ ۱۷، دسمبر ۱۹۳۷ء)

قبل ازیں کہ میں اس نکتے کی مزید وضاحت اور اقبالؒ پر فاشزم کی تہمت اور اسلام پر اشاعت بالسیف کی تردید میں اقبالؒ کے پروفیسر نکلسن کے نام ایک طویل خط سے اقتباس پیش کروں۔ میں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ اقتباس بالا سے کبھی کج فہمی کا شکار ہو کر اقبالؒ کو مرزا قادیانی کی طرح منکرِ جہاد نہ سمجھ بیٹھے۔ اقبالؒ جہاد کرامتِ مسلمہ کے وجود و بقا کے لئے ضروری خیال کرتا ہے۔ لیکن اس جذبے کو مطلق العنان چھوڑنے کی بجائے ایسے شرعی حدود و قیود میں پابند رکھنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اقبال کے نزدیک یہ پابندی اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے تشخص کو برقرار رکھنے اور جوع الارض کی لعنت سے بچانے کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ پروفیسر نکلسن کو لکھتے ہیں:

"مجھے پوری طرح یقین ہے کہ کشور کشائی اور تسخیر ممالک اسلام کے مقاصد میں داخل نہیں بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات اور کشور کشائیوں نے ہی اس مبارک نظام جمہوریت کی نشو و نما اور ترقی کو روک دیا ہے۔ جس کی تخم پاشی قرآن اور حدیث کے صفحات میں کی گئی تھی۔ (خود حضرت عمرؓ فاروق ایسی بے محابا فتوحات سے اندیشہ مند ہو گئے تھے۔ جن میں بہہ کر تبلیغ دین اور عقائد اسلامیہ کی قلوب انسانی میں جاگزینی کے عمل میں سستی آگئی تھی۔ راقم) مسلمانوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کر لیں۔ لیکن اس کے لئے انہیں اپنے بعض نہایت قیمتی اصول قربان کرنے پڑے۔ اور ان کے سیاسی نصب العین پر غیر اسلامی رنگ غالب آگیا۔"

ایسے اعلیٰ اور تعمیر پسندانہ اور انسان دوستی کے حامل افکار و خیالات رکھنے والے شخص پر فاشزم کا الزام ایک تہمت، ایک دشنام اور بہتان نہیں تو کیا ہے۔

اقبال کا نظریۂ کائنات اور اس میں انسان کا مقام

پروفیسر نذیر حسین چوہدری۔ ایم۔اے فلسفہ

علامہ اقبال نے جب اس عالمِ رنگ و بو میں قدم رکھا تو سارے ایشیا پر بالعموم اور مسلمانانِ عالم پر بالخصوص حزن و یاس کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہر جگہ مسلمان بد دلی اور بیزاری کا شکار تھے۔ مشرقِ وسطیٰ میں تاتاری یورشوں اور ہندوستان پر انگریز کے قبضہ سے مسلمان قوم کے قوائے ذہنی و جسمانی مفلوج ہو چکے تھے۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ اپنی موجودہ حالت کو بدلنے کی بجائے اس پر قانع نظر آتے تھے۔ اور ان کو غلامی میں وہ لذت آنے لگی تھی۔ جو ایک روایتی عاشق کو محبوب کے جور و ستم سہنے میں آتی ہے جبر اور قناعت ایک انفعالی ذہنی کیفیت اختیار کر چکے تھے۔

مسلمان اسلاف کے کارنامے بھول کر اپنے اصل مرکز سے ہٹ چکے تھے۔ اور انہوں نے یونانی فلسفہ اور زرتشتی نظریات سے متاثر ہو کر خود زندگی کی تعبیر کچھ اس ڈھب سے شروع کر دی تھی جس سے منفی نتائج مرتب ہوتے تھے۔ تصوف کے خیالات جو شاعری کے ذریعے اسلامی ملکوں میں پھیلے ان میں زندگی سے گریز کی تعلیم تھی جو تنزل اور انحطاط کے زمانے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلام میں افلاطون کا اثر رسمی تصوف میں سب سے زیادہ نمایاں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے تصوف کے ان اصولوں سے اختلاف کیا جو زندگی کو حقائق سے گریز سکھاتے اور حرکت و عمل کی بجائے سکون و جمود کی طرف راغب کرتے ہیں۔

یونانی کلاسیکی تہذیب نفسِ انسانی کی جد و جہد اور نشو و نما کے تصور سے قطعاً عاری اور خودی یا ذات کے احساس سے ناآشنا تھی۔ افلاطون، ارسطو، رواقی مفکرین اور بعد ازاں نوافلاطونی نظامِ فکر رائج کرنے والے حکماء نے انسانی زندگی کے جو نظریے پیش کئے۔ ان سب سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کائنات محض فریبِ نظر ہے۔ اس میں جو باتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ سب غیر اہم اور دھوکا ہے۔

اقبال کے نزدیک اسلامی اصول یونانی کلاسیکی تہذیب کے خلاف زبردست ردِ عمل تھا۔ اسلام نے زندگی اور کائنات کے حقائق پر اپنی اخلاقی بصیرتوں کی بنا رکھی۔ جماعتوں کو زوال اور جمود سے بچانے اور ان کے ممکناتِ حیات کو اجاگر کرنے کے لیے اسلامی تہذیب نے معروضی حقائق ہی کو بطورِ مقاصد پیش کیا تاکہ ظاہر اور موجود میں انہماک کے ساتھ زندگی کا حرکی عنصر برقرار رہے اور نئے نئے خارجی حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی قوت و صلاحیت زائل نہ ہو۔ اقبال افلاطون کے "اعیانِ نامشہود" کی جگہ "ہنگامۂ موجود" ہی کو اصل حقیقت سمجھتے ہیں۔ اور اس کے نظامِ فکر کو "مسلکِ گوسفندی" سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس ضمن میں علامہ مختلف شواہد اور دلائل سے یہ بھی ثابت کرتے ہیں۔ کہ زندگی کے بارے میں یورپ کا موجودہ حرکی تصور

خود اسلامی تعلیمات کا رہین منت ہے۔ اسلامی تصوریت تسخیرِ فطرت اور حرکت و دوام کی تعلیم پیش کرتی ہے اسلامی تہذیب ان مقاصد کی حامل ہے۔ جو حقیقت اور عین کو ایک دوسرے میں سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں بار بار عقل اور مشاہدے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ مشاہدۂ عناصرِ فطرت اور مطالعۂ تاریخ امم کو علم کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔
کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں تاکہ دیکھتے کہ پہلے لوگوں کا انجام کیسا ہوا۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔
بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور دن اور رات کے بدلنے میں عقلمندوں کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

زندگی میں روحانی تجربات کو حصولِ علم کا محض ایک ذریعہ تسلیم کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ حقائق کائنات پر عقل اور مشاہدے کی روشنی میں غور و فکر کی بتکرار تلقین کی گئی ہے۔

فرمان خداوندی ہے کہ دن رات کی تبدیلی موسموں کے تغیر و تبدل اور قوموں کے عروج و زوال میں غور کرنے والوں کے لئے باری تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔

اس طرح اسلامی نقطۂ نظر کلاسیکی تہذیب کے برخلاف اس کائنات کو حقیقی اور بامقصد قرار دیتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "ہم نے اس کائنات کو یونہی بے مقصد نہیں بنایا بلکہ اس کو معرضِ وجود میں لانے کے کا ایک خاص مقصد ہے"۔ انسان کو اس کائنات کی تزئین و آرائش کے لئے اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے۔

اقبال کے نزدیک مفکرین اسلام کو اس حقیقت کا گہرا شعور تھا اور انہوں نے ہی دنیا میں سب سے پہلے کائنات کی توجیہہ حرکی نقطۂ نظر سے کی۔ اس ضمن میں مغربی مفکرین مسلمان فلسفیوں کے ہی خوشہ چیں ہیں۔ یہ نظریہ کہ مشاہداتی طریق کار خالصتاً یورپ کی پیداوار ہے۔ بالکل بے بنیاد اور قطعی طور پر باطل ہے۔ راجر بیکن جسے اس منہاج کا بانی سمجھا جاتا ہے، نے سپین میں مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی طرح اندلس کی جامعات کے ذریعے اسلامی علوم یورپ میں پھیلے۔ یونانی حکماء کے افکار و نظریات کسی طرح بھی مسلمان فلاسفر کے خیالات کی بنیاد نہیں بنتے۔ اشاعرہ نے یونانی نظریات کو بڑی شد و مد سے جھٹلایا۔ نظام نے فلسفۂ تشکیک کی بنیاد رکھی۔ امام غزالی نے اس کی ترویج اور اشاعت کی۔ جس نے بعد از اں ڈیکارٹ کے فلسفہ کی راہ ہموار کی۔

ابوبکر رازی دنیا میں سب سے پہلا شخص تھا جس نے ارسطو کے علم منطق کو ہدفِ تنقید ٹھہرایا۔ اور انہیں کے خیالات کو بعد میں جان سٹورٹ مل نے نئی شکل میں استوائی طریق کار کے طور پر پیش کیا۔ ابن حزم نے حسی تجربات کو علم کی بنیاد ثابت کرنے کی کوشش کی۔ البیرونی نے کائنات کی جامد اور سکونی تعبیر کو سائنٹیفک انداز میں غلط ثابت کیا۔ ابن مسکویہ نے اپنی کتاب "الفوزالاصغر" میں نظریۂ ارتقاء کے خدوخال متعین کئے۔ اور ثابت کیا کہ جمادات میں مرجان اور مونگا، نباتات میں کھجور کا درخت، حیوانات میں بندر اور گھوڑا، اور انسان سب ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ابن خلدون کا فلسفۂ تاریخ اسلامی تعلیمات ہی کا نتیجہ ہے۔

تاریخ میں دو نظریات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک تو یہ کہ دنیا میں آباد انسانوں کی ایک ہی بنیاد ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ۔ (پیدا کیا ہم نے انسان کو کھنکھناتی مٹی سے)

اور دوسرے یہ کہ تاریخ عالم ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے۔ اور انسانی تاریخ ارث و میراث کا ایک مستقل سلسلہ ہے۔ حکومت انہی کو ملتی ہے جو اپنے عمل و کردار سے اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کر دیتے ہیں۔

ان تمام افکار و نظریات کا منبع اور سرچشمہ اسلامی تعلیمات ہیں۔ تاریخ عالم کا کلاسیکی نظریہ انسان کو لزوم و جبر کی زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے یہاں تاریخ ایک معین چکر ہے۔ بدھ مت اور ہندو دھرم میں بھی دائمی اعادے اور چکر کا تصور ملتا ہے۔ جس کا نتیجہ تناسخ، کرم اور معاشرتی زندگی میں ذات پات کا نظام ہے۔ لیکن ان سب نظریہ سے انسان کی تشفی نہیں ہوتی۔ ان تمام نظریوں کا مایوسانہ لہجہ زندگی کو نامرادیوں کی گھاٹی میں تو پھر اسکتا ہے۔ لیکن ارتقاء اور سربلندی کی منزل کی طرف ایک قدم بھی آگے نہیں لے جاسکتا۔

اس کے برعکس اسلام نے سکون آفرینی کے نظریہ کی جگہ حرکت اور حرارت کے اصول کو زندگی کا رہبر بنایا استقرائی طریق فکر سے عوارض فطرت اور تاریخ انسانی کا صحیح علم ممکن ہوا۔ اور عالم محسوس کی تسخیر کا کام آگے بڑھا۔

اب اگر مسلمان اپنے آپ کو اسلاف کا سچا جانشین ثابت کر دیں اور اپنے علم و عمل کو زندگی کی ترقی کے لئے وقف کر دیں تو ان کی محرومی اور نامرادی دور ہو سکتی ہے۔ سوائے اس کے دنیا کی قوموں میں عزت و وقار حاصل کرنے کی اور کوئی تدبیر نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ بہت سے انقلاب دیکھ چکی ہے۔ اگر اب بھی وہ عمل صالح کی کسوٹی پر پورا اترنے کی کوشش کریں۔ تو اپنی عظمت کو حاصل کر سکتے ہیں۔

دراصل اس نکتہ کی زوردار طریقہ سے وضاحت کرنے سے اقبال کے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ انسان کو انفس و آفاق کو اپنے منشاء کے مطابق ڈھالنے کے لئے عالم فطرت اور عالم نفس دونوں کے قوانین کا رمز شناس ہونا چاہیئے۔

انسان کائنات کے بارے میں جو بھی نظریہ رکھتا ہو۔ وہ براہِ راست عملی زندگی میں اس کے افعال و اعمال کو متاثر کرتا ہے۔ جب زندگی کو مسلسل ایک حرکی عمل تسلیم کر لیا جائے تو پھر آگے ہی آگے بڑھنے کا جذبہ اور محرک جنم لیتا ہے۔ انسان پیہم جد و جہد سے اپنی شخصیت میں تسلسل اور وحدت قائم کر لیتا ہے۔

ہم زندگی میں کسی نقطے پر پہنچ کر یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے کہ بس اب یہاں ہمیں ہمیشہ کے لئے ٹھہر جانا چاہیئے۔ اور اس کے آگے اب کچھ کرنا باقی نہیں خیر یا نیکی کوئی سکونی شے نہیں ہے۔ بلکہ اخلاقی فہم و بصیرت کی عمل کے ذریعے متواتر توسیع ہے زندگی ایک قسم کی دائمی فعلیت ہے جس کا اظہار ارادے سے ہوتا ہے۔ اور جو نت نئے روپ بھرتی رہتی ہے۔ جس طرح مادہ نو کے سینے میں مادہ تمام بننے کی صلاحیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں اسی طرح انسانی فطرت کی مخفی قوتوں اور امکانوں کی انتہا نہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنے عمل سے انہیں بروئے کار لائے اور ان سے اپنی تقدیر سنوارے ؎

راز ہے راز ہے تقدیر جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

عمل پیہم سے انسان میں وہ تب و تاب پیدا ہوتی ہے جس سے اس پیکرِ خاکی کو وہ شرف نصیب ہوتا ہے جس تک فرشتوں کی رسائی ممکن نہیں وہ شوقِ بے حد سے جبریل بن جاتا ہے۔

ارتقائے حیات کا مقصد یہ ہے کہ زندگی مادے سے بلند ہو کر اخلاقی اور روحانی مقاصد کو فروغ دے۔ زندگی اور ذہن ایک ہی چیز ہیں۔ زندگی کوئی بنی بنائی مقرر چیز نہیں۔ اس میں نئی خواہشوں کے تحت ہر لمحہ تغیر ہونا لازم ہے۔ یہ دائمی طور پر کچھ ہونے کی حالت کا نام ہے۔

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرّہ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ!

قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

پس انسان کو چاہیئے کہ وہ عناصرِ فطرت پر غلبہ پائے۔ اور تسخیرِ حیات کرے۔ فطرت کی مزاحمت کی بنا پر ہی انسان کی مخفی قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ اور وہ اپنی تکمیل حیات کرتا ہے۔ انسان کی فضیلت اسی میں ہے کہ وہ آرزو کی خلش اور مقاصد کی لگن اپنے سینے میں ہمہ وقت بیدار رکھے۔ اور نت نئے مقاصد کا خواہش مند رہے۔ کیونکہ مقاصد کی بدولت زندگی کا مرکزِ ثقل مستقبل کی جانب جھک جاتا ہے۔ اور زندگی کا قافلہ ہر آن نئی منزل کی طرف رواں رہتا ہے۔ اقبال کے نزدیک خود خدا ایک سکونی اصلیت نہیں۔ بلکہ ایک حرکی سیلان ہے۔ اور اس کے تمام مظاہر اور مخلوقات اس لئے ہیں کہ وہ بھی اپنے طور پر تخلیق کریں۔ انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا ہے اور اسے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کا مژدہ جانفزا اور لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کی خوشخبری دی ہے۔ اس طرح انسان خدا کی تخلیق کا شاہکار ہے۔ اور کائنات میں اسے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جب سارے نظامِ کائنات کا دارو مدار اصولِ حرکت پر ہے۔ تو اس کائناتی نظام کا اہم ترین جزو ہونے کی حیثیت سے انسان پر یہ اصول پوری شدت سے لاگو ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی عظمت کا احساس و شعور اجاگر کرے۔ اقبال اسی لئے ایک عظیم مفکر ہے کہ اس نے انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلایا ہے اگر کلامِ اقبال کو صحیفۂ عظمتِ انسانی کہا جائے۔ تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ زمین و آسمان کی ہر چیز انسان کے تابع فرمان پیدا کی ہے۔

سَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔

(جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب تمہارے تابع فرمان ہے۔)

اور اس کے ساتھ ہی انسان کو خدا نے اپنی شبیہ پر پیدا کیا ہے اور اس میں اپنی رُوح پھونک کر اسے نیابتِ الٰہی کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ سوائے انسان کے کسی اور مخلوق میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کی مظہر بن سکے۔

پس انسان کو چاہیئے کہ وہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کے فرمانِ نبوی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے اندر اخلاقِ الٰہیہ پیدا کرے۔ اور اپنے آپ کو نیابتِ الٰہی کے مقام پر فائز کرے۔

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر

شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تند رَو کوہ و بیاباں سے!

گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اقبال کا پیغام

ظفر اقبال احمد
(شعبہ اردو)

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا

"پاکستان کو خود کفیل ہونا چاہیئے، کوئی قوم اس وقت تک زندہ رہنے کے قابل نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا عزم نہ کرے" یہ وہ الفاظ ہیں جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۰ء تک پچھلے تینتیس ۳۳ سال سے رہنمایانِ قوم مسلسل دہراتے چلے آرہے ہیں لیکن ع۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ نقالی ہماری رگ رگ میں اس قدر سرائیت کر چکی ہے کہ ہم نے اپنے دماغ سے کام لینا اور اپنے وسائل سے فائدہ اٹھانا بالکل ترک کر دیا ہے۔ ہندوستان کے قلم، چین کے مسطر یا پیمانے، جاپان کی کاریں اور اٹلی کے ریفریجریٹر ہمیں بہت پسند ہیں اور گھر کی مرغی دال برابر والی کیفیت ہم پر صادق آتی ہے۔ اسی لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی!
آئیں گے غسال کابل سے، کفن جاپان سے

ہم نے پورے ملک کو "باڑہ" اور "لنڈی کوتل" میں تبدیل کر دیا ہے۔ جہاں ملکی ساخت کی کوئی قدر نہیں صرف اغیار کی جیبیں بھرنے کا سامان کیا جاتا ہے۔ اور صرف معاشیات کی حد تک نہیں، بلکہ تہذیب و تمدن، اخلاق، قانون، سیاست، معاشرت ہر چیز میں ہم دوسروں کی طرف دیکھتے ہیں اور غیروں کی تقلید ہی میں ہم دین و سیاست کو الگ الگ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہماری خواتین خواہشاتِ نفسانی کی تسکین میں لباس کو حائل تصور کرتے ہوئے اسے منی سکرٹ سے بدلنے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ شالیمار، واپڈا اور الفلاح تعمیر کر کے ہم اپنے آپ کو جدیدیت کا علمبردار تصور کرتے ہیں حالانکہ ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود   کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اور وہ اقوام جن کی ہم تقلید کرتے ہیں ان کے بارے میں حکیم الامت کا نقطۂ نظر بڑا واضح ہے ؎

؎ نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

؎ وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم!
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

؎ اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو!
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم ان پختہ کار مقامروں کے جال میں اس بری طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ آج ایک تہائی صدی بیت گئی ہے ہمیں آزاد ہوئے، مگر ذہنی غلامی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ ہمارے تعلیمی نصابات، ہماری خارجہ پالیسیاں، ہماری بیوروکریسی کے انداز، ہمارا لباس، ہماری گفتگو سب کچھ درآمدی ہے۔

؎ یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو!
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں

مگر اے مردِ مسلماں! تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ

؎ فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اٹھا! یہ مقام انتہائے راہ نہیں

غیروں کا احسان مند ہو کر ہم نے اپنے آپ کو خوئے غلامی میں پختہ تر کر لیا ہے بلکہ ؎

از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است

ہماری اس غفلت کا نتیجہ ہے کہ تعلیمی نقطۂ نظر سے ابھی تک ہم کسی نصب العین کا تعین نہیں کر سکے۔ ہماری یونیورسٹیاں کوئی محمد علی جوہر، اقبال، قائداعظم، ٹیپو، ابن خلدون کی طرز کے افراد پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ بیروزگاری میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ افرادی قوت ضائع ہو رہی ہے۔ ذہین افراد اس ملک سے راہِ فرار اختیار کر رہے ہیں، حالانکہ بعض ممالک جو ہمارے ساتھ ہی آزاد ہوئے اور ان کے پاس کوئی نظریاتی قوت بھی موجود نہیں ہے مگر ٹیکنالوجی میں وہ ہم سے کئی برس آگے جا چکے ہیں اور سیاسی اور معاشی استحکام بھی ان کے ہاں ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ بات کہنے کا مقصد اپنے آپ کو کسی احساس کمتری میں مبتلا کرنا نہیں ہے، بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی بلند مقام حاصل کریں تو پھر اپنے قوتِ بازو پر اعتماد کرنا پڑے گا اور ـــــ الحذر از منتِ غیر ـــــ کی پالیسی اپنانا پڑے گی۔ اور اپنے نام نہاد محسنوں اور کرم فرماؤں کو دور باش کا پیغام دینا ہوگا۔ کیونکہ ہمیں کسی بھٹکے ہوئے خورشید کے پرتو کی ضرورت نہیں ہے۔

؎ زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

ع فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ رُوح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

مختصر یہ کہ ایوان فرنگ اور دیگر بے خدا تہذیبوں کی بُنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں۔ اور اگر ہم نے ان کی دیوار کے سامنے تلے بیٹھنے کی کوشش کی تو پھر ع

ہماری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہ تہذیبیں تو ایک دھوکا اور ایک فراڈ ہیں اور بقول شاعر مشرق

ع اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

ع کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

مغربی تہذیب میں وہ عقل و خرد مفقود ہے جو شرر سے شعلے پیدا کر سکے یہ صرف حلقۂ اربابِ جنوں ہی سے میسر آسکتی ہے اور ع

ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

یہ محض لاف زنی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ جب ہمارے اپنے خزانے معمور ہیں تو ہم کیوں دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کریں۔ قرآن زندگی کا ایک انقلابی لائحۂ عمل پیش کرتا ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے یہ دل میں پیدا ہونے والے جذبات میں راست روی پیدا کرتا ہے اور سوچ کا ایک زاویہ مقرر کرتا ہے۔ عمل کی دُنیا کو ایک جامع اور متوازن پروگرام دیتا ہے۔ جو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ یہ نظامِ حیات ایسا ہے جسے دیکھ کر بڑے بڑے "انقلابی" انگشت بدنداں ہیں۔ یہ ایک ایسی اکسیر ہے جو شیشے کو سختیٔ خارا عطا کرتی ہے۔ اسے بروئے کار لانے کیلئے صرف مضبوط ہاتھوں کی ضرورت ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی مردِ مومن کی ضرورت ہے۔

اگر مسلمان اپنے اندر اس ضابطۂ حیات کے مطابق تبدیلی پیدا کر لیں اور ہماری خودی میں انقلاب آجائے تو ہم آج بھی اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے "سپر پاورز" کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ ہمارے نعروں کی گونج پہاڑوں کو رعشۂ سیماب عطا کر سکتی ہے اور ہمارے کردار کا لوہا ہر لوہے کو کاٹ سکتا ہے ہم ارضِ پاک سے موتی رول سکتے ہیں۔ ہمارے کھیت سونا اگل سکتے ہیں۔ ہمارے نوجوان مستیٔ عمل سے ایک خدائی فوجدار کا کردار ادا کرتے ہوئے بحر و بر کو لرزہ براندام کر سکتے ہیں۔

ع تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں یہ چار سو بدل جائے!

پیامِ مشرق میں ایک باز اپنے بچے کو نصیحت کرتا ہے۔

ـــہ نگہ دار خود را و خورسند زی
دلیر و درشت و تنومند زی
تن نرم و نازک بہ تیہو گزار
رگِ سخت چوں شاخ آہو بیار
ز رُوئے زمین دانہ چیدن خطاست
کہ پہنائے گردوں خدا داد ماست

اقبال نے بالِ جبریل میں "نصیحت" کے عنوان سے اپنے جوانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ ـــہ
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام :: سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

اور اپنی کئی دیگر کتابوں میں محنت اور تگ و دو کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ مثلاً پیامِ مشرق میں "شاہین و ماہی" کے عنوان سے اپنی خیالات کا اعادہ کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ جگنو کو اقبال بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کی روشنی کسی سے مستعار نہیں لی گئی وہ بذاتِ خود روشن ہے اور اس روشنی کی مدد سے خود راستہ تلاش کرتا ہے اسی لئے بانگِ درا میں جگنو کو تکمۂ مہتاب اور سفیرِ شب کی تراکیب سے نوازا گیا ہے اور پیامِ مشرق میں اسے کرمکِ شب تاب کا نام دے کر اس کی خصوصی صفت کر ع درِ یوزہ گرِ آتشِ بیگانہ نہیں میں

پر روشنی ڈالی ہے اور پھر بالِ جبریل میں پروانہ اور جگنو کے مکالمے میں جگنو کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذاتی خوبیوں کو حکیم الامت بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اسرارِ خودی میں "خودی از سوال ضعیف می گردد" ایسے مستقل باب میں غیر کی محتاجی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اب اس وقت جب اقبال یہ باتیں کر رہے ہیں تو ان کے ہاں بڑی پختگی آ چکی تھی ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی ابتدائی شاعری میں فرہاد کو یہ مشورہ دیتے نظر آتے ہیں کہ تو اپنے دل میں حسن کا گنجِ گرانمایہ تلاش کر مجھے کسی شیریں کے حسن کی ضرورت نہیں ہے۔

المختصر اقبال کا پیغام یہ ہے کہ ہمیں دوسروں کے سہارے زندگی نہیں گزارنی چاہیئے، اگر ہم اپنے دست و بازو پر انحصار کریں تو اوجِ ثریا ہماری پہلی منزل ہوگی۔ یہ کام کچھ مشکل نہیں ہے، چین کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اس نے مختصر سے عرصے میں اتنی ترقی کر لی ہے کہ آج امریکہ بہادر اس کی دوستی پر نازاں ہے اور پچھلے دنوں روس کی گیدڑ بھبکیوں کے باوجود اس نے ویت نام کا بھرکس نکال کر رکھ دیا ہے۔ ہمارا نظامِ حیات تو سب سے بہتر ہے۔ آخر ہم کیوں نہیں سفالِ پاک سے مینا و جام پیدا کر سکتے۔ ہم بھی مہر و مہ و انجم کو محکوم کر سکتے ہیں۔ یہ نظام ہمیں شیرانِ غاب کی سی قوت اور دبدبہ عطا کر سکتا ہے۔

ـــہ بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد :: بہار آمد، نگار آمد، نگار آمد، قرار آمد
بہ مشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آور :: تصرف ہائے پنہانش بچشم آشکار آمد

اقبالؒ کا مردِ مومن

محمد عارف اظہر

حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں چند اصطلاحات استعمال فرمائی ہیں جن کو وہ معاشرے کے لئے ضروری گردانتے ہیں وہ اپنے معاشرے کے افراد کو یا تو بندۂ مومن اور مردِ حق کے رُوپ میں دیکھنا چاہتے ہیں یا مردِ کامل اور مردِ آفاقی کی صُورت میں دیکھنے کے متمنی ہیں علامہ اقبالؒ نے مدراس میں جو چھ خطبے ارشاد فرمائے ان میں انہوں نے فرمایا ہے کہ از رُوئے قرآن مجید تین باتیں انسان کے متعلق واضح ہیں۔

اوّلاً۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو اپنے تقرب اور تعلق کے لئے پیدا فرمایا ہے۔

ثانیاً۔ ان تمام لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود جو کہ انسان میں طبعی طور پر موجود ہیں تخلیق آدم کا مقصد یہ ہے کہ کُرۂ ارض پر حق تعالیٰ کی نیابت کو سرانجام دے۔

ثالثاً۔ خطرات کے باوجود انسان کو صاحبِ اختیار تخلیق کیا گیا ہے تاکہ اس کا عمل اپنے قدرت و اختیار کی بنا پر ہم آہنگ ہو نہ کہ مجبوری کی بنا پر محض اس کے تابع ہو جائے۔ اور یہ قدرت اور اختیار مجبور مخلوق میں ظاہر نہیں ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ کی نظر میں انسان کا مرتبہ و مقام کس قدر ہے انہوں نے بارہا اپنے ارشادات میں "احترامِ آدمی" کو آدمی کی صفت قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

؎ آدمیت احترام آدمی   باخبر شو از مقامِ آدمی

انسان کے لئے لازم قرار دیا ہے کہ وہ مقامِ آدمی سے آگاہ اور باخبر ہو کوئی شخص مقامِ آدمی سے اس وقت آگاہ ہو سکتا ہے جب کہ وہ اپنے مقام سے خبردار ہو۔ فلسفۂ خودی کی اساس خودشناسی اصل میں انسان شناسی ہے۔ اقبالؒ کے یہ افکار اپنے تفکر اور دقتِ نظر کا حاصل نہیں اور نہ دوسروں کے افکار سے ماخوذ ہیں بلکہ اسلامی اور قرآنی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ مفکرین اسلام میں سے بعض دوسرے بزرگوں نے بھی مقامِ انسانی کے اوج و رفعت سے متعلق اسی قسم کے افکار کا اظہار کیا ہے ایک مشہور مفکر عبدالکریم جیلی کہتے ہیں کہ انسان اپنے وجود میں ایک جہان ہے جو کہ خدا تعالیٰ کی ذات کا مظہر ہے انسان کی ہستی ذاتِ باری کا خارجی عکس ہے اور ذات مطلق انسانی وجود کے توسط سے اپنا مشاہدہ کرتی ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی ذات ایک آئینہ ہے کہ جس میں ذات باری کے جلوے منعکس ہوتے ہیں۔ صوفیائے کرامؒ نے مشاہدۂ حق اور عرفانِ ذات کو عرفانِ الٰہی کہا ہے ان کے خیال کے مطابق خدائے تعالیٰ اور کائناتِ عالم میں انسانی وجود کے بغیر رابطہ کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ انسان ان دونوں کے درمیان ایک متصل واسطہ ہے۔

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ فرماتے ہیں "جب تک شخص حقیقی معنیٰ میں" اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ"

(اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا)، کا ادراک نہیں کرتا روح کل اور اس کے اجزاء کے درمیان رابطہ کو نہیں سمجھ سکتا"۔ محی الدین ابن عربیؒ، مولانا رومؒ اور دیگر اکابر مفکرین اسلام عظمت بشری سے متعلق اسی قسم کے افکار کے حامل ہیں۔

لیکن یہ بلند مرتبہ ہر اس شخص کو جو اولاد آدم سے ہو جسے آدمی کا نام دیا جا سکے میسر نہیں آسکتا اس عظمت اور سربلندی کا استحقاق اسی شخص کو حاصل ہے جو متصل کوششوں، متواتر جدوجہد اور ان امور کی آزمائش سے جو کہ مقصود حیات ہیں اپنی خودی کو درجۂ کمال تک پہنچاتا ہے اور اس تکملہ کی برکات سے طبعی عناصر کی تسخیر کرتا ہے عام علمی اصطلاحات میں ایسی شخصیت "انسان کامل" اور علامہ اقبالؒ اور دیگر اسلامی مفکرین کی زبان میں اس کو "مردِ مومن" کہا گیا ہے اس مردِ مومن کی زندگانی جو کہ آئینِ الٰہی کے مطابق ہوگی قدرت کی زندگانی کی سہیم ہوگی اور اسی وجہ سے وہ قدرت کا مقصود قرار پاتا ہے اور وہ ارفع مرتبہ حاصل کر لیتا ہے جو کہ معراج انسانیت ہے۔ مگر یہ فراموش نہیں کرنا چاہئیے کہ اس کا مقام مقامِ انسانیت ہے اس سے ماورا کوئی چیز نہیں۔ مفکرین اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس کے باوجود کہ انسان نیابت الٰہی کی استعداد رکھتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے سرمدی معاملات میں شرکت نہیں کر سکتا۔

حلول اور ثنویت کا عقیدہ جو کہ فلسفۂ ویدانت کا پیدا کردہ ہے بعض صوفیاءؒ نے اس سے اثر قبول کیا ہے یہ غیر اسلامی عقیدہ ہے۔ ابنِ آدم جب آدمیت کے درجۂ معراج پر پہنچتا ہے تشکل کی حدود سے باہر آکر جوہر کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے اس کی آنکھ اور کلام خدا کی آنکھ اور خدا کا کلام ہو جاتے ہیں اور بخاری شریف کی اس حدیثِ مبارکہ کا مصداق ٹھہرتا ہے" كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَيُبْصِرُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا "۔ "یعنی میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے"۔

اگر انسان اپنی بندگی کے رابطہ کو خدا تعالیٰ کے ساتھ اس قدر استوار کرے کہ تمام افعال و اعمال میں مشاہدۂ ذات اور حضورِ ذات کی کیفیات پیدا ہو جائیں اور اس کا وجود باری تعالیٰ کے علمی وجود سے معمور ہو جائے اور اس طرح اس کا وجود ہر طرف سے وجودِ الٰہی بن جاتا ہے اس کیفیت کو مولانا رومؒ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں: ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ... گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

علامہ اقبالؒ "بالِ جبریل" میں "مردِ مومن" کی شان میں نذرانہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

؎ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کار کشا، کارساز

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

انسان کامل کا بہترین نمونہ خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی عالی مرتبت ذات ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معنوی شخصیت انسانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے انسان اس کی روشنی میں زندگی کے عالی مراتب پہ متمکن ہوتا ہے خداوند تعالیٰ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق فرمودات کا قرآن کریم میں مشاہدہ کیا جا سکتا

ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے: " مَا رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی " یعنی آپ نے (تیر) نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔
حضرت علامہ اقبالؒ انہی معانی کو منصور حلاجؒ کی زبان میں اس طریق سے بیان فرماتے ہیں :

کس ز سرِ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہٗ جز سرِ الا اللہ نیست

لا الٰہ تیغ و دمِ او عبدہٗ
فاش تر خواہی بگو ھو عبدہٗ

مدعا پیدا نگردد زیں دو بیت
تا نہ بینی از مقامِ " مَا رَمَیْتَ "

مردِ کامل یا مردِ مومن کی عظمت "بیعت رضوان" کی آیات ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں: اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ " یعنی بیشک وہ لوگ جو آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کر رہے ہیں درحقیقت وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصالِ مبارک کے بعد ان کی سیرتِ طیبہ بنی نوعِ انسان کے لئے مشعلِ ہدایت ہے جس کی روشنی میں راہِ زندگی کو طے کر کے انسان درجاتِ رفیع تک پہنچ جاتا ہے اور وہی شخص علامہ اقبالؒ کی نگاہ میں "مردِ مومن" ہے۔ درج ذیل اشعار میں جو انہوں نے "مردِ مومن" کی شان میں کہے ہیں اقبالؒ اس کے خصائص کو کمال خوبی کے ساتھ واضح کرتے ہیں۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

درج بالا اشعار میں "مردِ مومن" کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں وہ تمام خدا تعالیٰ کے اوصاف میں سے ہیں ہر لمحہ خدا تعالیٰ کی عظمت و شان نئی ہوتی ہے اور ارشادِ باری ہے "کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ " وہ قہار بھی ہیں غفار بھی اور اس کی ذاتِ قدوس و جبروت کی حامل ہے۔ سورۃ الحشر میں ہے " اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ " اللہ تعالیٰ کے جمال کے اوصاف اس قدر لطیف ہیں کہ لالہ کی نرم و نازک پتیوں کو

خنک کرتے ہیں اور اس کے جلال کی قوت اس قدر پُرہیبت ہے کہ اس کے خوف سے کوہسار ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں ہر چند کہ انسان میں یہ اوصاف موجود ہوتے ہیں وہ درجۂ الوہیت تک نہیں پہنچ سکتا لیکن بلا تردید ذاتِ خداوندی کا مظہر کامل بن جاتا ہے اور اس کے اور ذاتِ خداوندی کے درمیان تفاوت اس قدر ہوتا ہے جو کہ محدود اور لامحدود کے درمیان ہے یا ان اوصاف میں خدا اور بندے میں فرق ہوتا ہے۔ جو انسانی امکان میں نہیں ہیں یا وہ اوصاف جو ذاتِ خداوندی کے لئے مختص ہیں کیونکہ انسان میں اتنی ہمت نہیں کہ خدا تعالیٰ کے لامحدود اوصاف کو حاصل کرے اور دوسرے یہ کہ وجودِ باری تعالیٰ قائم بالذات و قدیم اور غیر حادث ہے اور وہ اوصاف جو کہ اس کی ذاتِ پاک میں ہیں وہ بھی قدیم و غیر حادث ہیں اور وہی اوصاف جب وجودِ انسانی میں جاگزیں ہوتے ہیں تو حادث، زوال پذیر اور محدود بھی ہوجاتے ہیں ان اوصاف کا وجود انسان کے وجود کے ساتھ رہتا ہے ہر چند کہ اس کے افادات و اثرات اس کے انتقال کے بعد بھی طویل عرصہ تک رہتے ہیں۔

"مردِ مومن" اس دنیا میں نیابت الٰہی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اس وجہ سے اس کے کردار کی اساس ایمان و ایقان پر رکھی ہوئی ہے۔ یہ ایمان و ایقان اس کو سخت اور دشوار حالات میں قوت اور توانائی بخشتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے دل کو سخت اور دشوار حالات سے نپٹنے کی قوت و توانائی عطا فرماتے ہیں اور اس کو یقینِ کامل عطا فرماتے ہیں کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ اس کا نگہبان ہوگا۔ جب تائیدِ ایزدی سے اس کا ایمان قوی ہوجاتا ہے تو کسی صورت بھی وہ غیر اللہ سے کمک کا خواستگار نہیں ہوسکتا کیونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "وہ آدمی جو خدا تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہے خدا تعالیٰ اس کے لئے غیر متوقع اسباب فراہم فرماتا ہے اور جو کوئی دُنیا کی پناہ میں جاتا ہے اس کو دُنیا کے ہاتھ میں چھوڑ دیتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے سیرت و کردار میں ایمان و ایقان سے متعلق عمدہ مثالیں نظر آتی ہیں اور ہر مومن انہی نظائر سے اپنے کردار کی بنا استوار کرتا ہے دُنیا کے امور میں وہ ہمیشہ زندگی کی اعلیٰ اقدار کو پیشِ نظر رکھتا ہے اور انہی اقدارِ عالیہ سے درجۂ کامرانی تک پہنچ جاتا ہے۔ اقبالؒ مادی قوی کو انسانی اعمال کا مقصود و منتہیٰ تصور نہیں کرتے اس کے برعکس وہ انسان کے روحانی و اخلاقی قویٰ کی تعریف کرتے ہیں۔ "مردِ مومن" ان کی نگاہ میں وہ ذات ہے جس میں جمالی و جلالی صفات موزوں تناسب سے موجود ہوں اور وہ زندگی کے سوز و ساز کا رمز آشنا ہو اس کا جسم محکم اور اس کے اندر دردِ آشنا دل موجود ہو گویا سنگین کوہسار کے پہلو میں نرم رو جوئے آب رواں ہو جس کے اندر سخت کوشی اور نرم خوئی کا خوشگوار آمیزہ ہو۔ جب پہاڑوں کے پتھر کے ٹکڑے اس کے سامنے آتے ہیں اس سے سر ٹکراتے ہیں تو مجبوراً وہ اسے کنارے پر پھینک دیتی ہے اور جب یہی جوئے آب گلزار و چمن میں پہنچتی ہے تو خراماں خراماں اور نغمہ خواں ہو کر گزر جاتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

مصافِ زندگی میں صورتِ فولاد پیدا کر

شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا

گزر جا بن کے سیلِ تند رَو کوہ بیابان سے
گلستان راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

مردِ کامل پیہم سعی و مجاہدہ اور خود داریٔ نفس سے زندگی کے راستہ کے مراحل کو طے کر کے بالآخر نیابتِ الٰہی کے مقام پر فائز ہوتا ہے اور اس نیابت کے فرائض کو قبول کر کے طبعی عناصر پر حکمران ہو جاتا ہے۔

ے
نائبِ حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمران بودن خوش است

نائبِ حق ہم چو جانِ عالم است
ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است!!

لیکن اس امر سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیئے کہ نیابتِ حق کے حصول کے لئے خود داریٔ نفس کے جو مراحل طے کرنے چاہئیں بہت مشکل ہیں۔ ان مراحل کے طے کرنے میں صرف سعی و عمل کافی نہیں بلکہ چاہیئے کہ ہر حال میں حق تعالیٰ کی اطاعت و رضا کو اپنا شعار بنائے اور صبر و تحمل، عزتِ نفس اور مسلسل ثابت قدمی سے ان مراحل پر قوت حاصل کرے۔ اس طریق سے وہ عناصرِ طبیعی پر قادر ہو جائے گا۔

وہ خصوصیاتِ اعلیٰ جو "مردِ مومن" میں پائی جاتی ہیں کہ وہ اپنے عمل کے اعجاز سے زندگی کی تجدید کرتا ہے۔ اس بلند فکر زندگی کو نئی تفسیر مہیا کرتی ہے اور مصطلحات کو نئے معانی بخشتی ہے۔ اور معلوم حقائق کو تازہ توجیہہ عطا کرتی ہے۔ وہ تاریخ کے سیلِ رواں کو ہر طریق سے جس طرح اس کا دل چاہتا ہے متغیر کرتی ہے وہ موجوداتِ عالم کی روحِ رواں ہے اور عمل اور شوکت کی قوت سے زندگی کے جمال و جلال کو اس قدر فزونی عطا کرتی ہے کہ راز کے جلوے عشریاں و تاباں ہو جاتے ہیں اور آدمی خود "سوارِ اشہبِ دوراں" اور فروغِ دیدۂ امکان ہو جاتا ہے۔

"قومی انسان ماحول تخلیق کرتا ہے، کمزوروں کو ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا پڑتا ہے"

شجرۂ نسب خاندانِ اقبالؒ

- بابا لول حاج (چودھویں صدی میں مشرف بہ اسلام ہوئے)
- نا معلوم پشتوں کے بعد
- شیخ اکبر
- دو یا تین پشتوں کے بعد
- جمال الدین
  - عبدالرحمن
    - محمد حیات
      - اللہ دتہ (لاولد)
      - تین لڑکیاں
    - احمد
      - سراج الدین (ص)
      - تاج الدین (ص)
      - حاکم بی (ص)
      - حسن بی (ص)
      - زینب (ص)
  - محمد رمضان
    - فاطمہ بی
    - بیگم (ص)
      - امام دین (ص)
      - حیات (ص)
  - محمد رفیق
    - نور محمد
      - عطا محمد
        - اکبری بیگم
          - عبدالحق (ص)
        - اعجاز احمد
          - عبدالرشید (ص)
          - عبدالمجید (ص)
          - سلیم (ص)
          - منظور (ص)
          - زہرہ (ص)
          - زبیدہ (ص)
          - حمیدہ (ص)
          - امیدہ (ص)
        - امتیاز احمد
          - افتخار احمد (ص)
        - مختار احمد
          - تحسین احمد (ص)
          - ناصر (ص)
          - بتول (فوت شدہ)
          - خلیل احمد (فوت شدہ)
          - ناصرہ (ص)
          - آسیہ (ص)
          - نعیم احمد (ص)
          - نعمان احمد (ص)
          - ابرار احمد (ص)
          - شگفتہ (ص)
          - ستارہ (ص)
          - قدسیہ (ص)
        - عنایت بیگم
          - فاروق (ص)
          - محمود (ص)
          - عذرا (ص)
          - ناہید (ص)
        - وسیمہ بیگم
          - خالد (ص)
          - طارق (ص)
          - بلقیس (ص)
      - فاطمہ بی
        - فضل الٰہی
        - فضل حق (ص)
      - طالع بی
        - نور احمد (ص)
        - خورشید احمد (ص)
        - محمود احمد (ص)
        - منظور احمد (ص)
      - محمد اقبالؒ
        - آفتاب اقبال
          - آزاد اقبال
          - مقتدر اقبال
          - نوید اقبال
        - معراج بیگم (فوت شدہ)
        - جاوید اقبال
          - منیب اقبال
          - ولید اقبال
        - منیرہ بیگم
          - اسد
          - یوسف (ص)
          - اقبال
      - کریم بی
        - محمد شفیق (ص)
        - محمد سعید (ص)
        - محمد جعفر (لاولد)
      - زینب بی (لاولد)
    - غلام محمد
      - جیتاب بی
        - محمد حیات
        - برکت
      - گلاب بی
        - مہراں
          - فاطمہ (ص)
          - حنیفہ (ص)
          - اصغری (ص)
          - انعام اللہ (ص)
  - عبداللہ
    - فتح محمد
      - محمد دین
        - عزیز دین
          - بشیر احمد
        - اسمٰعیل
          - احمد حسین
          - اکرام حسین
        - ابراہیم
          - فرہاد حسین
          - اعجاز حسین
      - تاج دین
        - غلام حیدر (ص)
        - غلام حسین (ص)
      - چراغ دین
        - الطاف حسین (ص)
        - واجد حسین (ص)
        - نیاز حسین (ص)

(ص) اولاد کی تفصیل درج نہیں کی گئی۔

ایامِ اقبالؒ

توفیق احمد
سال اوّل

اقبالؒ ہمارے عہد کی ایک بھرپور شخصیت اور ہماری تہذیب کا ایک روشن استعارہ ہیں۔ ان کی حیات متنوع اور بوقلموں واقعات سے عبارت ہے۔ ذیل کی سطور میں ایک ایسا خاکہ ترتیب دیا گیا ہے جس سے حیات اقبال کی ایک مختصر مگر جامع تصویر ابھرتی ہے۔

۹ نومبر ۱۸۷۷ء :- فقیر سید وحید الدین نے "روزگار فقیر" جلد اوّل میں بڑی تحقیق کے بعد (۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ) ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو علامہ کی تاریخ ولادت کا ذکر کیا ہے۔

۱۸۸۱ء
۱۳ مارچ :- علامہ اقبالؒ کو سیالکوٹ کے محلہ شوالہ کی مسجد میں مولانا ابو عبداللہ غلام حسین کے ہاں قرآن مجید پڑھنے کے لئے داخل کیا گیا۔ جہاں آپ تقریباً ایک سال پڑھتے رہے۔

۱۸۸۷ء
٭ : علامہ نے سیالکوٹ میں پرائمری جماعت کا امتحان پاس کیا۔

۱۸۹۱ء : علامہ اقبالؒ نے مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے اینگلو ورنیکلر مڈل سکول کا امتحان پاس کیا۔ یہ امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا گیا۔ جس کے سرٹیفکیٹ پر آپ کی عمر پندرہ سال درج ہے۔ (زندہ رود)

۱۸۹۲ء :- شعر گوئی کا آغاز اور حضرت داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔

۱۸۹۳ء : اقبالؒ نے انٹرنس (میٹرک) کا امتحان گجرات میں دیا۔ درجہ اوّل میں کامیاب ہوئے۔ سکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ کی جانب سے تمغہ طلا اور وظیفہ حاصل کیا۔

۴ مئی :- علامہ اقبالؒ کی شادی خانہ آبادی گجرات کے سول سرجن خان بہادر الحاج الحافظ ڈاکٹر شیخ عطا محمد خان کی دختر نیک اختر کریم بی بی (والدہ آفتاب اقبالؒ) سے ہوئی۔ (بحوالہ نکاح نامہ ملکیتی کرنل خواجہ عبد الرشید)

۷ مئی :- علامہ نے سکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں گیارہویں جماعت میں داخلہ لیا۔ "روزگار فقیر" (فقیر سید وحید الدین) جلد دوم میں داخلہ کی یہ تاریخ ۷ مئی درج کی گئی ہے۔

۱۸۹۵ء : سکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا۔

ستمبر : گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔اے میں داخل ہوئے اور کواڈرینگل ہوسٹل کے کمرہ ا میں رہائش اختیار کی۔ ان دنوں اسے اقبالؒ ہوسٹل کا نام دیا گیا ہے۔

۱۸۹۶ء : علامہ اقبالؒ کی پہلی بیوی کریم بی بی سے پہلی بچی پیدا ہوئی، جس کا نام معراج بیگم رکھا گیا۔

۱۸۹۷ء مارچ : گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ امیدواروں میں آپ کی گیارہویں پوزیشن تھی، لیکن عربی میں اوّل آنے کی وجہ سے پنجاب یونیورسٹی نے "خان بہادر ایف، ایس جلال الدین میڈل" عطا کیا۔ انگریزی اور عربی کے امیدواروں میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کی بنا پر "خلیفہ محمد حسین ایچی سن میڈل" حاصل کیا۔

——— بیک وقت ایم۔اے فلسفہ اور لاہور لا سکول کی پہلی کلاس میں داخلہ لیا۔

۱۸۹۸ء دسمبر : لاہور لا سکول کے P.E.L کے امتحان میں "اصولِ قانون" کے پرچہ میں فیل ہو گئے۔

——— : فلسفہ میں ایم اے کا امتحان دیا اور تیسرے درجہ میں کامیابی حاصل کی۔ لیکن یونیورسٹی میں واحد کامیاب ہونے والے طالب علم کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی نے آپ کو "خان بہادر شیخ نانک بخش میڈل" عطا کیا۔ اسطرح آپ نے اوّل پوزیشن حاصل کی۔

——— : علامہ اقبالؒ کی پہلی بیوی سے ان کے فرزند آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔

۱۹۰۱ء یکم جنوری : اسلامیہ کالج لاہور میں چھ ماہ کے لئے انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔

۱۹۰۳ء : علامہ کی اوّلین تصنیف پہلی مرتبہ "علم الاقتصاد" کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ معاشیات کے موضوع پر اردو کی پہلی کتاب تھی۔

۱۹۰۵ء یکم ستمبر : لاہور سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے انگلستان روانہ ہو گئے۔

۶ر نومبر : علامہ نے بیرسٹری کے لئے لنکنز اِن میں داخلہ لیا۔

۱۹۰۷ء ۷ر مارچ : علامہ نے کیمبرج یونیورسٹی میں فلسفہ کی ڈگری کے لئے اخلاقیات کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا۔ جو یونیورسٹی کی خاص اجازت سے اس تاریخ کو پیش کیا گیا۔

یکم اپریل : اقبالؒ اور عطیہ فیضی کی پہلی ملاقات، مس عطیہ فیضی کو مس بیک نے اقبالؒ سے ملاقات کا دعوت نامہ بھیجا۔

۱۳ جون : کیمرج یونیورسٹی میں فلسفہ کی تعلیم سے فارغ ہوئے اور اسی روز انہیں بی۔ اے کی ڈگری ملی۔

۴ نومبر : علامہ نے ہائیڈل برگ اور میونخ میں رہ کر The Development of Metaphysics in Persia کے موضوع پر اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ مکمل کیا جس پر میونخ یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹریٹ عطا کی۔

۱۹۰۸ء یکم جولائی : مڈل ٹمپل لنکنز اِن سے علامہ نے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔

۲۷ جولائی : علامہ اقبالؒ انگلستان سے پیر کے روز دوپہر کے وقت لاہور کے اسٹیشن پر اترے اور کشمیری احباب نے آپ کا استقبال کیا۔ باغ بیرون بھاٹی دروازہ میں شیخ گلاب دین نے اقبالؒ کے اعزاز میں ضیافت دی۔ ایک روایت کے مطابق اسی روز شام کی گاڑی سے سیالکوٹ چلے گئے۔

۲۲ اکتوبر : چیف کورٹ میں وکالت کی درخواست منظور ہوئی۔

۱۹۰۹ء یکم مئی : گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے قائم مقام پروفیسر مقرر ہوئے۔ ہائیکورٹ کی اجازت سے صبح چھ بجے سے نو بجے تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے لیکچر دینے کے بعد ہائیکورٹ میں تشریف لاتے۔ یہ سلسلہ دسمبر ۱۹۱۰ء تک جاری رہا۔

(بحوالہ، اقبالیات، علامہ اقبالؒ اوپن یونیورسٹی)

۱۹۱۰ء : موسم سرما میں علی گڑھ کے ایم۔ اے۔ او کالج کے سٹریچی ہال میں علامہ نے ایک انگریزی مقالہ پڑھا۔ جس کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے نام سے کیا۔

۱۹۱۱ء : آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی میں علامہ کو "ترجمانِ حقیقت" کا خطاب دیا گیا۔ اس موقعہ پر علامہ شبلیؒ نے علامہ کو ہار پہنایا۔

۱۹۱۴ء : علامہ کی دوسری شادی سردار بیگم (والدہ جاوید اقبال) سے ہوئی۔

۹ نومبر : حضرت علامہ کی والدہ امام بی بی چھ سات ماہ کی علالت کے بعد سیالکوٹ میں انتقال کر گئیں۔

دسمبر : علامہ اقبالؒ کی تیسری شادی لدھیانہ میں مختار بیگم سے ہوئی۔

۱۹۱۵ء ۱۷ اکتوبر : علامہ کی پہلی بیوی کریم بی بی سے آپ کی بیٹی معراج بیگم انتقال کر گئیں۔

ستمبر : مثنوی "اسرارِ خودی" پہلی دفعہ چھپ کر شائع ہوئی۔

(بحوالہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی)

۱۹۱۷ء ۱۳ نومبر : سید سلیمان ندویؒ کے نام ایک مکتوب میں لکھا کہ "اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے۔ جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے"

———	حیدرآباد ہائی کورٹ کی ایک جج کی سیٹ خالی ہوئی تو بعض احباب نے اس کے لئے اقبال کا نام تجویز کیا۔
۱۹۱۸ء اپریل	"رموزِ بے خودی" کے نام سے مثنوی "اسرارِ خودی" کا دوسرا حصہ شائع ہوا۔
۱۹۲۰ء ———	اسرارِ خودی کا انگریزی کا ترجمہ ڈاکٹر نکلسن نے میکملن لندن سے شائع ہوا جس کا نام "[illegible]" ہے۔
۱۹۲۲ء	نواب ذوالفقار علی نے علامہ اقبالؒ پر سب سے پہلی کتاب [illegible] کے نام سے شائع ہوئی۔
۱۹۲۳ء یکم جنوری	سرکار برطانیہ کی طرف سے علامہ کی خدمات کے اعتراف میں "نائیٹ ہیڈ" (سر) کا خطاب دیا گیا۔
۱۹۲۴ء ستمبر	علامہ کی اردو شاعری کا پہلا مجموعہ پہلی مرتبہ "بانگِ درا" کے نام سے لاہور سے شائع ہوا۔
۵/ اکتوبر	علامہ کی دوسری بیوی سردار بیگم کے بطن سے جاوید اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔
۲۱/ اکتوبر	علامہ کی تیسری بیوی مختار بیگم لدھیانے میں زچگی کے عالم میں انتقال کر گئیں۔
۱۹۲۵ء اکتوبر	مسجد وزیر خان کے خطیب مولانا ابو محمد سید دیدار علی شاہ نے حضرت علامہ پر کفر کا فتویٰ لگایا۔
۱۹۲۶ء ۲۳/ نومبر	علامہ اقبالؒ بھاری اکثریت سے مجلس قانون ساز پنجاب کے رکن منتخب ہوئے۔ آپ کو پانچ ہزار چھ سو پچھتر ووٹ جب کہ مدمقابل کو دو ہزار چار سو اٹھانوے ووٹ ملے۔ علامہ ۱۹۳۰ء تک اس کونسل کے ممبر رہے۔
———	علامہ پر اردو زبان میں سب سے پہلی کتاب "اقبالؒ" مصنفہ مولوی احمد دین وکیل شائع ہوئی۔
۱۹۲۷ء جون	لاہور سے "زبورِ عجم" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔
۱۹۲۸ء دسمبر	دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شرکت کی۔ جس کے بعد مدراس مسلم ایسوسی ایشن کے بانی سیٹھ محمد جمال کی دعوت پر براستہ بمبئی مدراس پہنچے۔ آپ کے ساتھ چوہدری محمد حسین اور عبداللہ چغتائی تھے۔
۱۹۲۹ء مئی	پنجاب ہائیکورٹ میں ایک جج کی جگہ خالی ہوئی۔ تو بعض احباب نے علامہ کے تقرر کے لئے تحریک کی، مگر چیف جسٹس سر شادی لال کی مخالفت کی وجہ سے یہ تقرر نہ ہو سکا۔
۱۹۳۰ء ———	علامہ اقبالؒ کی دوسری بیوی سردار بی بی کے بطن سے ایک لڑکی منیرہ پیدا ہوئی۔

۱۷ اگست : علامہ کے والد محترم صوفی نور محمد انتقال کر گئے۔

——— : علامہ کے چھ انگریزی خطبات Six Lectures on the Reconstruction of Religious Thought in Islam کپور آرٹ پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوئے۔

۱۹۳۱ء ۸ ستمبر : دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لاہور سے فرنٹیئر میل پر سوار ہوئے لندن روانہ ہونے سے قبل مدیر "انقلاب" کی وساطت سے ایک پیغام بھی دیا۔

۲۸ ستمبر : دوسری گول میز کانفرنس کی اقلیتوں کی سب کمیٹی کا پہلا اجلاس سینٹ جیمز پیلس میں منعقد ہوا جس میں علامہ نے شرکت کی اور ڈاکٹر انصاری کے مسئلہ پر گاندھی جی سے اختلاف کیا۔

۲۶ نومبر : حضرت علامہ نے اٹلی کی رائل اکیڈمی میں لیکچر دیا۔

۲۷ نومبر : مسولینی نے اقبالؒ کو مدعو کیا۔ ڈاکٹر سکارپا بھی ہمراہ تھے۔ علامہ کی تصانیف بالخصوص "اسرار خودی" پر گفتگو ہوئی۔ علامہ نے مشورہ دیا کہ "یورپ سے منہ موڑ کر مشرق کا رخ کرو۔ یورپ کا اخلاق افسوس ہے ٹھیک نہیں، لیکن مشرق کی ہوا تازہ ہے۔ اس میں سانس لو۔"

۷ دسمبر : موتمر عالم اسلامی کے انتخابات ہوئے۔ چار نائب صدور میں سے ایک علامہ اقبالؒ منتخب ہوئے

۱۹۳۲ء فروری : فارسی مجموعہ کلام "جاوید نامہ" کی اولین اشاعت۔

۹ مارچ : اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور کے زیر اہتمام وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں پہلا "یوم اقبالؒ" منایا گیا۔

ستمبر، اکتوبر : حکیم یوسف حسن کی ادارت میں "نیرنگ خیال" نے بانگ درا کی تقطیع پر ایک ضخیم "اقبال نمبر" شائع کیا۔

۱۷ اکتوبر : علامہ تیسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے ایک ماہ قبل لاہور سے روانہ ہوتے۔ آپ کے ہمراہ سید امجد علی تھے۔

۱۹۳۳ء جنوری : پیرس کے مشہور فلسفی عالم "برگساں" سے ملاقات۔

جنوری : پہلے ہفتہ میں ہسپانیہ پہنچے اور یہاں مسجد قرطبہ کی زیارت کی۔ شیخ محمد اکرم کے نام ایک مکتوب میں لکھا کہ "مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔"

۲۰ اکتوبر : نادر شاہ کی دعوت پر علامہ اقبالؒ، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود افغانستان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ بیرسٹر غلام رسول، علامہ کے سیکرٹری اور علی بخش ملازم کی حیثیت سے شریک سفر تھے۔

۴ر دسمبر	: پنجاب یونیورسٹی نے علامہ کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ اقبالؒ پہلے ہندوستانی تھے جنہیں یہ اعزاز میسر آیا۔
۱۹۳۴ء ۱۱ر جون	: گلے کی تکلیف کا علاج کروانے کے لئے دہلی تشریف لے گئے۔
۱۹۳۵ء جنوری	: تاج کمپنی لمیٹڈ سے "بالِ جبریل" کی اشاعت۔
۲۳ر مئی	: علامہ کی دوسری بیگم سردار بی بی "جاوید منزل" میں شام چھ بجے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔
———	علامہ اپنے ذاتی تعمیر کردہ مکان "جاوید منزل" میورروڈ (حال علامہ اقبال روڈ) میں منتقل ہو گئے۔ اس مکان کی تعمیر ۱۹۳۴ء میں شروع ہوئی۔ اور یہ جاوید کے نام تھا۔ علامہ ہر ماہ کا کرایہ ادا کرتے تھے۔
۱۹۳۶ء ۲۹ر فروری	: برقی علاج کے تیسرے کورس کے لئے لاہور سے بھوپال روانگی۔
۲۹ر اپریل	: قائدِ اعظمؒ نے لاہور میں علامہ سے ملاقات کی۔ علامہ کو پنجاب مسلم لیگ کا صدر مقرر کیا گیا۔
جولائی	: علامہ اقبال کا اردو مجموعہ کلام لاہور سے "ضربِ کلیم" کے نام سے شائع ہوا۔
ستمبر	: پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کے نام سے ایک فارسی مجموعہ کلام شائع ہوا۔ کتاب خانہ طلوع اسلام نے اسے شائع کیا۔
۱۹۳۷ء ۱۵ر جنوری	: سر راس مسعود کے نام ایک مکتوب میں لکھا: "امسال دربار حضورؐ میں حاضری کا مقصد تھا۔ مگر بعض موانع پیش آ گئے۔ انشاء اللہ سالِ آئندہ حج بھی کروں گا۔ اور دربارِ رسالت میں حاضری دوں گا۔"
۲۱ر جون	: قائدِ اعظمؒ کے نام ایک مکتوب میں لکھا: "اس وقت مسلمانوں کو اس طوفانِ بلا میں جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید ملک کے گوشہ گوشہ سے اٹھنے والا ہے صرف آپ ہی کی ذاتِ گرامی سے رہنمائی کی توقع ہے۔"
یکم جولائی	: علامہ نے اپنی علالت کی بنا پر انجمن کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔
۲۰ر جولائی	: چوہدری نیاز علی کے نام ایک مکتوب میں لکھا "اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آ رہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے۔ ان لوگوں کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔"
اگست	: اس مہینے کے آخر میں سید ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ اقبالؒ میں ملاقات ہوئی۔ جس میں ایک اسلامی مرکز کے قیام پر گفتگو ہوئی۔

۱۹۳۸ء یکم جنوری	سالِ نو پر یہ ریڈیائی پیغام دیا: "آج زمان و مکان کی تمام پنہائیاں سمٹ رہی ہیں...... لیکن تمام ترقی کے باوجود اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ ہمیں نئے سال کی ابتدا اس دعا سے کرنی چاہیئے۔ کہ خداوند کریم حاکموں کو انسانیت اور نوعِ انسان کی محبت عطا فرمائے۔"
۱۰ جنوری	: سر اکبر حیدری نے ایک ہزار روپے کا چیک بھیجا جسے علامہ نے واپس لوٹا دیا۔
۲۵، فروری	: علامہ کو دمے کا دورہ ہوا۔ پہلے جوشاندہ پیا اور بعد میں ایلو پیتھک علاج شروع ہوا۔
۳ر مارچ	: علامہ پر ضعفِ قلب سے غشی طاری ہو گئی۔ اور اس حالت میں پلنگ سے گر گئے۔
۱۹ر اپریل	: سید ابوالاعلیٰ مودودی علامہ اقبالؒ کے خط کی روشنی میں حیدر آباد سے پٹھانکوٹ منتقل ہو گئے۔
۲۱ر اپریل	: "جاوید منزل" میں صبح پانچ بجکر چودہ منٹ پر جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

"انسان صحیح معنوں میں مسلم اس وقت ہوتا ہے جب قرآن کے فرمائے ہوئے اوامر و نواہی اس کی اپنی "خواہش" بن جائیں، یعنی وہ یہ سمجھے کہ میں کسی حاکم یا آقا کے تسلط کے ماتحت فضائل و عبادات پر کاربند، اور ذمائم و قبائح نفس سے مجتنب ہوں، بلکہ یہ چیزیں اس کی اپنی تمنا بن کر اس کے عمق رُوح سے اچھلیں۔"

اقبالؒ کی تصانیف

رانا شکور احمد خان

سال چہارم

اقبالیات اس دور میں بذاتِ خود ایک جامع مضمون ہے۔ اس مضمون میں تحقیق و تنقید اور تشریح و تفسیر کے بیسیوں موضوعات ہیں اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے اور مستقبل قریب اور بعید میں اقبالیاتی ادب پر گرانقدر اضافے ہوں گے۔ ذیل کے مضمون میں ہم محض اقبالؒ کی اپنی تصانیف کا ایک مجمل سا جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

۱ : بانگِ درا

ستمبر ۱۹۲۴ء میں اردو کا یہ پہلا مجموعہ کلام شائع ہوا ہے اور اب تک اس کے بتیس ۳۲ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اس کی بعض نظموں کا دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

۲ : بالِ جبریل

جنوری ۱۹۳۵ء میں تاج کمپنی لاہور سے شائع ہوئی۔ اب تک اس کی بیس ۲۰ اشاعتیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اقبالؒ کے اردو کلام میں یہ مجموعہ شاعرانہ پختگی کے اعتبار سے بے مثال اور منفرد ہے۔ اس کے حصہ غزلیات میں فکر و فن کا عروج ملتا ہے۔

۳ : ضربِ کلیم

جولائی ۱۹۳۶ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ آج تک اس کے اٹھارہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں یہ اردو مجموعہ کلام اقبالؒ کی فکر کے بہت سے پہلوؤں کی نشان دہی کرتا ہے۔

۴ : اسرار و رموز

اس سے قبل فارسی کی یہ مثنوی دو الگ جلدوں میں شائع ہوئی۔ "اسرارِ خودی" ۱۹۱۵ء میں اور "رموزِ بے خودی" ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ بعد میں ان دونوں کو ملا کر "اسرار و رموز" شائع ہوئی۔ اس کے موضوعات پر بہت زیادہ تنقید ہوئی۔ ان دونوں حصوں کا ترجمہ پروفیسر نکلسن اور پروفیسر اے جے آربری نے کیا ہے

۵ : پیامِ مشرق

فارسی کا یہ مجموعہ کلام ۱۹۲۳ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے شائع ہوا۔ مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے "پیامِ مغرب" کا منظوم جواب دیا گیا ہے۔ اس کے کل چودہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۶ : زبورِ عجم

اقبالؒ کا یہ فارسی مجموعہ کلام جون ۱۹۲۷ء میں شائع ہُوا، اس کے آٹھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اس کے حصہ اوّل میں ۵۶ غزلیات، حصہ دوم میں ۷۵ غزلیات و منظومات اور حصہ سوم "گلشنِ رازِ جدید" کے نام سے موجود ہے۔

۷ : جاوید نامہ

۱۹۳۲ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ ابھی تک اس کے کل چھ ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ یہ اقبال کی فکر کا شاہکار ہے۔ اس کا اسلوب ملٹن کی "جنتِ گم گشتہ" اور دانتے کی "طربیہ ربانی" سے قدرے مختلف اور منفرد ہے۔

۸ : پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق مع مسافر

اس فارسی مجموعہ کلام کا پہلا ایڈیشن مثنوی مسافر کے بغیر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ بعد میں مثنوی مسافر کے ہمراہ اس کا ایڈیشن ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے سات ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۹ : ارمغانِ حجاز

اس کا پہلا ایڈیشن نومبر ۱۹۳۸ء میں اقبالؒ کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ مگر اس کی ترتیب ان کی زندگی میں مکمل ہو چکی تھی۔ یہ آج تک دس مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔

۱۰ : کلیاتِ اقبالؒ (حصہ اردو)

فروری ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی زیرِ نگرانی علامہ کا تمام اردو کلام ایک کلیات کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ میں بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، اور ارمغانِ حجاز کا (حصہ اردو) شامل ہے اس قسم کی کلیات بہت سے دوسرے اداروں نے بھی شائع کی ہیں۔

۱۱ : کلیاتِ اقبالؒ (فارسی)

علامہ اقبالؒ کا تمام فارسی کلام جس میں اسرار و رموز، زبورِ عجم، جاوید نامہ، پیامِ مشرق، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق مع مسافر، اور ارمغانِ حجاز حصہ فارسی شامل ہیں۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی زیرِ نگرانی شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور سے فروری ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ اس قسم کی ایک کلیات ایران میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ مگر پاکستانی ایڈیشنوں کے آخر میں مختلف قسم کے انڈکس یا اشاریے بھی دیئے گئے ہیں جن سے اس کلیات کی اہمیت نمایاں ہو گئی ہے۔

۱۲ : نوادرِ اقبالؒ

اس مجموعے میں وہ نظمیں شامل ہیں۔ جو ابتداً مختلف رسائل میں شائع ہوئیں مگر اقبالؒ نے اپنے کسی مجموعہ کلام میں ان کو شامل نہ کیا۔ جناب عبدالغفار شکیل نے انہیں اس نام سے جمع کر دیا۔

۱۳ : باقیاتِ اقبالؒ

سید عبدالواحد معینی نے اس مجموعے میں ان نظموں کو جمع کیا ہے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئیں۔ مگر اقبالؒ کے کسی مستقل مجموعہ کلام میں جگہ نہ پا سکیں۔ یہ مجموعہ فکرِ اقبالؒ کے مطالعہ کے لئے بے حد مفید ہے۔ اس کے بہت سے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں مگر آئینہ ادب لاہور نے ۱۹۶۶ء میں جو نسخہ شائع کیا ہے وہ مفید تر ہے۔

۱۴ : سرودِ رفتہ

باقیاتِ کلامِ اقبالؒ کا یہ مجموعہ مولانا غلام رسول مہر اور صادق علی دلاوری نے مرتب کیا ہے جس میں "رموزِ بے خودی" اور "بانگِ درا" کے وہ اشعار بھی شامل ہیں جن میں قدرے اصلاح یا تبدیلی کی گئی۔ کلامِ اقبالؒ کی تحقیق کے نقطہ نظر سے یہ ایک مفید کتاب ہے۔

۱۵ : رختِ سفر

اس مجموعہ کلام میں علامہ کا غیر مدون کلام مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔ ان دنوں اس مجموعے کا ایک نیا ایڈیشن مزید خوبیوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کے مرتب یا مدون محمد انور حارث ہیں۔

۱۶ : علمُ الاقتصاد

جدید معاشیات کے موضوع پر یہ علامہ کی پہلی تصنیف ہے جو سب سے اول ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔

آپ نے اپنے زمانۂ تدریس کے دوران اسی موضوع پر واکر WALKER کی کتاب (POLITICAL - ECONOMY) کا تلخیص و ترجمہ بھی کیا تھا ۔ جدید معاشیات کے ابتدائی اور تعارفی قسم کے مباحث علامہ کے اس ترجمہ میں شامل ہیں ۔

۱۷ : THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA

" فلسفۂ عجم " یا ایران میں مابعد الطبیعات کی نشو و نما ، کے نام سے اقبالؒ نے یہ تحقیقی مقالہ انگریزی زبان میں اپنے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے مرحلے پر ۰۸ --- ۱۹۰۵ء کے دوران لکھا ۔ جس کی بنا پر آپ کو میونخ (جرمنی) سے ڈاکٹریٹ کی سند ملی ۔ بعد میں اقبالؒ کو اس مقالے کے مندرجات میں کئی جگہ خود ہی اختلاف پیدا ہو گیا ۔

۱۸ : THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUHGT IN ISLAM

یہ علامہ کے وہ خطبات ہیں جو انہوں نے مدراس اور دیگر مقامات پر دیئے ۔ اس سے قبل یہی خطبات ۱۹۳۰ء میں لاہور میں شائع ہوئے ۔ مگر اس میں چھ خطبات تھے بعد میں ایک خطبے کے اضافے کے ساتھ موجودہ نام سے یہ شائع ہوئے ۔ اس کتاب میں فلسفیانہ مباحث پیش کئے گئے ہیں ۔ برصغیر سے باہر کی علمی دنیا میں ان خطبات کا بہت شہرہ ہے ۔ بعض حضرات کے اختلاف کے باوجود اس میں موضوعات کی جدت قابل لحاظ ہے ۔ اس کا ترجمہ سید نذیر نیازی نے " تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ " کے نام سے کیا ہے ۔ بعض لوگ اس ترجمہ کو اصل کتاب سے بھی زیادہ مشکل قرار دیتے ہیں ۔

۱۹ : انوارِ اقبالؒ

اس میں اقبالؒ کے ۱۸۵ مکاتیب جمع کر کے شائع کئے گئے ہیں ۔ اس کے علاوہ علامہ کی دیگر تقاریر یا بیانات وغیرہ بھی اس میں جمع کئے گئے ہیں ۔ اس نادر مجموعے کے مرتب بشیر احمد ڈار ہیں ۔ جناب ممتاز حسن نے اس پر پیش لفظ تحریر کیا ہے ۔

۲۰ : اقبالؒ نامہ

اقبالؒ کے خطوط کا یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے ۔ جسے شیخ عطاء اللہ نے مرتب کیا ہے ۔ اس کے پہلے حصے میں ۱۶۳ اور دوسرے حصے میں ۱۸۷ خطوط شامل ہیں ۔ تعداد کے اعتبار سے مکاتیب کا یہ مجموعہ بہت وقیع ہے ۔

۲۱ : خطوطِ اقبالؒ

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے اس مجموعے میں ۱۱۱ غیر مدون اردو ، انگریزی اور عربی خطوط کو حواشی اور تعلیقات

کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ فنی اعتبار سے خطوط کا یہ مجموعہ تحقیق و احتیاط کی ایک عمدہ مثال ہے ۔

۲۲ : شادِ اقبالؒ

اقبالؒ کے مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے نام ۹۴ خطوط کا یہ مجموعہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے مرتب کیا ہے اسی طرح مہاراجہ کے اقبالؒ کے نام ۵۲ خطوط بھی اس میں شامل ہیں۔ باہمی خط و کتابت کے اس مجموعے سے بہت سے مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

۲۳ : مکاتیبِ اقبالؒ بنام گرامی

مولانا غلام قادر گرامی فارسی کے جید شاعر تھے ۔علامہ اقبالؒ کے ان کے نام ۹۰ خطوط کا یہ مجموعہ مشہور محقق محمد عبداللہ قریشی نے مرتب کیا ہے ۔ حواشی اور تعلیقات کے نقطہ نظر سے یہ مجموعہ اپنی نظیر آپ ہے ۔ علامہ کی فارسی شاعری کو سمجھنے کے لئے یہ مکاتیب کا مجموعہ خصوصی افادیت کا حامل ہے۔

۲۴ : مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خاں مرحوم

یہ خطوط جس کے نام لکھے گئے ہیں۔ وہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے ۹۱ خطوط کا یہ مجموعہ بزمِ اقبالؒ ، لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے جسٹس ایس اے رحمٰن مرحوم نے اس کا پیش لفظ تحریر کیا ہے ۔

۲۵ : مکتوباتِ اقبالؒ بنام نذیر نیازی

خطوط کے اس مجموعہ میں ۱۸۰ خط شامل ہیں۔ اور انہیں مکتوب الیہ نے خود ہی مرتب کر کے حواشی اور تعلیقات لکھے ہیں ۔

۲۶ : LETTERS AND WRITINGS OF IQBAL

اقبالؒ کی مختلف انگریزی تحریروں اور خطوط کا یہ مجموعہ بشیر احمد ڈار نے مرتب کیا ہے جس میں ۴۳ خطوط اور مختلف دوسری تحریریں شامل ہیں۔

۲۷ : IQBAL

اس مجموعے میں صرف وہی تحریریں شامل ہیں جو علامہ نے عطیہ بیگم کے نام لکھی ہیں ۔ موصوفہ نے خود ہی انہیں مرتب کر کے شائع کیا ہے ۔ اس مجموعے سے اقبالؒ کے زمانہ قیام یورپ پر بڑی بھرپور روشنی پڑتی ہے ۔

کئی حضرات نے اس کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

۲۸: LETTER OF IQBAL TO JINNAH

خطوط کے اس مجموعے کا دیباچہ قائداعظم محمد علی جناح نے لکھا۔ اور شیخ محمد اشرف مرحوم نے ان کو شائع کرایا۔ ان خطوط کے بہت سے اردو تراجم کئے گئے ہیں۔

۲۹: اوراق گم گشتہ

اس مجموعہ مضامین و شذرات میں اقبالؒ سے متعلق اور خود علامہ کی بہت سی تحریریں جو مختلف جرائد و رسائل میں منتشر تھیں۔ انہیں پروفیسر رحیم بخش شاہین نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے جمع کیا ہے۔ مطالعہ اقبال میں یہ ایک مفید اور مثبت کتاب ہے اس قسم کی مزید کتب کے مرتب ہونے کی ضرورت ہے۔

۳۰: مقالات اقبالؒ

اس مجموعہ میں اقبالؒ کے بہت سے مضامین کو یکجا شائع کیا گیا ہے۔ سید عبدالواحد معینی کی یہ کوشش اقبالیاتی ادب میں قابل قدر ہے۔

۳۱: گفتار اقبالؒ

ادارہ تحقیقات پاکستان، پنجاب یونیورسٹی لاہور نے علامہ کے مختلف اخبارات سے ۱۱۷ بیانات محمد رفیق افضل کے ذریعہ مرتب کرائے ہیں۔ اقبالؒ کی سیاسی اور ملی خدمات کو جاننے کے لئے یہ تحریریں بہت معاون ثابت ہوتی ہیں۔

۳۲: STRAY REFLECTIONS

یہ علامہ اقبالؒ کی ۱۹۱۰ء کے درمیانی چند ماہ کی ڈائری کے اوراق ہیں۔ جن میں ۱۲۵ شذرات شامل ہیں۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے ۱۹۶۱ء میں انہیں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے ان کا اردو ترجمہ "شذرات فکر اقبالؒ" کے نام سے کیا ہے۔

۳۳: MEMENTOS OF IQBAL

پروفیسر رحیم بخش شاہین نے اس کتاب میں اقبال کے کچھ نادر مضامین اور بیانات کو جمع کیا ہے۔ آخر میں

کچھ متفرقات کو بھی جمع کر دیا گیا ہے۔ جن میں اقبالؒ سے متعلق کچھ اہم دستاویزات کے حوالے بھی شامل ہیں۔

۳۴: SPEECHES AND STATEMENTS OF IQBAL

اسے شاملو (SHAMLOO) نے مرتب کیا ہے۔ اس مجموعے کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں علامہ کی ۴۳ مختلف تقاریر، قرار دادیں اور بیانات ہیں۔ دوسرے حصہ میں اسلام اور قادیانیت کے موضوع پر چھ تحریریں ہیں۔ اور تیسرے حصہ میں دس مختلف بیانات شامل ہیں۔ لطیف احمد خان شروانی نے اس کتاب کا اردو ترجمہ "حرف اقبالؒ" کے نام سے کیا ہے۔

۳۵: THOUGHTS AND REFLECTION OF IQBAL

سید عبد الواحد کے اس مجموعہ میں "شاملو" کے مجموعے کے علاوہ اور بہت سی نادر تحریریں شامل ہیں۔

۳۰: آئینہ عجم

علامہ اقبالؒ نے فارسی نظم و نثر کا یہ انتخاب میٹرک کے طلبہ کے لئے مرتب کیا۔ یہ کتاب عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور سے شائع ہوئی۔

۳۰: اردو کورس (چھٹی، ساتویں، اور آٹھویں جماعتوں کے لئے)

علامہ نے حکیم احمد شجاع کے ساتھ مل کر طلبہ کے لئے یہ درسی کتابیں مرتب کی تھیں۔ گلاب چند کپور اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا۔

۳۱: اقبال ہند

علامہ نے لالہ رام پرشاد کے ساتھ مل کر تاریخ ہند کا سوالاً جواباً خلاصہ لکھا۔ یہ کتاب طلبہ کے استفادے کے لئے لکھی گئی۔

۳: تاریخ ہند

علامہ نے یہ درسی کتاب بھی لالہ رام پرشاد کے ساتھ مل کر لکھی۔

۱: فیضان اقبالؒ اقبال کی نثر سے یہ منتخب اقوال شورش کاشمیری نے مرتب کئے۔ جیبی سائز کی یہ کتاب مختلف عنوانات اور موضوعات کے تحت مختلف اقوال اقبال کا مجموعہ ہے۔

اقبالؒ کی شگفتہ مزاجی

محمد سعید ناشر
سالِ اوّل

اقبال حکیم الامت بھی تھے اور فلسفی شاعر بھی، اقلیم سیاست کے راہرو بھی تھے اور حیات قومی کے نباض بھی ــــ ان کی شخصیت میں جہاں سنجیدگی و متانت کا جوہر ہے، وہاں شوخی اور ظرافت کا پہلو بھی موجود ہے۔ شوخی و ظرافت کا اظہار ان کی گفتگو سے بھی ہوتا تھا اور یہی رُخ ان کے کلام میں بھی موجود ہے۔ اقبالؒ کی شخصیت اور کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے اس رنگ ظرافت کے نمونے جابجا دکھائی دیتے ہیں۔

ایک دفعہ ان کی پارٹی میں ایک مہمان آئیں، جن کے بال بہت خوبصورت اور سنہری تھے۔ چونکہ ابھی نوعمر تھیں، اس لئے رخساروں پر نرم نرم روئیں زیادہ نمایاں تھیں۔ علامہ اقبالؒ نے عطیہ بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا

اس کے عارض پہ سنہری بال ہیں
ہر طلائی استرا اس کے لئے

والدہ جاوید کو مرغیوں کی پرورش کا بڑا شوق تھا اور مرغی کے چوزے نکلوا کر بڑے شوق اور محبت سے ان کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ مرغی اپنے چوزوں کو لئے سارا دن مختلف کمروں میں گھومتی رہتی۔ علامہ انہیں چوزہ بریگیڈ کے نام سے پکارتے تھے۔ اگر کبھی یہ فوج ان کے کمرے میں آجاتی تو علامہ فوراً علی بخش سے کہتے، علی بخش چوزہ بریگیڈ کی ڈیوٹی کسی اور جگہ لگا دو۔

خان بہادر حبیب اللہ یورپ سے حصولِ تعلیم کے بعد واپس وطن آئے تو علامہ سے ملنے کے لئے ان کے ہاں گھر پر آئے، علامہ نے فوراً کہا، کیوں بھئی ولایت سے ہو آئے ہو۔ حبیب اللہ نے طنزاً کہا کہ میں تو آٹھ نو سال کی عمر میں انگلینڈ چلا گیا تھا۔ علامہ کی رگ ظرافت پھڑکی اور مسکرا کر فرمایا کہ پھر تو یوں کہنا چاہیئے کہ ؎

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں!

نواب زادہ خورشید علی خاں چھوٹی عمر میں یوکلپٹس کے درختوں سے کھرچ کھرچ کر گوند نکالا کرتے تھے۔ علامہ جب اس کے پاس سے گزرتے تو اکثر پوچھتے، چھوٹے میاں کیا کر رہے ہو؟ وہ کہتے گوند نکال رہا ہوں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب فرماتے۔ ؎

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے

چھوٹے میاں یہ مصرع سن کر کہتے کہ بس آپ کی شاعری ایک ہی مصرع پر آکر ختم ہو گئی۔ ایک دفعہ پھر ایسا اتفاق ہوا

اور چھوٹے میاں کو گوند کھرچتے ہوئے دیکھا، تو شعر مکمل کر دیا ؎

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے
اور ان کی شادی ہو گی کسی نیک بخت سے

علامہ اقبالؒ کے چوہدری سر شہاب الدین سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ چوہدری صاحب کا رنگ انتہائی کالا اور جسم بہت موٹا تھا۔ علامہ کی اکثر ان سے مزاحیہ نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن چوہدری صاحب سیاہ رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے بار روم میں داخل ہوئے، علامہ نے دیکھتے ہی بے ساختہ کہا۔

"ہائیں چوہدری صاحب آج ننگے ہی چلے آئے ہیں!"

اس طرح علامہ نے چوہدری صاحب کے بارے میں ایک اور لطیفہ بنا کر اپنے ساتھیوں کو محظوظ کیا کہ ایک دفعہ انہیں عدالت عالیہ کے جج نے یاد کیا تو وہ فوراً اٹھے اور کھونٹے سے جا کر اپنا "گاؤن" اتارنے لگے۔ تاکہ پہن کر عدالت میں جا سکیں۔ علامہ نے دو تین مرتبہ کھینچا۔ تو "گاؤن" کھونٹی سے نہ اترا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو چودھری شہاب الدین کھڑے تھے۔

ایک مرتبہ سر شہاب الدین سفید لباس میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علامہ نے اس لباس میں جب اپنے وکیل دوست کو دیکھا تو چھوٹتے ہی کہا۔

" او دیکھو کپاہ وچ کٹا وڑ گیا "
(یعنی کپاس کے کھیت میں بھینس کا بچھڑا گھس گیا ہے)

کیمبرج یونیورسٹی میں ایک مرتبہ مذہب پر بحث شروع ہو گئی۔ ایک آدمی نے اس دوران علامہ سے استفسار کیا "یہ کیا بات ہے آج تک جتنے بھی پیغمبر آئے ایشیا ہی میں مبعوث ہوئے، یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ بھئی بات یہ ہے کہ شروع شروع میں اللہ تعالیٰ اور شیطان دونوں نے اپنا اپنا پنتیرا جمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو۔ اس پر وہ صاحب بول اٹھے۔ کہ "پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟ آپ نے فرمایا" یہ تمہارے میکا ولی اس کے رسول ہیں۔

کسی اسلامی ملک سے ایک معزز مہمان ڈاکٹر صاحب سے ملنے آئے۔ سر شہاب الدین بھی کھانے پر مدعو تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "میرا تعارف مہمان سے ٹھیک طرح کرانا۔ تعارف کے وقت اقبالؒ نے چوہدری صاحب کی تعریف کی کہ "منافقت کے اس دور میں چوہدری صاحب بڑے مخلص اور صاف باطن مسلمان ہیں۔ ان کا ظاہر و باطن ایک سا ہے۔"

جس زمانہ میں شیخ عبدالقادر وزیر ہند کی کونسل کے رکن تھے۔ اور انگلستان میں مقیم تھے۔ تو انہوں

نے ایک دفعہ مسجد ووکنگ میں عید الفطر کی نماز کی امامت کی۔ جب یہ خبر پہنچی تو ڈاکٹر صاحب نے ایک بے تکلف صحبت میں فرمایا۔ کہ "لو بھئی ایک امامت عبد القادر کے دستِ ستم سے بچی ہوئی تھی۔ ظالم نے اس پر بھی ہاتھ صاف کر دیا۔

ایک مولوی صاحب ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ اور کچھ دینیات اور فقہ کے مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ اور کچھ اپنے ورثہ پدری کے جھگڑے کے متعلق۔ وہ اپنے والد مرحوم کے ترکہ سے اپنی بہن کو ورثہ شرعی نہیں دینا چاہتے تھے اور انگریزی قانون کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ یہ مولوی صاحب اقبالؒ کو ہمیشہ طعنہ دیتے تھے کہ تم اس قدر علمِ دین رکھنے اور اسلام اور نبی سے اس قدر دعویٰ عشق رکھنے پر بھی داڑھی نہیں رکھتے۔ آخر ایک روز تنگ آ کر اقبالؒ نے کہا۔ " دیکھئے مولوی صاحب علم اور ایمان کے باوجود ہر شخص کے عمل میں کچھ نہ کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں آپ کی کمزوری اور خلافِ شرع حرکت یہ ہے کہ آپ بہن کو حصہ نہیں دینا چاہتے۔ اور میری کوتاہی ہے کہ میں داڑھی نہیں رکھتا۔ لایئے ہاتھ بڑھایئے آپ بہن کو ورثہ سے حصہ دے دیجئے۔ اور میں داڑھی بڑھا لیتا ہوں" لیکن مولوی صاحب کو ہمت نہ ہوئی۔

مسٹر عبد اللہ یوسف علی (سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور) کے علم و فضل کا کسی زمانہ میں بڑا شہرہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو ان کی عربی دانی پر شبہ تھا۔ ایک مرتبہ یہ بحث چھڑ گئی۔ کہ دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم کون ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا " انسانوں میں حسین علیہ السلام اور کتابوں میں قرآن "۔ کسی نے پوچھا۔ قرآن کی مظلومیت کیسے ثابت ہوئی؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا " یوسف علی اس کا ترجمہ کر رہا ہے۔ قرآن پر اس سے زیادہ ظلم کیا ہو گا؟

ایک دن علامہ کے پاس ایک پیر بیٹھے تھے۔ ان کا ایک مرید ادھر آنکلا اور میلے کچیلے کپڑوں سے دو روپے نکال کر پیر صاحب کو بطورِ نذرانہ پیش کئے اور عرض کی "یا حضرت دعا کیجئے کہ مجھ پر جو دو سو روپے کا قرضہ ہے اس سے سبکدوش ہو جاؤں۔ پیر صاحب نے ہاتھ اٹھاتے ہی ڈاکٹر صاحب کو بھی دعا میں شرکت کی دعوت دی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اشارہ کیا اپنا کام کیجئے۔ جب دعا سے فارغ ہو چکے تو ڈاکٹر صاحب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور کہا " یا اللہ! پیر اور مرید دونوں کو راہِ راست دکھا" پیر صاحب بگڑ کر بولے " مریدوں کے سامنے بھی مذاق اڑانے سے باز نہیں آتے" ڈاکٹر صاحب نے کہا " اس کم بخت کی کیا مراد بر آئی۔ دو سو روپے کا بار لیکر آیا تھا۔ اب دو سو روپے کا مقروض ہو کر جا رہا ہے۔

مشہور ہندو صوفی سوامی رام تیرتھ سے ڈاکٹر صاحب کے بڑے دوستانہ تعلقات تھے۔ ڈاکٹر صاحب سوامی جی کی روحانیت کے مداح تھے۔ سوامی جی کی وفات کے کئی سال بعد ان کا بڑا صاحبزادہ جو ولایت سے ابھی واپس آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے ملنے آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا " آپ کا کیا شغل ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں ولایت سے کان کنی کا کام سیکھ کر آیا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر برجستہ کہا " آپ کے والد تو آسمان کھودا کرتے تھے۔ آپ زمین کھودیں گے۔"

مولانا محمد علی جوہر اقبالؒ کے بڑے عقیدت مند تھے لیکن ان کو اقبال کی سیاسی روش سے شکایت تھی۔ ایک دفعہ

کہنے لگے: "تمہارے اشعار نے تو مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ لیکن تم خود بے عمل ہو۔ اقبالؒ نے کچھ سوچ کے بعد کہا: "مولانا آپ صحیح فرماتے ہیں۔ آپ نے قوالی میں دیکھا ہوگا کہ قوال گاتے ہیں اور سامعین حرکت کرتے ہیں۔ کوئی سر دھنتا ہے، کوئی وجد میں آتا ہے اور کوئی حال کھیلتا ہے اگر قوال گانا بند کر کے ان کے ساتھ ناچنا شروع کر دیں تو آپ بتلائیں محفل کا کیا حشر ہوگا۔ مولانا! میں تو قومی قوال ہوں۔ میرا کام محض گانا ہے۔"

گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب اٹلی بھی ٹھہرے تھے۔ غالباً روم کا قصہ ہے وہاں ایک خاتون نے جو اسلامی فن تعمیر کی بڑی شیدا تھیں، ایک مصنوعی جنت بنا رکھی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اس جنت کی سیر کرائی اور اس کے بعد پوچھا کہ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا "جنت بھی ہے اور حور بھی۔ کسر صرف ایک مرد مومن کی ہے۔"

ایک روز گورنمنٹ کالج لاہور کے کچھ طلبہ حاضر ہوئے اور کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب پردہ کے متعلق آپ کا خیال ہے ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ وہ ترقی کے راستہ میں حائل ہے۔" ان دنوں کالجوں کے طلبار، خاص طور پر

گورنمنٹ کالج کے طلبہ میں بننے سنورنے کا شوق حد سے زیادہ تھا۔ اور بعض طلبہ تو لپ سٹک تک استعمال کرتے تھے۔ اتفاق سے یہ طلبہ بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ علامہ پہلے ان کی باتیں سنتے رہے پھر کہنے لگے۔

"آپ تو کہتے ہیں کہ عورتوں کو پردہ سے نکالا جائے۔ اور میں اس فکر میں ہوں کہ لڑکوں کو بھی پردے میں بٹھا دیا جائے۔"

"اقبال کے سے خودی کی شعوری انفرادیت ہی اصل اصول ہے۔ وہ ہمیشہ علم ذات و اثبات خودی اور ارتقائے نفس کا سبق دیتا ہے۔ اس کا مقصد حیات عمل ہے۔ جس کا انجام روحانی اور اخلاقی قوت ہے جو ضبط نفس و اطاعت سے نشوونما پاتی ہے۔ ہم مادہ کو تسخیر کرنے کے بعد آزاد ہو جاتے ہیں۔"

(ڈاکٹر نکلسن پیام مشرق)

دانائے راز

سلیم اختر رانا
سال اول

فطرت الٰہی کچھ یوں واقع ہوئی ہے کہ جونہی امت مسلمہ پر کوئی ایسی آفت نازل ہو جائے کہ بحیثیت قوم اس کا وجود خطرے میں پڑ جائے اور ملت اسلامیہ اپنے ذرائع اور اسباب سے اس کو رفع کرنے کی ہمت اور حوصلہ نہ رکھتی ہو۔ تو قدرت خداوندی پردۂ غیب سے ایسے اسباب پیدا کر دیتی ہے۔ کہ جس سے ملت اسلامیہ کی ڈگمگاتی ناؤ پھر سنبھل کر لنگر انداز ہو جاتی ہے۔ ان اسباب خداوندی کو خدائی تدابیر کہا جاتا ہے۔ اور جب بھی ملت اسلامیہ کو زوال و ادبار کی گھٹاٹوپ تاریکیوں سے واسطہ پڑا تو، چانک پردہ غیب سے خدائی تدابیر کچھ ایسی کرشمہ سازیوں سے جلوہ گر ہوتی ہیں کہ کفر و باطل کی چالوں کے تمام تار و پود تار عنکبوت کی طرح بکھر جاتے ہیں۔ اور مسلمان کفر کا گھیرا توڑ کر آزادی کی فضا میں نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان خدائی تدابیر میں سے ایک تدبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے ایسی نابغہ روزگار شخصیت پیدا کر دیتے ہیں۔ جس کے نفس ناطقہ میں مسیحائی تاثیر ہوتی ہے جس کے نغموں میں زبور کی سی مٹھاس اور سحر انگیزی ہوتی ہے۔ جس کی اثر آفرینی سے مردہ قوم کی رگوں میں پھر سے خون زندگی دوڑنے لگتا ہے۔ وہی قوم جو غلامی اور ذلہ خواری پر قانع ہو چکی تھی۔ از سر نو اس کی خودی بیدار ہو جاتی ہے۔ کہ طاغوتی سازشوں کا خالق ابلیس دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے اور ابلیس کہتا ہے کہ

> آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے   کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
>
> اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں !   کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو

برصغیر پاک و ہند میں بھی اسی قسم کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ اور اسلام کے دوبارہ ابھرنے کے امکانات کو تقریباً ختم ہی کر دیا گیا تھا۔

اس پر آشوب دور میں برصغیر پاک و ہند کے زخم خوردہ اور نڈھال مسلمانوں پر یاس و قنوطیت چھا گئی تھی۔ اور مسلمان غلامی کو نوشتہ تقدیر سمجھ کر راضی برضا ہو گئے تھے۔ مگر یہاں بھی خدائی تدبیر نے ہماری دستگیری کی اور یہ خدائی تدبیر علامہ محمد اقبالؒ کے روپ میں جلوہ گر ہوئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا کلام آناً فاناً گلی کوچوں میں گونجنے لگا۔ ان کے کلام نے سکولوں اور کالجوں کے نوجوانوں کے خون کو گرما دیا۔ علمائے کرام کا طبقہ ہو یا مشائخ عظام کا طائفہ، طبقہ امرا ہو یا گروہ غربا ہو، علامہ اقبال سبھی کے محبوب القلوب ہو گئے۔ اور ان کا کلام ہر ایک کے ورد زبان ہو گیا۔

کلامِ اقبالؒ نے قوم کے ہر فردِ بشر کے قالب میں ایک نئی جان ڈال دی۔ ایک نئی لگن لگا دی۔ ان کے تن من میں آزادی و حریت کی آگ لگا دی اور مسلمانانِ ہند تخت یا تختہ کا نصب العین لے کر میدان میں نکل آئے۔ اور حضرت قائداعظم کی ایک ہی ضربِ کلیمی نے فرنگی اقتدار اور ہندوؤں کی عیاری سے بت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔

علامہ اقبال جلد ہی ملتِ اسلامیہ کے حدی خواں بن گئے اور ان کے رشحاتِ فکر۔

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری — نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

کے آئینہ دار بن گئے۔ ان کا فکری رنگ و انداز نہ صرف آخر دم تک جاری رہا، بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تابناکی میں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ ان کی وفات کے چند سال بعد جب پاکستان قائم ہوا تو ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ کس طرح ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

فکرِ اقبال کا سرچشمہ و محور اسلام اور صرف اسلام تھا ان کا کلام آج بھی اسلام کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور ہر نوع کی غیر اسلامی قوتوں کی راہ میں مضبوط فصیل ثابت ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں یہ اعجاز آفریں خوبی، عشقِ رسولِ مقبولؐ کا عطیہ ہے جس سے سرشار ہو کر انہوں نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں — یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا، اور مسلمان کو یہ راستہ دکھایا کہ

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے — دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

اہلِ پاکستان ان کے ہمیشہ ممنون رہیں گے کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات پر عملدر آمد کے لئے اس پاک سرزمین کی آزادی اور خود مختاری کی ضرورت کی اہمیت کی نشاندہی فرمائی۔ ان کی عظمتِ فکر و تدبر نے صرف اس مملکت کے لئے نظریہ دینے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ اس پر عملدر آمد کے لئے قائداعظم محمد علی جناحؒ کو برصغیر کے منتشر اور درماندہ مسلمانوں کی راہنمائی قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ یہ ان کا ایک ایسا لازوال اور عظیم احسان ہے جس کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کا حق ہم اسی طرح ادا کر سکتے ہیں۔ کہ ہم پاکستان کی تعمیر و استحکام میں مفکر اور قائد دونوں کے خیالات و عزائم کو پوری طرح پیشِ نظر رکھ کر ایسی مثبت اور مضبوط بنیادیں قائم کر دیں جن پر آئندہ نسلیں حوصلوں کے مطابق تعمیر استوار کرنے کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

دمِ زندگی، رمِ زندگی، غمِ زندگی، سمِ زندگی
غمِ رم نہ کر، سمِ غم نہ کھا، کہ یہی ہے شانِ قلندری

اقبالؒ اور اتحادِ عالم اسلامی

محمد اقبال۔ سال چہارم

اقبال کی شاعری کا آغاز وطنیت کے افکار و خیالات سے ہوا۔ اور خیالات کا یہ دھارا زماں و مکاں کی مختلف گردشوں سے ہوتا ہوا اتحادِ عالم اسلامی کی منزل تک جا پہنچا۔ یہ ایک عجیب و غریب مماثلت ہے کہ برصغیر میں سرسید احمد خاں علامہ اقبال اور قائدِ اعظمؒ تینوں ابتدا میں وطنیت پرست تھے اور متحدہ قومیت کے نظریے کو تسلیم کرتے رہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ تینوں حضرات ملتِ اسلامیہ کے سیاسی حقوق کے پاسبان ثابت ہوئے۔

علامہ اقبالؒ نے جس دور میں برصغیر میں جنم لیا اس وقت ماحول وطنیت پرستی اور متحدہ قومیت کے غیر اسلامی تصورات سے بھرا ہوا تھا۔ غیر ملکی حکمران اور استعماری قوتیں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے مغرب کے افکار و خیالات کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہی تھیں۔ اقبال کے ابتدائی زمانے میں کانگرس کے نام سے ایک سیاسی جماعت تشکیل پا چکی تھی۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے راہنما بھی اس کانگرس کے ہمنوا بن چکے تھے۔ اقبال کی بعض ابتدائی نظموں میں اسی قسم کے وطنی جذبات دکھائی دیتے ہیں۔ ہمالہ، شاعر، تصویرِ درد، ترانۂ ہندی ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور نیا شوالہ وہ نظمیں ہیں جن میں وطن سے محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اس زمانے میں انہوں نے خاکِ وطن کے ہر ذرّے کو دیوتا قرار دیا ہے اور اس دور کی شاعری کا خاص انداز یہ ہے

زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں
ہندوستاں، لکھ دیں ماتھے پر اس صنم کے
بھولے ہوئے ترانے دُنیا کو پھر سنا دیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو
آوازۂ اذاں کو ناقوس میں ملا دیں

قیامِ انگلستان کے دوران اقبالؒ کے ذہن میں وطنیت کے بارے میں ایک واضح تبدیلی پیدا ہوئی۔ قرآن پاک کے مطالعے سے ان کے ہاں مسلم قومیت کا تصوّر پیدا ہوا۔ جس کا اظہار اس دور کی نظموں میں جا بجا ملتا ہے۔ اسلام کے تصوّرِ قومیت کی وضاحت ان شعروں میں دیکھئے،

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اسلامی تصور قومیت کی یہ لے ان کے ہاں وقت کے ساتھ ساتھ تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ اور بالآخر اس نے یہ رنگ اختیار کیا ؎

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے!

یورپ سے واپسی کے بعد اقبالؒ نے اپنی تمام صلاحیتوں کو ملتِ اسلامیہ کی وحدت و یگانگت پر صرف کیا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اردو کے ساتھ فارسی زبان کو بھی ذریعۂ سخن بنا لیا۔ مسلم قومیت کا یہ تصور اب ان کے فکر و فلسفہ کا بنیادی موضوع بن گیا۔ اقبالؒ اس دور میں سید جمال الدین افغانیؒ کی تحریک سے متاثر ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"اٹھارہویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کے انتہائی زوال کے بعد انیسویں صدی میں سید جمال الدین افغانی افغانستان میں سر سید احمد خان، ہندوستان میں اور مفتی عالم جان روس میں پیدا ہوئے۔ سر سید اور مفتی عالم جان نے مسلمانوں کی پستی کا علاج جدید تعلیم کو قرار دیا، مگر سید جمال الدین افغانیؒ نے بین الاسلامی تحریک جاری کی۔ اور ایران، مصر اور ترکی کے ممتاز افراد میں روح عمل پیدا کر دی۔ جو اب تک جاری ہے۔"

ایک اور مقام پر سید جمال الدین افغانیؒ کی شخصیت سے متاثر ہو کر یہ رائے دی:

"سید جمال الدین افغانیؒ کی شخصیت کچھ اور ہی تھی۔ قدرت کے طریقے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں، مذہبی فکر و عمل کے لحاظ سے ہمارے زمانے کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوا تھا۔ جمال الدین افغانیؒ دنیائے اسلام کی تمام زبانوں سے واقف تھے۔ ان کی

فصاحت و بلاغت سحر آفریں تھی۔ اُن کی بے چین رُوح ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک کا سفر کرتی رہی۔ اور اس نے ایران، مصر اور ترکی کے ممتاز ترین افراد کو متاثر کیا۔ ہمارے زمانے کے بعض جلیل القدر علما، جیسے مفتی محمد عبدہٗ اور نئی پود کے بعض افراد جو آگے چل کر سیاسی قائد بن گئے، مثلاً مصر کے زغلول پاشا وغیرہ انہی کے شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے لکھا کم اور کہا بہت، اور اس طریقے سے ان تمام لوگوں کو جنہیں ان کا قرب حاصل ہوا، چھوٹے چھوٹے جمال الدین بنا دیئے انہوں نے کبھی مجدد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ پھر بھی ہمارے زمانے کے کسی شخص نے روح اسلام میں اسقدر تڑپ پیدا نہیں کی، جس قدر انہوں نے کی تھی۔ ان کی رُوح اب بھی دنیائے اسلام میں سرگرم عمل ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کی انتہا کہاں ہوگی؟

ان تحریروں سے اقبالؒ کی اتحاد عالم اسلامی کی تحریک سے وابستگی کا ذکر ملتا ہے۔ اس تصور کو اقبالؒ ایک مشن بنا چکے تھے۔ شدت جذبات کی یہ لَے "خضر راہ" سے "طلوع اسلام" تک پہنچ چکی تھی۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانیؒ وہ تورانی!
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

۱۹۳۱ء میں موتمر عالم اسلامی کا اجلاس بیت المقدس میں منعقد ہوا۔ جس میں عالم اسلام کے بڑے بڑے راہنما شامل تھے۔ علامہ اقبال بھی اس موتمر کی تمام کارروائیوں میں شریک رہے اور بڑے ذوق و شوق سے اس میں حصہ لیا۔ موتمر سے ہندوستان واپسی کے موقع پر علامہ نے اپنی الوداعی تقریر میں فرمایا:

"مسلمانوں کو اس وقت جس شدت سے اتحاد کی ضرورت ہے۔ اب سے پہلے اتنی کبھی نہ تھی۔ مسلمانانِ عالم اور اسلام کو جو مسائل اور خطرات درپیش ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ صرف اتحاد ہی کے ذریعے کر سکتے ہیں ...." آپ نے مزید فرمایا کہ "میرا ایمان ہے کہ اسلام کا مستقبل اہل عرب کی ذات سے وابستہ ہے اور ان کا مستقبل ان کے باہمی اتحاد پر موقوف ہے۔ ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے کہ عظیم الشان طاقت بن جائیں .... اسلام کے سوا دنیا کی کوئی طاقت اس اتحاد و مادیت کا مقابلہ کامیابی سے نہیں کر سکتی۔ جو یورپ سے نشر و اشاعت حاصل کر رہا ہے .... مجھے اسلام کے خارجی دشمنوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ میرے خیال میں اگر کوئی خطرہ ہے تو اندرونی دشمنوں سے ہے۔" (گفتار اقبالؒ)

علامہ اقبالؒ کی اس انقلابی سوچ اور عالم اسلام کے مسائل سے ہمدردی کے طرزِ عمل کی بنا پر انہیں موتمر عالم اسلامی کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔ علامہ زندگی بھر اس ادارے کی کارروائیوں میں دلچسپی لیتے رہے اس سلسلہ میں مفتی اعظم فلسطین سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ کچھ سال قبل مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی نے کراچی کے ایک یوم اقبالؒ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

"میرے دوست اقبالؒ اتحاد اسلامی کے علمبردار تھے۔ انہوں نے بین الاسلامی اتحاد کے سلسلہ میں جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔"

علامہ اقبالؒ اتحادِ عالم اسلامی کے بہت بڑے نقیب تھے۔ وہ عالم اسلام کے مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ خاکِ وطن کے ہر ذرے کو دیوتا کہنے والا یہ شاعر، وطنیت کے جغرافیائی تصور کی زنجیروں کو توڑ کر ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے نغمے گاتا ہے ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

کچھ مزارِ اقبالؒ کے بارے میں،

مسٹر غلام محمد سابق وزیر مالیات نے مزار کی تعمیر کے لئے فنڈ دینے کی پیشکش کی۔

مزار کے لئے سفید اور سرخ پتھر راجپوتانہ سے درآمد کئے جاتے تھے۔ مزار کی تعمیر ۱۹۴۶ء میں شروع ۔ اور فروری ۱۹۵۰ء میں اختتام پذیر ہوئی۔

ضروری تھا کہ مسجد کی فصیل سے بلند نہ ہو۔ اور گردو پیش کی تعمیرات کے عین مطابق ہو۔

مزار کی تعمیر کے سلسلہ میں غلام محمد انجنیئر نے بلامعاوضہ اپنی خدمات پیش کیں۔

مزار پر تقریباً ایک لاکھ روپیہ صرف ہوا۔

چوہدری محمد حسین نے مزار کے لئے جگہ منتخب کی۔

مزار کا نقشہ حیدرآباد دکن کے زین یار جنگ نے بنایا۔

شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی نے مزار پر کندہ اشعار سے متاثر ہو کر کہا۔ "خوش خطی خوب است۔"

۱۹۴۸ء میں قائداعظمؒ نے مزار پر فرمایا۔ "پاکستان عالم اسلام کے اتحاد کی کنجی ہے۔"

اقبال کی غزلیات

اسرار الحق چوہان
سال دوم

کسے خبر تھی کہ سیالکوٹ کی سرزمین کسی ایسے شاعر کو جنم دے گی۔ جو شاعر بھی ہے اور مفکر بھی، حکیم بھی ہے اور کلیم بھی۔ خودی کا پیامبر بھی ہے اور بے خودی کا رمز شناس بھی۔ تہذیب و تمدن کا نقاد بھی ہے اور توقیر آدم کا مبلغ بھی، اور تحقیر آدم سے دردمند بھی۔

اقبالؒ جس کے کلام میں فکر و نظر ہم آغوش ملتے ہیں۔ اقبالؒ کو شاعری کا ملکہ ودیعت کیا گیا تھا۔ آپ نے بچپن میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ مگر افسوس اقبالؒ نے کم سنی کی اس مشق سخن کو محفوظ رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اقبالؒ کی شاعری کا شہرہ اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب پہلی مرتبہ آپ نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں اپنی شہرہ آفاق نظم "نالۂ یتیم" پڑھی۔ اُسی وقت سے آپ کی شہرت ایک شاعر کی حیثیت سے چاردانگ عالم میں پھیل گئی۔ اور سخن شناسوں نے جان لیا۔ کہ مستقبل کا عظیم شاعر جنم لے چکا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ہندوستان میں چاروں طرف حضرت داغؔ اور امیرؔ کا طوطی بول رہا تھا۔ داغؔ اور امیرؔ کے مراسلتی شاگرد متحدہ ہندوستان میں شہر شہر اور قریہ قریہ بکھرے ہوئے تھے۔ رسم دُنیا کے تحت اقبالؒ نے بھی شاعری میں اپنے استاد کی حیثیت سے حضرت داغؔ کا انتخاب کیا۔ اور انہیں اپنا کلام بغرضِ اصلاح بھیجا۔ مگر داغؔ نے ایک دو غزلوں میں معمولی سی اصلاح کے بعد لکھ بھیجا کہ آپ کو اصلاح کی ضرورت نہیں۔ اس وقت غزل پھر اپنے پرانے احاطہ میں محصور کر دی گئی تھی۔ شعرا حسن و عشق، عاشقی و بوالہوسی کے چکروں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہندوستانی شاعر کو وصل، ہجر، فراق کے سوا اور کوئی بات یاد نہیں رہی تھی۔

اقبالؒ نے ان حالات کے تحت پہلے غزلیں ہی کہیں۔ لیکن اس میدان میں اقبالؒ پامردی سے نہ چل سکے، تاہم چند غزلیں ابتدائی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی گراں قدر ہیں۔ ؎

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا

تیری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

ان غزلوں میں اقبالؒ کے اندر چھپے ہوئے ایک احساس اور فلسفی شاعری کی خوبیاں صاف نظر آتی ہیں ؎

کوئی اب تک نہ سمجھا کہ انسان
کہاں جاتا ہے آتا ہے کہاں سے
وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے
چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے

اقبالؒ نہایت ہوشیاری، آہستگی اور نرم روی سے روایتی معاملہ بندی اور حسن پرستی سے ہٹ کر سوزِ دل اور معرفتِ نفس کی طرف بڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ بالِ جبریل کی غزلوں میں ثابت کر دیا کہ غزل کا میدان ہرگز ہرگز تنگ و محدود نہیں اقبالؒ اپنی غزل گوئی کے دورِ اول میں جسے ہم داخلی کیفیات کا دور کہہ سکتے ہیں۔ بڑی سرعت کے ساتھ ان مقامات کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ جہاں ان کے رفیقانِ سفر کی نگاہیں بھی نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ چنانچہ بیان کی جس سادگی اور معانی کی جن کیفیتوں کو انہوں نے شعر میں پیش کیا۔ اس کا تاثر ان اشعار میں ملتا ہے ؎

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں
مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

آپ نے دیکھا کہ وہ روایتی معاملہ بندی اور حسن پرستی جس سے اقبالؒ نے غزل کا آغاز کیا تھا۔ وہ پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور اب سوزِ دل اور معرفتِ نفس کی منزل میں داخل ہو گئے ہیں۔ لیکن ابھی ان کے شعر میں وہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ جو شاعر کی انفرادیت کو ملت کی اجتماعیت میں گم کرنے والی ہے ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا !!
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہاں مے خانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا !!
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی !

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا۔

اقبالؒ کی غزلیہ شاعری میں یہ غزل ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد اقبال کی غزل کا وہ دور شروع ہوتا ہے۔ جو تابناک اور درخشندہ ہے۔ اقبالؒ نے ثابت کر دیا کہ غزل محض عورت کے حسن کی توصیف اور اس کے وصال اور فراق کی کیفیتوں کے اظہار ہی کے لئے وقف نہیں۔ بلکہ غزل کی وسعتیں آفاق گیر اور اس کی لطافتیں بے کراں ہیں۔ اور ان کی پیش کش میں شاعر غزل کی چاشنی بھی برقرار رکھ سکتا ہے ؎

یہ پیغام دے گئی مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں!
وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کج کلاہی

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا اور اپنے فکر و فلسفہ کے اظہار کے لئے بھی غزل ہی کے پیرایہ کو منتخب کیا۔ بالِ جبریل کی غزلیات فکر و فن کے اعتبار سے ایک ایسے مقام پر دکھائی دیتی ہیں۔ جہاں شاعر کے شعور پر الہام کا گماں ہونے لگتا ہے ؎

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

یادگار سگریٹ

ڈاکٹر محمد اقبالؒ صاحب ایک بار سیالکوٹ سے ریل گاڑی میں لاہور جا رہے تھے۔ اور شیخ اعجاز احمد بھی اسی ٹرین سے انٹر کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ سمبڑیال پر جب ٹرین ٹھہری تو شیخ صاحب سیکنڈ کلاس میں ڈاکٹر صاحب سے کھانے کے لئے دریافت کرنے کی غرض سے آئے تو اسی ڈبے میں ککے زئی خاندان کے ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ شاعر مشرق ان کے ہمسفر ہیں تو انہوں نے حیرت و مسرت کے ملے جلے انداز میں کہا ''یہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ہیں۔ ان سے میرا تعارف کرا دیجئے۔ ڈاکٹر اقبالؒ صاحب نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ان سے ہاتھ ملایا۔ اور اپنی سگریٹ کی ڈبی کھول کر ایک سگریٹ پیش کی۔ ہمسفر بزرگ نے ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ سے وہ سگریٹ لے لی۔ مگر سگریٹ کو سلگانے کی بجائے جیب میں رکھ لیا۔ ڈاکٹر صاحب کو حیرت ہوئی۔ انہوں نے پوچھا ''کہ آپ نے سگریٹ سلگائی نہیں؟'' وہ صاحب بولے کہ یہ متبرک سگریٹ میرے خاندان میں یادگار کے طور پر محفوظ رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب مسکرائے۔ انہوں نے دوسری سگریٹ دیتے ہوئے فرمایا'' اچھا تو اس سے شوق فرمائیں'' ہم سفر بزرگ نے اس سگریٹ کو بھی جیب میں رکھ لیا۔ ڈاکٹر صاحب متبسم ہو کر چپ ہو گئے۔

اقبالؒ بحیثیتِ شاعر

فیاض احمد مغل
سال دوم

ہمارے ادب اور ہماری معاشرت کی تاریخ میں اقبال کا شمار ان دانایان راز میں ہوگا۔ جو مستقبل کی جھلک دکھاکر فکروعمل کا رُخ نئی سمتوں کی طرف موڑ سکتے ہیں۔ اس سے تو کبھی کسی کو انکار نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہی ان کی ساری شخصیت اور مکمل حیثیت ہے۔ اگر ہم ان کے فلسفے اور پیغام کو نظرانداز کر دیں۔ یا کسی ایسے زمانے کا تصور کرسکیں جب کہ ان کے افکار و میلانات کا کوئی عنصر بھی زندہ نہ رہے گا۔ تو اس حالت میں بھی ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ محض صناع اور شاعر کی حیثیت سے اقبالؒ دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے ساتھ جگہ پا سکتے ہیں۔ افکار و خیالات سے الگ ہو کر اقبال اردو شاعری میں جگہ پا سکتے ہیں۔ افکار و جذبات سے ہٹ کر اقبال نے اردو شاعری میں جو نئے اسالیب نئے انداز سے استعمال کر کے جو نئے آہنگ پیدا کئے ہیں۔ وہ ہماری شاعری کی زبان میں یقیناً اختراعات کا حکم رکھتے ہیں۔ اور مستقل اضافے ہیں۔

شاعر کے لغوی معنی ایک ایسے صاحب شعور کے ہیں جو دوسروں میں شعور پیدا کر سکتا ہو۔ اگر ہم شاعری کی صرف اسی قدر تعریف کریں۔ تو اقبالؒ کے متعلق کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ جو کچھ اس سے پہلے کہا جا چکا ہے۔ وہ اقبالؒ کو صاحب شعور اور شعور آفریں ثابت کرنے کیلئے کافی ہے۔ انہوں نے دُنیا کو نیا شعور آگہی بخشا۔ ان میں زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کا احساس پیدا ہوا اور انہوں نے دوسروں میں بھی اس کا شدید احساس پیدا کیا، لیکن بعض نقادوں کے خیال میں شاعر کی تعریف صرف اس قدر نہیں ہے۔ اس جماعت کا خیال ہے کہ شاعری میں صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا کہا گیا ہے۔ شعر کے دو عناصر ہیں معنی اور صورت، دیکھنا چاہیئے کہ صوری اعتبار سے اقبال کی شاعری کیا درجہ رکھتی ہے۔

اقبالؒ کی اس حیثیت پر نظر ڈالتے وقت ہم کو یہ بات نہیں بھولنا چاہیئے کہ ان کی شاعری کی ابتدا جیساکہ عام طور پر ہوا کرتا ہے، غزل سے ہوئی۔ اور اوّل اوّل داغ کو اپنا استاد منتخب کیا۔ بظاہر یہ کوئی بڑی اہم بات نہیں معلوم ہوتی۔ اور اقبال کے اکثر تنقید نگار ان کی شاعری کے اس واقعے کو اعتنا کے قابل نہیں سمجھتے۔ لیکن ہمارے خیال میں اقبالؒ کی خالص فنکارانہ اہمیت کی بنیاد یہی واقعہ ہے۔ اگر ہم صحیح ذوق کے ساتھ اقبالؒ کا مطالعہ کریں تو کیا نظم میں اور کیا غزل میں، جو کیفیت سب سے زیادہ نمایاں اور مؤثر طور پر محسوس ہوتی ہے۔ وہ وہی ہے ـــــ جسے مجموعی طور پر تغزل کہا جا سکتا ہے۔ ہم کو تو کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اقبال فطرتاً غزل گو تھے۔ اور اتنے بڑے نظم نگر ہونے کے بعد اس کے باوجود بھی وہ غزل گو رہے۔ نظموں میں بھی انہوں نے ایک قسم کی غزل گوئی کی ہے اس کا

ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ان نظموں میں شاید گنتی کے اشعار ایسے نکلیں گے۔ جو فرداً فرداً اپنی جگہ معنی اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے مکمل نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اقبالؒ کی نظموں کے بند کے بند بغیر ارادہ اور کوشش کے زبان پر چڑھ جاتے ہیں اور اکثر شعر اپنے اندر ضرب المثل ہو جانے کی قوی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اچھی شاعری کی ایک زبردست اور لازمی علامت ترنم اور موسیقیت ہے۔ موسیقت سے شاعری کا خمیر ہوا۔ ہر چھوٹے بڑے شاعر کے کلام میں کسی نہ کسی قسم کی موسیقیت ضرور پائی جاتی ہے ورنہ شعر اور نثر کے اثرات برابر ہوں۔ میرؔ سے لے کر داغؔ تک اور داغؔ سے لے کر آج تک ہر شاعر کے ہاں موسیقیت ملے گی۔ اور ہر شاعر کی موسیقیت کا انداز جدا ہوگا۔ اقبالؒ کی شاعری کا بھی ایک غالب عنصر اس کی انفرادی موسیقیت ہے۔ جس کی سب سے نمایاں خصوصیت ہمواری اور بلاغت ہے۔

اس اعتبار سے اردو کا کوئی دوسرا شاعر ان کا پورا حریف نظر نہیں آتا۔ اگر داغؔ ہمواری میں ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں تو بلاغت اور معنوی قدر کا ان کے یہاں پتہ نہیں ہے۔ اگر غالبؔ بلاغت میں اقبالؒ کے ہمسر کہے جا سکتے ہیں تو ان کے کلام کی موسیقیت میں ایسی ہمواری نہ ملے گی۔

اقبالؒ کے اشعار ہماری سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں یا ان کے افکار و نظریات سے ہم کو اتفاق ہو یا نہ ہو۔ لیکن جس خصوصیت کا ان کے حامی اور مخالف دونوں کو قائل ہونا پڑے گا۔ وہ یہ ہے کہ ان کا ایک بھی مصرع ایسا نہیں ہوتا، جو نازک سے نازک ساز پر گایا نہ جا سکتا ہو۔ اور یہ خصوصیت محض غنائی نہیں ہے یعنی وہ محض خوش آہنگ الفاظ کے حسنِ ترتیب سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اقبال کے اشعار میں جو موسیقیت ہوتی ہے وہ ایک مرکب آہنگ ہے۔ جس کو الفاظ و افکار دونوں سے بیک وقت ایک اصلی اور اندرونی تعلق ہوتا ہے اور ہم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ اور معنی باہم مل کر ایک ایسی دھن پیدا کر رہے ہیں جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اقبال کا ترنم کبھی سطحی نہیں ہوتا، بلکہ اس کے اندر تہ بہ تہ گہرائیاں ہوتی ہیں۔

جہاں تک الفاظ اور ترکیبوں کے حسنِ انتخاب کا تعلق ہے۔ اقبالؒ ہمیں جدید شعرائے اردو میں سب سے زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب بحیثیت مجموعی وہی ہے۔ جس کو غزل کا روائتی اسلوب کہہ سکتے ہیں اور جس کا جوہر رومانیت ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم اقبالؒ کے اسلوب کو کلاسیکی اسلوب کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اقبالؒ کا اصل اجتہاد یہ ہے کہ انہوں نے پرانے الفاظ اور فقرات اور پرانے اسالیب و روایات کو بالکل نئے انداز سے استعمال کیا ہے۔ اور ہماری زندگی کی نئی ضرورتوں کے لئے کام میں لائے ہیں۔ چنانچہ اگر ٹھہر کر غور کے ساتھ ان اسلوبوں پر نظر ڈالی جائے۔ تو اقبالؒ کا اسلوب ہمارے اندر ایک ہی وقت میں قدامت اور جدت پختگی اور تازگی دونوں کا ایک مرکب احساس پیدا کرتا ہے۔ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ اور اس کو اقبال کا معمولی اکتساب کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔

ایک گروہ ایسا ہے، جو اقبال پر اعتراض کرتا ہے کہ ان کے وہاں فارسی الفاظ اور ترکیبوں اور ایران و عرب کی تاریخی زندگی سے متعلق روایات و تلمیحات اور ان سے ماخوذ تشبیہات و استعارات کی بھرمار ہے۔ یہ شکایت ایک خاص نقطۂ نظر

سے اور ایک حد تک بجا بھی ہے۔ اقبالؒ کی بڑھی ہوئی فارسیت نے ان کو عوام کا شاعر نہیں ہونے دیا۔ اور اس لحاظ سے وہ یقیناً خسارے میں رہے۔ مگر پھر ایسا مفکر اور ایسا باشعور شاعر عوام کی اور پھر ہندوستان کے عوام کی چیز نہیں ہو سکتا۔ اقبالؒ کی فارسیت سے ان کو صرف اس قدر نقصان پہنچا ہے۔ کہ ان کے سمجھنے والوں اور ان کے پیغام سے موافق یا مخالف اثر قبول کرنے والوں کا دائرہ محدود ہو گیا۔ لیکن اس سے ان کی شاعری کو فائدہ بھی پہنچا۔ ان کے کلام میں ایک حلاوت، ایک متنوع ترنم اور ایک بلیغ خوش آہنگی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ جو داغ یا میر کی سلیس اور عام فہم اور رواں اور سہل زبان کے استعمال سے پیدا ہو سکتی تھی۔ اقبالؒ کی شاعری میں جو صوتی حسن ہے۔ اس کی ترکیب میں جہاں اور بہت سے عناصر داخل ہیں۔ وہاں ایک عنصر فارسی الفاظ کا صحیح اور کامیاب انتخاب اور ان کا قرینے کے ساتھ استعمال بھی ہے۔

اقبالؒ کی فطرت کو موسیقی سے پیدائشی لگاؤ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اشعار گنگنا کر نہیں، بلکہ باقاعدہ گا کر کہا کرتے تھے۔ یہ ایک زبردست اشارہ ہے جس سے ہم ان کے مزاج شعری کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اقبالؒ جیسا مفکر اور پیغامبر نظم لکھنے والا ایسا کامیاب اور اثر انگیز غزل گو بھی رہ سکا یہ بات اس کی دلیل ہے کہ جیسا کہ پہلے اشارتاً کہا جا چکا ہے۔ ان کی اصلی فطرت تغزل اور ان کا اصلی فن غزل تھا۔ ان کا ایک شعر ہے جس سے ان کے اصلی اور ایک حد تک دبے ہوئے میلان کا پتہ چلتا ہے ؎

مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی!

اقبال کی غزلیات اور نظمیات کا شروع سے آخر تک سلسلے اور ترتیب کے ساتھ مطالعہ کیا جائے، تو موسیقیت اور خوش آہنگی کی خصوصیت ان کے وہاں برابر ملے گی۔ البتہ مختلف ادوار میں اس موسیقیت کی گہرائی اور معنویت میں فرق ہوگا ابتدائی دَور میں اقبالؒ کی شاعری میں جو صوتی حسن ہے۔ وہ زیادہ تر بالائی ہے اور اس کا حجم کم ہے۔ رفتہ رفتہ اور درجہ بدرجہ اقبال کی موسیقیت میں گہرائی اور اندرونی کیفیت بڑھتی گئی اور وہ روز بروز ان کے افکار کی طرح زیادہ بلیغ اور زیادہ مستقل ہوتی گئی۔

ہونہار شاگرد

اقبال اپنے استادوں کا بڑا احترام کرتے تھے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ اپنے ایک دوست کے ہمراہ بیٹھے تھے آپ کے استاد سید میر حسن کا گزر ہوا۔ آپ اسی وقت فرطِ محبت میں اٹھے اور جلدی سے جوتی کا ایک پیر وہیں رہ گیا اور سید صاحب کی خدمت میں آداب بجا لائے۔ سید صاحب نے آپ کی طرف غور سے دیکھا تو کہا کہ ایک جوتا کہاں ہے تو آپ نے کہا کہ اگر میں جوتا تلاش کرتا تو آپ سے ملاقات کا یہ شرف کیسے حاصل ہوتا تو سید صاحب نے خدا کا شکر ہے کہ مجھے تم جیسا ہونہار شاگرد ملا ہے۔

اقبالؒ دوسروں کی نظر میں

شیخ سہیل احمد
سال چہارم

علامہ اقبالؒ علم وادب کے لئے مینار نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت بڑی جامع اور پرکشش ہے جو ایک طرف شاعر تو دوسری جانب فلسفی مفکر کی حیثیت سے تسلیم کئے گئے۔ اقبالؒ کی ذات ہماری مسلم قومیت اور تاریخ کے علمی وادبی ورثہ کی تابندہ نشانی ہے۔ اس جامع الصفات شخصیت کو دوسروں کی نظر میں دیکھئے

غیر مسلم شخصیات

۱: "اقبالؒ کے دل میں ہند اور ہند کی سچی محبت جاگزیں تھی۔"

—————— (پارسی) (کیقباد جنگ)

۲: "ڈاکٹر اقبالؒ مرحوم کے بارے میں کیا کہوں لیکن میں اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم "ہندوستاں ہمارا" پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور ھر دوار جیل میں سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے۔

—————— (مہاتما گاندھی)

۳: اقبالؒ کو عام طور پر "شاعر اسلام" ـــ "مفکر اسلام" اور "شاعر مشرق" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بے شک وہ ان میں سب کچھ تھا لیکن میرے خیال میں اقبالؒ کو اس طرح اختصاص ومقامیت میں محدود کر دینا اس کی آفاقیت وعالمگیریت کی تحقیر ہے۔ (پروفیسر اے۔باسانی۔ اٹلی)

———————

۴: "مجھے عمر بھر اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں اقبالؒ جیسے شاعر اعظم کا کلام اردو اور فارسی زبانوں سے ناواقفیت کی وجہ سے اصلی وادبی حسن کے روپ میں نہیں دیکھ سکا۔"

—————— (ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور)

۵: انکی ذات، ذہانت اور ہندوستان کی آزادی سے محبت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے ان کی موت سے ھندوستان ایک چمکدار اور تابندہ ستارے سے محروم ہو گیا لیکن انکی عظیم تخلیں آنے والی نسلوں کے دلوں میں انکی یاد تازہ رکھیں گی۔ اور فیض پہنچاتی رہیں گی۔

—————— جواہر لال نہرو

۶ : اگرچہ اقبالؒ میرے شاگرد ہیں۔ مگر میں ان کی تحریروں سے بہت کچھ سیکھتا ہوں۔

——————— (پروفیسر آرنلڈ)

۷ : ایک مسلم نوجوان لکھتا ہے کہ
" اقبالؒ اس عہد کا مسیح ہے جس نے مردوں کو زندہ کر دیا ہے۔" تم پوچھو گے کہ اس میں کونسی ایسی ظاہری نقش ہے جس نے لوگوں کے دل اپنی طرف کھینچ لئے ہیں ــــ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معجزہ اس قسم کی ظاہری کشش کا مرہونِ منت نہیں۔ جو مبلغوں اور دنیا کو نجات کا پیغام دینے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ یہ اعجاز ایک نظم نے دکھایا ہے۔ جس کے حسن و جمال کے آئینے میں فلسفہ جدید کے اکثر پہلو منعکس نظر آتے ہیں ان میں خیالات کی فراوانی ہے لیکن اسی میں اتحاد پایا جاتا ہے اور اس کی منطق ساری کائنات کیلئے آوازۂ غیب کا حکم رکھتی ہے۔"

(رابرٹ ریڈ)

مسلمان شخصیات

۱ : " اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق ، اس کے سفر کا ہر پر پرواز بالِ جبریل ــــ وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر ہے"

——————— (مولانا سید سلیمان ندوی)

۲ : " دنیائے اسلام میں گزشتہ ایک ہزار سال سے جو مفکر پیدا ہوئے ان میں اقبالؒ کا مرتبہ سب سے بلند ہے اقبالؒ ہمارا قومی شاعر آزادی کا پیامبر اور عظیم المرتبت مفکر جس نے مسلمانوں کو ایک نیا آہنگ دیا۔ نیا راستہ دکھایا۔ پاکستان کا تصور پیش کیا۔

——————— (امیر شکیب ارسلان)

" لوگوں کے طرزِ فکر سے ان کے کردار کے متعلق رائے قائم کرنے میں ہمیں محتاط رہنا چاہیئے۔"

علامہ اقبال کی شاعری اور پیغام

منیزہ اقبال - سال چہارم

علامہ اقبال دنیائے اسلام کے ایک عظیم مفکر، شاعر اور نابغہ ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی عظمت و قبولیت کی وجہ ان کی شاعری ہی ہے دراصل وہ شاعر برائے شعر و ادب نہیں ہیں، بلکہ شاعر برائے زندگی ہیں۔ انہوں نے اس شاعری کو اپنے پیغام کا ذریعہ بنایا اور مکمل فکر و شعر کی زبان میں پیش کیا۔ انہوں نے فلسفیانہ موشگافیوں اور اخلاقی و روحانی مسائل کو محض خشک اور واعظانہ انداز میں پیش نہیں کیا۔ بلکہ ایسا لطیف اظہار بیان اختیار کیا جس کی مثال اردو ادب کی تاریخ میں نہیں ملتی اور اس انداز کی عمارت انہوں نے اپنے خونِ جگر سے استوار کی ہے۔ ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبالؒ نے عہد غلامی میں آنکھیں کھولیں اور دورِ غلامی ہی میں پروان چڑھے لیکن دل سے کبھی غلامی کو قبول نہ کیا ان کے اندر ایک دردمند دل تھا۔ جو اس زبوں حالی پر آنسو بہایا کرتا تھا۔ یہ مسلمانوں کے زوال اور عالم اسلام کی تباہی و خستہ حالی کا دور تھا۔ اسی خستہ حالی و تباہی نے ان کے اندر ایک تڑپ پیدا کر دی۔ جو رفتہ رفتہ پختہ ہوتی گئی۔ اور شاعری کی رت میں نمودار ہونے لگی۔ ان کی شاعری کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دور جس کو قوم پرستی کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس زمانہ میں انہوں نے "ہمالہ"، "ایک آرزو" اور "ترانہ ہندی" جیسی نظمیں لکھیں۔ ان میں اقبالؒ ایک ہندوستانی کے رُوپ میں سامنے آتے ہیں۔ اور ہندو مسلم اتحاد کے داعی دکھائی دیتے ہیں ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

بے شک شعریت کے لحاظ سے ان کی یہ نظمیں عظیم شاہکار ہیں لیکن ان کی ان نظموں میں خیالات کی وہ بلندی و رفعت اور شوکت نہیں جو بعد میں پیدا ہوئی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؒ اپنے افکار کی آبیاری کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں۔ اور ایک ماہر اور نبض شناس مفکر کی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے ہیں۔ اس وطن پرستی اور انگریزی ادب سے شغف نے انہیں نیچر کی طرف لا کھڑا کیا ہے۔ اور وہ فطرت کی رنگینیوں میں محو ہو جاتے ہیں تو ان پر دنیا کی بے ثباتی کا راز منکشف ہونے لگتا ہے ؎

ۓ دُنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

دوسرا دَور اُن کے سفر یورپ کا ہے۔ اس دور میں انہوں نے یورپ کی قوم پرستی، مذہب بیزاری اور یورپ کے اخلاقی، معاشی اور سماجی پہلوؤں کا مطالعہ و مشاہدہ کیا۔ ان مشاہدات و تجربات نے اقبالؒ کے نقطۂ نظر میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اسی دور میں تہذیبِ مغرب کے کھوکھلے پن کا ان پر انکشاف ہوا ۓ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس انکشاف کے بعد وہ مشرق و مغرب سے منہ موڑ کر سوئے حجاز روانہ ہو جاتے ہیں تو سکونِ قلب محسوس کرتے ہیں مذہو خوض میں ڈوبتے ہیں تو دُنیائے اسلام کو نفسا نفسی کے عالم میں پاتے ہیں۔ اس پر ان کا دل درد کی پکار بن جاتا ہے، درد سوز و گداز اور غم و الم ان کی زندگی کا سرمایہ بن جاتا ہے۔ یہی سرمایہ لے کر ہندوستان لوٹتے ہیں تو پیامی شاعر بن کر ابھرتے ہیں۔ ان کی شاعری مقصدی شاعر کا روپ دھار لیتی ہے وہ مایوسی کے عمیق گڑھے سے باہر نکل آتے ہیں۔ انہیں ایک منزل مل جاتی ہے۔ سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی منزل ـــ وہ اس کے تنِ مردہ میں روح پھونکنے کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیتے ہیں تاکہ اس کی مردہ رگوں میں خون کی حرارت پیدا ہو جائے اور طاؤس و رباب سے کھیلنے والی قوم پھر شمشیر و سناں کی طرف پلٹ آئے وہ خودی اور زندہ دلی کے نغمے گانے لگتے ہیں اور ان کے طرزِ بیان میں درد و سوز، روانی و رفعت، ترنم و موسیقیت، بندش کی چستی اور تراکیب کا حسن آ جاتا ہے۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا ستارہ کیا غروب ہوا۔ ملتِ اسلامیہ ہند کے مقدر کا ستارہ ہی ڈوب گیا، سرسید نے قوم کو جھنجھوڑا، حالی نے عہدِ گزشتہ کی داستانیں سنائیں، اکبر نے قوم کو مغربی رو میں بہہ جانے سے روکنے کی سعی کی، لیکن قدرت نے یہ سعادت اقبالؒ کے لئے رکھی تھی کہ وہ اس سیلاب کا رُخ موڑ دیں۔ انہوں نے یاس و قنوطیت کے جمود کو توڑا، خودی و خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا۔ انہوں نے قوم کو آگاہ کیا۔ کہ تقلیدِ مغرب بیکار اور رسوا کُن ہے۔ اس میں عریانی اور بے حیائی، بے کاری اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔ انہیں نوجوانوں کی تن آسانی خون کے آنسو رُلاتی ہے ۓ

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدریؓ تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

انہیں اس بات کا علم ہے کہ عیش و عشرت قوموں کے حق میں زہرِ قاتل ہے۔ یہ اقوام کے اعضاء کو کمزور اور مضمحل بنا دیتی ہے عشرت پسند قومیں اپنا دبدبہ اور شوکت کھو دیتی ہیں وہ جوانوں میں چیتے کا جگر اور شاہین کا سا تجسس چاہتے ہیں۔

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

قومیں اتفاق اور اتحاد سے ابھرتی ہیں، لیکن اقبالؒ نے مسلمانوں کو نفاق میں ڈوبے ہوئے پایا جو غیروں کے کاسہ لیس ہیں۔ وہ انہیں مالا کے دانوں کی طرح ایک لڑی میں پرونا چاہتے ہیں وہ انہیں لامرکزیت سے مرکزیت کی طرف لانا چاہتے ہیں۔ اقبالؒ نے مسلمانوں کو صاف صاف بتا دیا کہ ان کی نجات صرف اسلام کی پیروی میں ہے اگر دین نہیں ہے تو تو بھی نہیں ہے۔ اور ان کے لئے بندۂ مومن کا تصور پیش کیا اور ان کی عظمت کو یوں اجاگر کیا

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

" آج کل بعض سخن سنج اقبالؒ کے کلام کا مقابلہ ہندوستان کے ایک دوسرے نامور اور فخرِ ہندوستان شاعر ٹیگور کے کلام سے کرتے ہیں۔ ٹیگور کے کلام میں بے شک پریم کا رس بلا ہوا ہے۔ اس کی محبت عالمگیر ہے۔ وہ تمام کائنات کو اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہے۔ اس کی نظمیں پڑھ کر دل کو تسکین اور روح میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں وہ آگ نہیں۔ جو اقبالؒ میں ہے۔ ٹیگور کے کلام میں نسائیت کا شائبہ پایا جاتا ہے اور اقبالؒ میں مردانہ پن۔ ٹیگور کا جذبہ محبت بہت گہرا اور بے تھاہ ہے۔ لیکن وہ اپنے حدود کو توڑ کر کبھی آگے نہیں نکل جاتا ہے۔ اور باوجود کیف و وجد کے آپے سے باہر نہیں ہونے پاتا۔ اقبالؒ کا مطمعٔ نظر اگرچہ مقابلتہً محدود ہے۔ مگر زیادہ قوی، زیادہ پُر زور اور زیادہ شور انگیز ہے۔"

(اقبال از عبدالحق مجلسِ ترقیٔ ادب)

" اگر وہ خیالات جو میری روح کی گہرائیوں میں طوفان بپا کئے ہوئے ہیں۔ عوام پر ظاہر ہو جائیں تو پھر مجھے یقین واثق ہے کہ میری موت کے بعد میری پرستش ہوگی۔ دنیا میرے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گی۔ اور مجھے اپنے آنسوؤں کا خراج عقیدت پیش کرے گی۔"

(اقبالؒ کا خط بنام عطیہ فیضی)

عامر مقصود
رولنمبر ۵۰۴ سال اوّل

اقبال کی نظموں میں اس کی نظم "مسجد قرطبہ" جدید اردو ادب کا شاہکار ہے اس میں شاعر نے ایمائی اثر آفرینی سے ایک طلسم سا پیدا کر دیا ہے۔ اس میں آرٹ، تاریخ اور فلسفہ ایسے موضوع خوش اسلوبی سے سموئے گئے ہیں کہ انسانی ذہن لطف اندوز ہوتا ہے اور داد دیتا ہے۔

"مسجد قرطبہ" ایک جلیل القدر۔ قوم کی جفاکشی، جاں بازی، مہم جوئی اور بلند خیالی کی زندہ تصویر ہے معلوم ہوتا ہے۔ سنگ و خشت کے ذریعے کسی نے اپنے سوزِ دل کو ظاہر کیا ہے۔ یہ نظم فکری اور فنی لحاظ سے اقبال کی اہم ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اقبال کی دوسری مشہور نظموں کی طرح اس کا بھی ایک خاص ذہنی پس منظر ہے۔ اقبال ۳۲-۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان گئے۔ اس سفر کے بعض تاثرات کا گہرا عکس اس نظم میں نظر آتا ہے۔ انگلستان سے واپسی پر اقبال بہت سے اسلامی ملکوں کی سیر کرتے ہوئے آئے جن میں ہسپانیہ کا سفر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ دُعا، مسجد قرطبہ، اور ہسپانیہ جیسی لازوال نظمیں اسی سفر کی یادگار ہیں۔

"مسجد قرطبہ" دریائے کبیر کے کنارے واقع ہے۔ شاعر اس دریا کے کنارے ایک خواب دیکھتا ہے۔ اس خواب کی تعبیر وہ صاف صاف بیان نہیں کرتا۔ اس لئے وہ جانتا ہے اگر وہ صاف صاف کہے گا تو اسے مجذوب کی بڑ سمجھیں گے۔ خصوصاً اہل مغرب ان مجذوبانہ باتوں کو سن کر پریشان ہو جائیں گے۔ وہ دن دور نہیں جب دوسرے بھی اسے دیکھ لیں گے۔ پردۂ تقدیر میں جو نیا عالم مضمر ہے اس کی سحر صرف اب تک شاعر کی آنکھوں میں بے حجاب ہوتی ہے۔ اس جذب و کیف کے عالم میں شاعر خواب دیکھتا ہے۔ وہ حقیقت ہے۔ اور اس حقیقت پر اس کا پورا ایمان ہے۔ اقبال فرماتے ہیں: ؎

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی!
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

موضوع کے اعتبار سے مسجد قرطبہ کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ یہ اقبال کے فلسفۂ حیات کے تین اہم پہلوؤں کی حسین تعبیر اور تفسیر ہے۔ ان میں سے ایک پہلو زمان و مکان کے متعلق ان کا تصور ہے۔ دوسرا پہلو

فن کے متعلق اور تیسرے عشق کے بارے ان کے نظریات کی وضاحت ہے۔
مسجد قرطبہ کے پہلے بند میں اقبال اس خود ساختہ وقت یا زمانِ مسلسل کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

سلسلہ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنے قبائے صفات
سلسلہ روز و شب ، ساز ازل کی فغاں!
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

اس شاعرانہ تعبیر کے بعد زمان مسلسل کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات
اول و آخر فنا ، باطن و ظاہر فنا !
نقش کہن ہو کہ نو ، منزلِ آخر فنا ! !

علامہ کے ہاں عشق یا وجدان ایک بہت اعلیٰ صفت کا نام ہے۔ اقبال کے ہاں عشق یا وجدان ایک ہزار شیوہ حقیقت ہے۔ جس کے بے شمار پہلو ہیں۔ اس کے مظاہر گوناگونی کی کوئی حد نہیں۔ یہ وہ ذاتی اور انفرادی جوہر ہے جو راہ کی تمام مشکلات کو طے کرکے انسانی خودی کی ترتیب اور تشکیل کرتا ہے۔ عشق محض ایک جذباتی تاثر نہیں۔ یہ تاثر بصیرت سے ہم آغوش ہے۔ اس کی بدولت انسان رموز وجود سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

اقبالؒ نے عشق کا یہ تصور اپنی شاعری میں جا بجا پیش کیا ہے۔ "مسجد قرطبہ" کے دوام کا راز بھی وہ اسی جذبے کو بتاتے ہیں۔ چونکہ "مردِ کامل" کا عمل عشق سے "صاحب فروغ" ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی تخلیق لازوال بن جاتی ہے۔ عشق کی فضیلت کے وہ دل سے قائل تھے۔ فرماتے ہیں :

عشق دم جبریل، عشق دلِ مصطفےٰ !
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام !
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات!
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نار حیات
اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

اقبال کے تصور عشق کے ساتھ ہی ان کے فلسفے کا ایک اور اہم پہلو ہمارے سامنے آ جاتا ہے اور وہ ہے اقبال کا تصور مردِ مومن یا تصور انسان کامل، اقبالؒ انسان کی عظمت اور فضیلت کے دل سے قائل ہیں۔ ان کے

نزدیک انسان ہی وہ مخلوق ہے جو زمین پر خدا کے نائب کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ اقبال کے مردِ مومن کی قوت رُوحانی ہے اور وہ غیر کی پابند ہے۔ اقبالؒ کے ہاں انسانِ کامل کا نصب العین یہ ہے کہ اس کی ذات میں جلال اور جمال کی موزوں ترکیب موجود ہو اور وہ سوز و سازِ زندگی کا رمز شناس ہو۔ مسجد قرطبہ میں ایک جگہ یہ تصوّر اس طرح پیش کیا ہے ؂

تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل

اقبالؒ کے نزدیک اس مردِ مومن نے جب اپنے عمل اور عشق کی قوتوں کو یکجا کیا تو فن کا ایک نادر اور لازوال نمونہ مسجد قرطبہ سامنے آیا۔ فن تعمیر کا یہ نادر نمونہ جلال اور جمال کی صفات کا حسین امتزاج ہے۔ مسجدِ قرطبہ میں جب وہ معجزہ ہائے ہنر کو فانی اور باطل قرار دیتے ہیں۔ تو ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ وہ نقوش لازوال اور ابدی ہوتے ہیں، جن کی تعمیر میں جذبہ اور خلوص کار فرما ہوں۔

اقبال کے فلسفہ میں انقلاب اور اصول حرکیت کو بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ ان کے نزدیک خودی کے ارتقاء کے لئے اور انقلاب سے دوچار ہونا ضروری ہے۔ مسجد قرطبہ میں بھی وہ اپنے اس نظریئے کو پیش کرتے ہیں۔ یورپ کے مختلف انقلابیوں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد وہ اس متوقع انقلاب کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!

"مسجد قرطبہ" جس طرح موضوع کے اعتبار سے اقبالؒ کی بڑی اہم نظم ہے اسی طرح فن کے اعتبار سے بھی اس کا مقام بہت بلند ہے۔ اس نظم میں اقبال کی شخصیت کے شاعرانہ اور حکیمانہ دونوں پہلو اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ ان کو کہیں بھی الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اقبالؒ کی نظموں میں مسجد قرطبہ میں بھی جلال و جمال اور شکوہ و وقار کی یہ خصوصیت اوّل سے آخر تک موجود ہے فنی نقطۂ نظر سے تاثر کی وحدت اس نظم کی امتیازی خصوصیت ہے پوری نظم ربط اور تسلسل کی ایک مکمل اور مضبوط زنجیر ہے۔ اس نظم کے سارے تصورات ایک طرف تو مسجد کی جلالی و جمالی فضا سے ابھرتے ہیں۔

اس نظم کی فنی صناعی اور فکری تعمیر کو اقبالؒ نے مسجد قرطبہ کی صناعی اور حسنِ تعمیر کو جس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے وہ ہمارے ادب میں فکر کے داخلی اور خارجی امتزاج کی نایاب مثال ہے۔ اقبالؒ ہر لفظ کو اس مصرعوں میں رکھتے گئے ہیں۔ جس طرح ایک ماہر معمار ایک پتھر کے بعد دوسرا پتھر چُنتا چلا جاتا ہے اور ہر نئے پتھر کے ساتھ تعمیر کی بلندی بڑھتی جاتی ہے۔

نظم کا لہجہ پہلے ہی مصرعے سے بڑا پُروقار اور بھاری بھر کم ہے۔ انداز بیاں میں ایک ایسا توازن ہے، جو ہر جگہ موضوع سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ انداز بیاں کی یہ سنجیدگی قاری کو موضوع کی اہمیت اور اس کی

ھت کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ نظم کے اس حصے میں جہاں نظم کی ظاہر شباہت کا ذکر ہے۔ اقبالؒ نے سنگ تراشی کا کام لیا ہے :

تیری بنا پائیدار ، تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل !
تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور !
تیرا منارِ بلند جلوہ گہ جبرائیل

مسجد قرطبہ کی ایک اہم خوبی جس کا احساس مطالعہ کرتے وقت متواتر ذہن پر چھایا رہتا ہے وہ نظم کی موسیقی اور الفاظ کے ترنم کا زیر و بم ہے ۔

دھیمی دھیمی موسیقی اس نظم میں پس منظر کا کام دے رہی ہے۔ جس کی لے موضوع کی مناسبت سے کبھی کبھی تیز ہو جاتی ہے۔ یہ صوتی آہنگ پیدا کرنے کے لئے اقبالؒ نے تکرار کے مختلف ذریعے اختیار کرلئے ہیں اور اسی تکرار میں اس کی غنائی کیفیت کا راز ہے ۔

" مسجد قرطبہ " کے اس مختصر مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ اپنے افکار و خیالات کی بلندیوں میں بھی اقبالؒ نے فنی تقاضوں سے چشم پوشی نہیں کی ، بلکہ ان کا پورا پورا خیال رکھا ہے ۔

اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں۔ اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سر نو جمع ہو جائیگی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا ۔ قرآن مجید کی ایک ہنایت معنی خیز آیت یہ ہے " کہ ہمارے نزدیک ایک پوری ملت کی موت و حیات کا سوال ایسا ہے ۔ جیسے ایک نفس واحد کا
(حرف اقبالؒ)

موجودہ نازک حالات سے تدارک کے لئے ہماری ملت کو مستقبل قریب ہی میں آزادانہ جد و جہد کرنی پڑے گی۔ لیکن کسی سیاسی طرزِ عمل کے لئے آزادانہ جد و جہد کرنا اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے۔ جب پوری قوم اس پر آمادہ ہو ۔ اور ان کے تمام عزائم اور ارادے ایک ہی مقصد پر مرتکز ہو جائیں ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم لوگوں کے اندر بھی وہ اشتراک عزم پیدا ہو جائے جس کا از خود نشو و نما ہوتا ہے۔ کیوں نہیں فرقہ بندی کی ہوس اور نفسانیت کی قیود سے آزاد ہو جائیں ۔ اس نصب العین کی روشنی میں جو آپ کی طرف منسوب ہے ۔ اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجئے۔ خواہ وہ مادی اغراض ہی سے متعلق کیوں نہ ہوں۔ (اقبال)

(حرفِ اقبالؒ)

اقبالؒ ـــ اور ـــ اتحادِ ملّی

مقبول احمد
سالِ دوم (پری انجینئرنگ)

حکیم الامت علامہ اقبالؒ زمانۂ حال کی ایک ایسی ہستی ہیں جن کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ ایک بہت بڑے فلسفی شاعر تھے۔ ان کی شہرت پاک و ہند سے نکل کر افغانستان، ایران، یورپ اور امریکہ تک پہنچی۔ آپ نے اہلِ پاک و ہند خاص طور پر مسلمانوں کو اپنی شاعری کے ذریعے خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ اور مستقبل میں پیدا ہونے والے حالات کی بھی نشاندہی کی۔

اقبالؒ فلسفۂ حیات کے گہرے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اسلام ہے۔ اور حاملِ اسلام ہونے کی حیثیت سے ملتِ اسلامیہ زندگی کی متاعِ گراں مایہ ہے۔ اسلامی اقدار ہی اس کے نزدیک پائیدار، اٹل اور لازوال ہیں۔ اسلام ہی ناموسِ اسلامی کا بلحاظِ شرفِ آدم کا کفیل اور سعادتِ حیات کا ضامن ہے اسلام ہی زندگی کا وہ حل پیش کرتا ہے جو آہنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی کراہنے اور سسکنے والی روحِ انسانی کو پنجۂ ہلاکت سے نکال کر تمام عالمِ اسلامی کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے امکانات رکھتا ہے۔ اسلامی اقتدار کا احیاء اس کے نزدیک انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ چنانچہ اس نے تمام زندگی اس مقصد کے حصول پر لگا دی۔ اقبالؒ کی زندگی کا اصل مقصد صرف قوم اور ملک کی اصلاح تھا جس کے لئے انہوں نے شاعری کو ایک ذریعہ بنایا انہوں نے عام رسمی شاعری سے بے تعلقی کا اعلان بار بار کیا ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اقبالؒ ایک سوچنے والے دماغ کے مالک تھے۔ ان کے سامنے وہ منظر موجود تھا۔ جہاں مشرق اور مغرب کے معرکے آگرے۔ یورپ کے اندر ایک نیا شعور نئی تحریکات کے ساتھ پیدا ہو رہا تھا۔ زندگی کی روحانی تعبیریں اور اسی کے واسطے حیات کی اخلاقی قدریں مادی زندگی کی نئی تعبیروں کے نیچے دب کر رہ گئی تھیں۔ مسلمان تباہی کے غار میں پڑے غلامی کی زندگی گزار رہے تھے۔

اس عالمِ حسرت و یاس میں اقبالؒ کے قلب پر اسلامی زندگی کے روشن باب کشادہ ہوئے ان کی طبیعت کو اسرارِ خودی کی جلوہ فرمائی نے جلا بخشی۔ اقبالؒ کا فلسفۂ خودی اسی الہامی اندازِ فکر کا آئینہ ہے اس نے خوابِ غفلت میں ڈوبے ہوئے ناکارہ انسان کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے سے ظلمت و جہالت کے پردے اٹھائے۔

اقبالؒ فن برائے فن کا قائل نہیں، بلکہ فن برائے زندگی چاہتا ہے۔ وہ تصور جو زندگی کو کمزور کرے۔ اس کے نزدیک نامقبول اور بے حقیقت ہے۔ حقیقی آرٹ وہی ہے جو حیات افروز ہو ولولہ انگیز ہو۔ جو سوزِ حیات کو دوبالا کرے ذوقِ جستجو بڑھائے، چنگاری کو شعلۂ سوزاں، ذرّے کو آفتاب اور قطرے کو قلزم بنا دے۔

اقبالؒ کا آرٹ غیر فانی اور لازوال ہے۔ وہ اس کے ذریعے بنی نوعِ انسان کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور اولادِ آدم کی عظمت کو قائم کرنا اس کا اعلیٰ نصب العین ہے۔ چنانچہ علامہ نے قوموں کے عروج و زوال کی داستان کا مطالعہ نہایت حکیمانہ انداز سے کیا۔ امتِ مرحوم کی پسماندگی اور تباہ حالی اس کے لئے خاص طور پر شرم کا مقام ہے۔ اس کی اس حالتِ زار پر اس نے خون کے آنسو بہائے۔ اور اس کے خاکستر سے ایک نئی قوم پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

قوم کا درد رکھنے والے نوجوان نے جب اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو فوراً ہی قوم کی زبوں حالی کی وجہ معلوم کر لی۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے سیاسی زوال کا ایک بہت بڑا سبب ان کا آپس کا اختلاف اور نفاق ہے جس سے ان کے مخالفین نے فائدہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ اسلامی حکومتیں خودغرض مغربی طاقتوں کے قبضہ اور اقتدار میں آگئیں افتراق کے جھگڑ اس دور سے چلے کہ ملت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اسلام بنی نوعِ انسان کی گروہ بندیوں کو دُور کرنے اور عالمِ انسانی کو متحد کرنے آیا تھا۔

مسلمان جو وحدت و اخوتِ انسانی کے حامل تھے۔ وہ خود دردناک حالات کا شکار ہو گئے۔ اپنوں اور بیگانوں نے مل کر ردائے دین و ملت کو چاک چاک کر دیا۔ اغیار کے ہتھکنڈوں کی وجہ سے مسلمانوں کے اتفاق کی لڑی ٹوٹ گئی۔ اور موتی بکھر گئے۔ انہوں نے اپنے قیمتی اصول چھوڑ دیئے۔ اور دوسروں نے ان کو اپنا لیا ؎

قافلہ تیرا رواں بے منتِ بانگِ درا
گوشِ انساں سن نہیں سکتا تری آوازِ پا
گھٹنے بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہے تو!
ہے وطن تیرا کدھر؟ کس دیس کو جاتا ہے تو

پھر فرمایا: ؎

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کیلئے

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اسلام نے کروڑوں انسانوں کو اپنی آغوشِ تربیت میں لیا۔ اور نسل و خون کی تفریق، ملک و قوم کے اختلاف، امیر و غریب کے امتیازات، فاتح و مفتوح کے فرق، زبان اور رنگتوں کے تفاوت کے باوجود ایک بنا دیا۔ جیسے برِصغیر پاک و ہند کی اسلامی تعمیرات میں مسلمانوں کے جاہ و جلال کے نقوش ثبت ہیں۔ اسی طرح ہسپانیہ کی عمارات بھی ان کے جاہ و جلال کی شاہد ہیں۔ اندلس میں مسلمان ساڑھے سات سو برس فرمانروا رہے اور یورپ کے ظلمت کدہ میں علم و حکمت کے چراغ روشن کئے۔

قرطبہ اور طلیطلہ کی عربی درسگاہوں ہی میں یونانی علوم کے بجھتے ہوئے انگارے جمع کر کے محفوظ کئے گئے تھے قرطبہ ہی کی دانش و محنت سے دورِ حاضر کی بیشتر و مفید اہم ایجادات کے راستے ہموار ہوئے اور ان کی ہمہ گیر اشاعت کے دروازے کھلے۔

لیکن افسوس مسلمانوں کا یہ عروج زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ اندلس سے عرب نکلے تو ہسپانیوں نے ان کے وہ نقوش چھیل ڈالے۔ جو صدیوں کی حکمرانی سے وہاں جمائے گئے تھے۔ بیشتر علمی ذخائر اور عالی شان کتب خانے اسی بناء پر نذرِ آتش کر دیئے گئے کہ ان کی وجہ سے حکمرانِ ہسپانیہ کے خیال کے مطابق مسیحیت کی اشاعت میں رکاوٹیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ مسلمانوں کی نادر روزگار عمارتیں جلا دی گئیں۔ یا ان کے خدوخال بگاڑ دیئے گئے۔ تاکہ کسی کو یہ نہ معلوم ہو سکے کہ مسلمان صدیوں تک اندلس پر حکومت کرتے رہے۔

لیکن آہ! مسلمان اپنی اس قیمتی دولت کو دوسری ظالم اقوام کے ہاتھوں لٹا بیٹھے۔ حالانکہ یہ وہ قوم تھی۔ جسے کوئی زیر نہیں کر سکتا تھا جس کا محافظ "قرآنِ حکیم" تھا۔ جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے اٹھایا تھا۔ اور پھر رسولِ اکرم نے اپنے آخری خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا۔ "اے مسلمانو! میں تمہارے درمیان کتاب و سنت چھوڑے جا رہا ہوں۔ کہ اگر تم اس کو مضبوطی سے تھام لو تو کبھی نہیں بھٹک سکو گے"۔ لیکن کیا مسلمانوں نے اپنے ہادیٔ کامل کے اس اصول کا جواب نفی نہیں دیا۔ کیونکہ اگر مسلمان آنحضرت کے بتائے ہوئے احکام پر عمل پیرا ہوتے تو وہ کبھی دوسری قوموں کی نقل نہ کرتے، انہوں نے اس قوم کی نقل کی جو راستے سے بھٹک چکی تھی۔ اور قیامت تک بھٹکی رہے گی۔ مسلمانوں نے اپنے اسلامی اصول چھوڑ دیئے۔ اور تنزل کی گھاٹیوں کی طرف رواں ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیگر اقوام نے اپنے قدم جمانے شروع کئے اور مسلمانوں کو ایسا زیر کیا کہ ان کو یہ احساس بھی نہ ہوا کہ ہم نے اپنے سرمایۂ حیات کو جسے ہمارے آباؤ اجداد نے خون پسینہ ایک کر کے حاصل کیا تھا۔ اپنے ہاتھوں دوسری قوموں کے سپرد کر دیا ہے۔

ان حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اقبالؒ نے اپنی شاعری کو سیاسی حالات اور جذبۂ حب الوطنی کے سانچے میں ڈھالا اور نیند کے ماتے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا: ؎

کبھی اے نوجوانِ مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟!!
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سردارا
تمدن آفریں، خلاقِ آئینِ جہانداری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا!
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہانبان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں

مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

اور اس زبوں حالی سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اتحاد بین المسلمین، یہی نقطہ اقبالؒ کی شاعری کا مرکز ہے فرماتے ہیں : ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

وہ رنگ و نسل کے امتیازات کو اسلام کے فروغ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں ؎

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے

تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی!

تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

جب تک مسلمان مغربی قوم پرستی کے جھوٹے تصور سے الگ نہ ہوں گے۔ وہ کبھی بھی اقوامِ عالم میں سر بلند نہ ہو سکیں گے تازہ ترین واقعات اقبالؒ کے فکر کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں عربوں نے اسرائیل کے خلاف صرف عرب قومیت کے نام پر جنگ لڑی اور اس کا جو انجام ہوا وہ سب پر عیاں ہے۔

لہٰذا اتحادِ اسلامی کے لئے اقبالؒ جو کوششیں کرتے رہے ان کی اہمیت موجودہ دور میں اور بھی بڑھ جاتی ہے اقبالؒ کا یہ دعویٰ بے جا نہیں ؎

نغمہ کجا و من کجا، سازِ سخن بہانہ ایست

سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را!!

موجودہ دور میں اتحاد بین المسلمین کی اور شدت سے ضرورت ہے۔ کیونکہ تمام سوشلسٹ قوتیں اسلام کو مٹانے کے درپے ہیں۔ اس دور میں اگر کوئی مسلم ریاست الگ تھلگ رہے گی تو اس کی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔ کیونکہ ؎

فردِ قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

مسلمانوں کو چاہیئے کہ غیر مسلموں کی مدد پر بھروسہ نہ کریں، بلکہ اپنے ملک و ملت اور دین کی بقا کے لئے اقبالؒ..... قائم رکھیں۔ تاکہ ہمارے آہنی ارادے کی بدولت قوم کو تلوار کی ضرورت نہ پڑے اقبالؒ قومی اور ملی استحکام مثالوں سے واضح کرتے ہیں ؎

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ

ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

دیکھو تمہارے

بستر سے

ہوا محقہ

مرغزار

شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے!
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

آج دُنیا بھر کے سربراہ عالمی برادری کے طلب گار ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ جب تک عالمگیر پیمانہ پر ایک اخوت قائم نہیں ہوتی ۔ ہمارے دکھوں کا علاج نہیں ہو سکے گا۔ اب یہ ثابت کرنا مسلمانوں کا کام ہے کہ اسلام نے اس برادری کو چودہ صدی قبل قائم کر کے دکھا دیا، یہ وہ برادری ہے جس میں کالے گورے، شرقی و غربی اور امیر و غریب سب کے لئے برابر کی گنجائش ہے ؎

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی، نہ افغانی

جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے ۔ جو شخص جماعت سے کٹ گیا وہ آگ میں ڈالا جائے گا۔ ہر قوم کی مرکز سے جدائی اس کی موت کی پیش خیمہ ہوتی ہے ۔ جس قوم و ملت میں اتحاد نہ ہوگا کبھی غالب نہیں رہ سکتی، بلکہ منتشر قوم ہمیشہ مغلوب ہو کر رہتی ہے ۔

مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ کے فکر کا دائرہ بہت وسیع ہے انہوں نے تقریباً ان تمام اہم مسائل پر غور کیا جو اس عہد کو در پیش ہیں۔ تقریباً تمام ہمعصر سیاسی، معاشی اور عمرانی نظریات اور ادارے ان کا موضوع رہے ہیں، چنانچہ موجودہ کشمکش کے دونوں فریقوں یعنی مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت اور اشتراکیت پر بھی انہوں نے مفصل طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔

"دُنیا کے لئے آج کل نسل ہی سب کچھ ہے ۔ میں اس قسم کے نظریہ کو موجودہ تہذیب پر سب سے بدنما داغ سمجھتا ہوں مجھے ڈر ہے کہ اگر کہیں ایشیا میں بھی نسلی سوال پیدا ہو گیا تو یہ بہت خطرناک نتائج کا باعث ہوگا ۔ مذہبی لحاظ سے اسلام کی سب سے بڑی کوشش اسی مسئلہ کو حل کرنا ہے ۔ اور اگر موجودہ ایشیائی ممالک تباہ حالی سے بچنا چاہتے ہیں تو صرف یہی ایک طریقہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظریوں کو نسلی امتیازات مٹا کر انسانیت کے عام مفاد کو پیش نظر رکھیں ۔"

'اقبال'
(حرفِ اقبالؒ)

اقبالؒ اور نژادِ نو

ناصر علی عابدؔ۔ سال دوم

صفحۂ ہستی پر کسی بھی قوم کا عروج و زوال اس کی نوجوان نسل سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہی طبقہ اپنے فکر و عمل کی بدولت قوم کی شریانوں میں تازہ خون بن کر گردش کرتا ہے۔ جذبوں میں ڈھل کر متحرک قیادت کا روپ دھار لیتا ہے۔ اور اپنے کردار کی روشنی سے تہذیبی روایات کو تابندگی بخشتا ہے۔ حکیم الامتؒ نوجوانانِ ملت کی قوتوں سے غافل نہیں تھے۔ انہیں بخوبی احساس تھا کہ قوم کی عروقِ مردہ میں خونِ زندگی کی گردش کا انحصار اسی نسل پر ہے۔ فرماتے ہیں :

؎ عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

؎ افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں، مردِ قلندر کی نظر سے

اور پھر یہ خواہش کہ ؎

اگر جوان ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری میری کم کچھ سکندری سے نہیں!

اقبالؒ نوجوانوں کو ایک شاہین سے تشبیہ دیتے ہیں اور اسے مردِ مومن بننے کی تلقین فرماتے ہیں۔ شاہین کا کام ہر وقت پرواز کرنا ہے۔ مردِ مومن اس جہان رنگ و بو میں رہ کر بھی اپنے اصل مقصد سے پہلو تہی نہیں کرتا۔ وہ فرد کو عشق کا غلام بناتا ہے۔ تاکہ عرش اور فرش کی لامتناہی دوریوں کو ایک ہی جست میں تمام کر دے اقبال یہ دونوں خوبیاں نوجوان میں دیکھنا چاہتے تھے۔

اس بات کا اظہار جسٹس جاوید اقبال کے اس مضمون سے واضح ہو جاتا ہے جو انہوں نے "اقبالؒ..... میرا باپ" کے عنوان سے لکھا ہے۔ فرماتے ہیں :

"صبح طلوع آفتاب سے پیشتر مجھے علی بخش نے آکر جھنجھوڑا اور چیختے ہوئے کہا" جاؤ دیکھو تمہارے ابا جان کو کیا ہو گیا ہے۔" نیند یک دم میری آنکھوں سے کافور ہو گئی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ میں اپنے بستر سے اس خیال سے نکلا کہ جا کر دیکھوں تو سہی انہیں کیا ہو گیا ہے، جب میں اپنے کمرے سے گزرتا ہوا ملحقہ

کمرے میں گیا تو میری بہن منیرہ تخت پر اکیلی بیٹھی اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے رو رہی تھی مجھے ابا جان کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر وہ میری طرف لپکی اور میرے بازو سے چمٹ گئی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے ہم دونوں انکے کمرے کے دروازے تک پہنچ کر رک سے گئے۔ مجھے منیرہ کی ہچکیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی مگر میں کوشش کے باوجود بھی نہ رو سکا تھا۔ مجھے خوف تھا۔ اگر میں رو دیا تو وہ ابھی اٹھ کھڑے ہوں گے، اپنی انگلی کے اشارے سے قریب آنے کو کہیں گے اور جب ہم ان کے قریب پہنچ جائیں گے تو وہ اپنے ایک پہلو میں مجھے اور دوسرے پہلو میں منیرہ کو بٹھالیں گے۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ پیار سے ہمارے کندھوں پر رکھ کر قدرے کر ختگی سے مجھ سے کہیں گے۔

"تمہیں یوں نہ رونا چاہیئے، یاد رکھو تم مرد ہو اور مرد کبھی رویا نہیں کرتے"

برسوں کی غلامی نے پوری قوم کی قوتِ فکر سلب کرلی تھی۔ اسلاف کی روایات سے غفلت نے یہ ثمر دکھایا کہ نسل نو کا رشتہ اس اعصابی مرکز سے کٹ کر رہ گیا۔ جو ذہنی تعمیر کی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ پھر نوجوان نسل اور پرانی نسل میں جنریشن گیپ (GENRATION GAP) بڑھتا گیا۔ دونوں کے درمیان ذہنی اور نظریاتی اختلاف شب فراق کی طرح بڑھتا چلا گیا۔ اب وہ وقت ہے کہ نئی نسل اپنا تعلق پرانی نسل سے جوڑتے ہوئے گھبراتی ہے۔

جہاں ہمارے آباؤ اجداد دین حق پر فدا تھے وہاں ہماری موجودہ نسل اس دین محمدی سے بیزار ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد مشرقی تہذیب کو اپنا زیور سمجھتے تھے۔ جب کہ موجودہ نسل اس کو اپنے لئے باعث ذلت تصور کرتی ہے۔ یہ تضاد سابقہ صدی سے شدید صورت اختیار کر گیا ہے۔ اقبال نے اس زرخیز فتنے کو بروقت محسوس کر لیا اور آنے والے طوفان کا اندازہ کر کے اس کا قلع قمع کرنے کا تہیہ کر لیا۔ انہوں نے اپنی جادو اثر شاعری اور خداداد ذہانت سے، جسے وہ نیم پیغمبری سے تشبیہ دیتے ہیں، کے ذریعے موجودہ نسل کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ جاوید نامہ جیسی شہرۂ آفاق تصنیف انہوں نے صرف اور صرف ان کھلتے ہوئے غنچوں کے لئے لکھی جو کل کو زیب گلستان بننے والے ہیں۔

اقبالؒ کے زمانے میں نوجوان نسل گمراہی کے گڑھے میں گرتی جا رہی تھی۔ فرنگ کی جادوگری اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ تہذیب مغرب کی چکا چوند کرنے والی روشنی مسلمانوں کو اپنے ماضی سے دور لے جا رہی تھی۔ نوجوان نسل اسلام کو فرسودہ نظام سمجھتی تھی۔ اقبال اس پریشان کن صورتحال پر پکار اٹھے۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

حضرت علامہ اقبالؒ کے نزدیک نسل نو کی اس فکری زبوں حالی کا اولین سبب وہ نظام تعلیم تھا۔ جو مغربی آقاؤں نے اس قوم کو صدیوں تک غلام رکھنے کے لئے رائج کیا تھا۔ خود لارڈ میکالے کے بقول "وہ ایک ایسی نسل تیار کرنا چاہتے تھے۔ جو انگریز آقاؤں اور غلاموں کے درمیان رابطے کا کام دے سکے"

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

اقبال کی شاعری کا مقصد مسلمانانِ ہند کی اصلاح تھی۔ تاکہ مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر سکیں۔ وہ پریقین تھے کہ اگر مسلمان قرآن پاک کی تعلیمات کو اوڑھنا اور بچھونا بنالیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اسی بجھی راکھ سے وہ شعلہ بلند نہ ہو۔ جو ہر باطل کو خاکستر کر دے ان تمام باتوں کے لئے اعتماد پیدا کرنا نہایت ضروری تھا۔ لیکن مسلمان تو اپنا اعتماد ہی کھو چکے تھے اور ان کے سوچنے کا انداز ہی بدل گیا تھا ؏

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اب مسئلہ یہ تھا کہ ان کا اعتماد کس طرح بحال کیا جائے۔ دانائے روزگار نے اس کا حل خودی اور عشق کی زندہ دلی میں تلاش کیا۔ وہ عشق جو انسان کو کامل بنا دیتا ہے۔ جو کبھی معراج نبیؐ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے تو کبھی منصور کے منہ سے "انا لحق" کی صدا کے طور پر ظاہر ہوتا ہے عشق پختہ ہو تو بہت سی باتیں بے خودی میں ہی ہو جاتی ہیں جب انسان عشقِ الٰہی میں غرق ہو جاتا ہے تو وہ ذاتِ ربانی کا جزو بن جاتا ہے وہ ایک مردِ کامل بن جاتا ہے یہی وہ مردِ کامل ہے جسکا ہر فعل خدا تعالیٰ کی رضا ہوتا ہے جسکی سوچ بندۂ مومن کی سوچ ہوتی ہے۔ اس کی اپنی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور ایک مقام آتا ہے جب کہ ؏

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

نوجوانوں کی یہی بدقسمتی ہے کہ ان کا ذہن احساسِ کمتری سے کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ فرنگ کی بے حیثیت چیزیں اسے اپنے گوہر و یاقوت سے زیادہ پر وقار نظر آتی ہیں۔ کیا یہ سب مردہ ذہن کی عکاسی نہیں کرتا۔ غلامانہ اندازِ فکر اور کیا ہوتا ہے؟

نوجوانانِ ملت کی ذہنی شیرازہ بندی کے ساتھ ساتھ شاعرِ مشرق نے تن آسانی اور عیش پرستی کے مہلک نتائج سے بھی خبردار کیا اور ان کو وادیٔ عمل کی طرف کھینچا۔ یہ علامہ کے افکار کا فیضان تھا۔ کہ نوجوانوں میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوگی علامہ ہی نے نوجوانوں کے سینوں میں ایمان و ایقان کی شمعیں روشن کیں۔

ہمت ہو تو ڈھونڈ وہ فقر جس فقر کی اصل ہے حجازی

اور ــــــــ

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اقبال کی تمام امیدیں اس نئے خون کے ساتھ وابستہ ہیں جن کی ہیبت سے پہاڑ سمٹ کر رائی ہو جاتے ہیں جن کی ایک ہی ٹھوکر سے صحرا و دریا دو نیم ہو جاتے ہیں۔

وہ موجودہ نسل کو اپنی آرزوؤں کا مرکز بنا کر بڑے پُر امید ہیں۔ اگر موجودہ نسل کی تربیت صحیح طور پر ہو جائے اور خداوندانِ مکتب ان کو شاہین بننے کا سبق دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار نہ حاصل کر لیں

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

علامہ ڈاکٹر اقبالؒ

عطاالحسن فاروقی
سال دوم

آپ کے والد صاحب کا نام شیخ نور محمد تھا۔ اور والدہ ماجدہ کا نام امام بی بی ـــ ایک رات آپ کے والد بزرگوار نور محمد نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے چاند ٹوٹ کر ان کے آنگن میں آگیا ہے۔ اور سارا گھر روشنی سے جگمگا اٹھا ہے۔ شیخ صاحب صبح اُٹھے تو اپنے خواب پر بہت حیران ہوئے انہوں نے یہ خواب ایک بزرگ کو سنایا۔ بزرگ نے خواب سنتے ہی انہیں یہ بشارت دی کہ تمہارے گھر خدا کے فضل سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو بڑا ہو کر بہت نام پیدا کرے گا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چند روز بعد ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اقبالؒ رکھا گیا۔ ۱۸۷۷ء کو ماہ نومبر کی ۹ تاریخ کو آپ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی صوفی نور محمد نیک اور دین دار آدمی تھے۔ اور برقعے کی ٹوپیاں سی کر گزارہ کرتے تھے۔ علامہ کی والدہ ماجدہ بھی دیندار خاتون تھیں اور ہر وقت عبادت میں مشغول رہتی تھیں اقبالؒ کی شخصیت سکول کے زمانے سے ہی بڑی پروقار تھی۔ آپ کا شمار ذہین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ کو سکول سے دیر ہوگئی۔ جب آپ کلاس میں پہنچے تو استاد نے پوچھا کہ "اقبال تم دیر سے آئے ہو؟" تو اقبال نے فوراً جواب دیا کہ "جناب! اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے"۔ استاد نے آپ کی حاضر جوابی کی داد دی۔

ڈاکٹر اقبالؒ کا شمار عظیم شاعروں اور مفکروں میں ہوتا ہے۔ جو کہ ہمارے قومی شاعر ہیں۔ شاعر کے بغیر کوئی قوم صحیح معنوں میں قوم ہی نہیں ہوتی، بلکہ تودۂ گل بنی رہتی ہے۔ اقبال کے دل میں اپنی قوم کی ترقی کا جذبہ اس قدر زیادہ تھا کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی اسی نیک کام میں گزار دی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے زیادہ تر شاعری کو ذریعہ بنایا۔ آپ کی شاعری نے ملت کے جسم میں (جو کہ ایک معنی میں راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی۔) زندگی کی روح پھونکی اور اُسے ایک زندہ اور باشعور قوم میں بدل دیا آپ نے بعض مسئلوں کو واضح کرنے کے لئے نثر میں مضامین بھی لکھے۔ علامہ اقبالؒ کی شاعری اور ان کے مضامین کا موضوع عام طور پر مسلمانوں کی علمی، دینی، سیاسی، تعلیمی اور مجموعی طور پر قومی بیداری ہے۔

حکیم الامت اپنی شخصیت کے لحاظ سے بہت سادہ مگر پروقار تھے۔ ابتداء میں وہ کرتہ شلوار پہنتے تھے۔ سر پر سفید پگڑی ہوتی تھی یا لنگی۔ یورپ جاکر آپ کو انگریزی لباس بھی پہننا پڑا۔ لیکن وہاں سے آنے کے بعد وہ عام طور پر شلوار قمیض اور کوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ کبھی کبھی پتلون بھی پہن لیتے تھے۔ ویسے آپ کو انگریزی لباس پسند نہیں تھا۔ اقبال کی زندگی سادہ اور تکلف سے پاک تھی۔ وہ بہت دوست نواز قسم کے آدمی تھے۔ تقریباً ہر روز ان کے دوست ان کے مکان پر آتے اور گھنٹوں علمی، ادبی، دینی اور سیاسی گفتگو ہوتی تھی۔ اگرچہ علامہ اقبالؒ کا وقت

کافی حد تک دوستوں کی محفلوں میں گزر جاتا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ مطالعے کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔

گو اقبالؒ کو ابتدا ہی سے بے حد قبول عام حاصل ہوا اور ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا فرد نغمۂ اقبالؒ کی شیرینی اور پیام اقبالؒ کے سوز و گداز کا دلدادہ تھا۔ مگر افسوس ہے کہ مطالعہ اقبال کی حقیقی کوشش بہت دیر میں ظہور میں آئی۔ اقبالؒ کی زندگی میں ان کی حکمت کے مطالعے کے سلسلے میں جو کچھ ہوا علامہ اس سے بالکل مطمئن نہ تھے۔ نوجوانانِ وطن سے انہیں جو توقعات تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ فکر اسلامی کے احیاء کے سلسلے میں ان کے جس قدر ارادے تھے۔ ایک ایک کر کے ناکام رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی کتاب "ارمغانِ حجاز" کی اکثر رباعیاں تنہائی کے احساس سے معمور نظر آتی ہیں۔ اقبالؒ کو سب سے زیادہ گلہ ان ناشناس تحسین گزاروں کا تھا۔ جو انہیں محض غزل خواں اور ان کی حکمت کو نوائے شاعری سمجھتے رہے۔ ان کے ماحول کی بے بصیرتی اور ان کی ناکامی کا گہرا اثر اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالؒ اپنے زمانے اور ماحول سے مایوس ہو کر اپنے آپ کو مستقبل کا پیام آور کہنے لگے۔ اور جب آپ اس دنیا میں نہ رہے تو آپ کی کمی شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ اس وقت آسودگی پسند قوم کو اس متاعِ گراں مایہ کے لٹ جانے کا کچھ احساس ہوا ماتمی جلسے ہوئے۔ مرثیے لکھے گئے۔ اخبارات نے ماتمی ایڈیشن شائع کیے۔ رسالوں نے خاص نمبر نکالے غرض ہر شخص نے اپنے ذوق اور اپنے اپنے طریق میں حکیم الاُمت کے اُٹھ جانے پر اپنے دلی درد اور افسوس کا اظہار کیا۔ غم واندوہ کی یہ فضا علمی لحاظ سے کسی حد تک مفید ثابت ہوئی۔ اور اشکبار آنکھوں نے دلوں اور دماغوں کو پیام اقبالؒ پر گہرے فکر و نظر کا اشارہ کیا چنانچہ اس حادثے کے زیر اثر تین چار سال تک افکار اور کلام اقبالؒ کی تنقید و تشریح کی طرف خاص توجہ ہوئی۔ اور مطالعہ اقبالؒ کی تحریک کو بہت حد تک فروغ حاصل ہوا۔ لہٰذا علامہ اقبالؒ قوم میں جس قسم کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اپنی زندگی میں اس کا دیکھنا ان کو نصیب نہ ہوا۔ مگر درحقیقت قوم کی بیداری میں آپ ہی کی کوششیں رنگ لائیں۔ اور یہ آپ کی اور آپ کے رفقائے کار کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک الگ آزاد وطن حاصل کر لیا۔

پہلے پہل تو آپ سیاست سے الگ تھلگ رہے۔ مگر پھر آپ سے اپنی قوم کی بے بسی، کسمپرسی اور غلامی کی حالت نہ دیکھی گئی۔ اور آخر کار آپ قوم کی اصلاح اور ترقی کی خاطر سیاسی میدان میں آ گئے۔

آخیر عمر میں آپ کی آواز بیٹھ گئی۔ پھر گردے کی تکلیف شروع ہوئی پھر کھانسی اور دل کی تکلیف ہو گئی۔ آخر کار ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو صبح پانچ بجے آپ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اور مسلمانوں کو تڑپتا چھوڑ گئے۔ یہ روشنی کا مینار اور علم کا چاند لاہور میں غروب ہو گیا۔ لیکن اس کی روشنی اب بھی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔

"کردار ہی وہ غیر مرئی قوت ہے۔ جس سے قوموں کے مقدر متعین ہوتے ہیں۔"

اقبالؒ کون ہے؟

خلیق الرحمٰن
سال اوّل

بظاہر تو اس سوال کا جواب آسان اور سادہ الفاظ میں یوں دیا جاتا ہے کہ اقبال وہی ہے جو ۹، نومبر ۱۸۷۷ء کو صوفی نور محمد نامی ایک بزرگ کے ہاں سیالکوٹ کے مشہور شہر میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ یہ بزرگ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ تاہم اپنے حکیمانہ خیالات کی بدولت شہر بھر میں اَن پڑھ فلسفی کے نام سے مشہور تھے۔ اقبال نے ابتدائی دینی و دنیوی تعلیم کے سلسلے میں مولانا میر حسن جیسے فاضل استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ میرے کالج سیالکوٹ سے ایف اے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوگئے بی اے امتیازی نمبروں میں پاس کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ عرصہ اورینٹل کالج لاہور اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور پروفیسر خدمات سرانجام دیتے رہے لیکن ابھی تک مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق موجزن تھا۔ لہٰذا آپ مزید تعلیم کے لئے انگلستان روانہ ہوگئے۔ میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا اور ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آگئے۔

وطن واپس آکر ہندوستانی مسلمانوں کو انگریز کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے جدوجہد شروع کی، جس کے لئے انہوں نے مسلمانوں کو اپنی نظموں کے ذریعے خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ خطبہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ جس میں انہوں نے جداگانہ قومیت کے تصور پر زور دیا۔ بالآخر ۱۹۳۸ء میں وفات پائی اور شاہی مسجد کے پہلو میں دفن کئے گئے۔

بعض لوگ اقبالؒ کے حکیمانہ افکار و نظریات کی بدولت اسے ایک عظیم مفکر اور فلسفی کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس نے فلسفہ خودی پیش کرکے جدید فلسفہ کے ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے جس کا اظہار اس کے اس شعر میں ملتا ہے۔

شعر

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

بعض لوگ اقبال کو ایک عظیم شاعر سمجھنے کے حق میں ہیں، لہٰذا اس کی نظموں کو ازبر کر لینا اپنے لئے باعثِ شرف سمجھتے ہیں اور اپنی روزمرہ کی گفتگو کو دلچسپ پیرائے میں بیان کرنے کے لئے اقبال کے شعروں کا سہارا لیتے ہیں۔ جہاں تک اقبالؒ کی شاعری کا تعلق ہے، برصغیر کا ہر خاص و عام اس سے بخوبی واقف ہے۔ الغرض پروفیسر اپنے لیکچر کے دوران اس کے اشعار کا حوالہ دے کر اپنے لیکچر کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیاسی، معاشی اور معاشرتی مفکرین اس کے حکیمانہ خیالات سے مستفید ہوتے ہیں اور شاعر حضرات اس کے افکار و نظریات کو اپنی شاعری میں جگہ دے کر اس سے

اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کرتے ہیں ۔

چنانچہ آج اقبال سے عقیدت و محبت کا اظہار جس انداز سے کیا جا رہا ہے۔ اس کے وہ ہرگز خواہاں نہیں تھے۔ آج اس کی ساری محنت صرف اس کی پیدائش اور وفات کی چھٹیاں منا کر یا اس کی یاد میں جلسے منعقد کروا کے شعرو اشعار سے لطف اندوز ہو لیا جاتا ہے اور اس کی زندگی کا نصب العین جو انہوں نے اپنے دلسوز پیرائے یا بذریعہ اشعار بیان کیا تھا۔ اور جس کی پیروی اپنی لوگوں سے متوقع تھی۔ اس نصب العین کو بالکل پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست

سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

بلاشبہ اقبال ایک شاعر، فلسفی اور سیاستدان کی حیثیت سے منظر عام پر جلوہ گر ہوئے۔ اگر ان کی شاعری، ان کا فلسفیانہ استدلال اور ان کی سیاست قرآن و سنت کے رنگ سے رنگی ہوئی ہے۔ بالفاظ دیگر اقبال کے نظم، فلسفہ اور تصوّف جو کچھ بھی ہے اس پر قرآنی اثر غالب ہے۔ ویسے ڈاکٹر اقبالؒ قرآنی اثر سے اتنا متاثر تھے۔ کہ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت وجد میں آجاتے۔ قرآن مجید سن کر ان کی عجیب حالت ہو جاتی تھی۔ گویا روح پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہے۔ قرآنی اثر کا اندازہ کیجئے کہ ایک دفعہ ایک عرب قاری نے قرأت شروع کی تو اقبالؒ بے اختیار رونے لگے۔ اقبالؒ اپنی نظموں کو بھی ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر یہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ کہ خدا کے کلام کو سنوار کر نہ پڑھتے ۔ قرآنِ مجید کی تلاوت بآوازِ بلند کیا کرتے تھے جس سے ان کے قلبی جوش کا اظہار ہوتا ہے ۔

اقبال راتوں میں جاگتے تھے اور سحر خیزی ان کی پسندیدہ چیز تھی ۔ پھر قرآن کو ان اوقات سے خاص لگاؤ ہے ۔ لہٰذا شغفِ قرآن، قرآن کے نورانی صفات ان کے سامنے واکردیتا تھا۔ اور یہ بلبل ہزار داستان بڑی خوش الحانی کے ساتھ تلاوت قرآن میں معروف نظر آتا تھا۔ صاف ظاہر ہے۔ قرآن کے ساتھ اتنا زیادہ انس اور لگاؤ رکھنے والا کیوں کر اسلامی حدود سے باہر نکل سکتا ہے۔ چنانچہ اقبالؒ کی شاعری سے مقصود تبلیغ قرآن ہی تھا۔ لہٰذا ان کے اشعار اور ان کے افکار و نظریات جن میں خودی کے تصور کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہیں ۔ خودی کا تصور دے کر در اصل وہ نبی کریمؐ کی اس حدیث کی اشاعت کرنا چاہتے تھے۔ جس میں آپ نے فرمایا " من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ " عرفانِ نفس اور خودی کی یہی وہ تعلیم ہے۔ جسے اقبال نے اپنے فکر و فلسفہ میں پیش کیا ہے ۔

" اپنی حدود کو پہچانیئے اور اپنی صلاحیتوں کو پرکھئے۔ پھر زندگی میں آپ کی کامیابی یقینی ہے "

فکرِ اقبال کا ایک عملی پہلو

چوہدری محمد بوٹا
سال چہارم

علامہ اقبال نوجوانوں کی خودی کو سیرت فولاد دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ جوانوں کو پیروں کا استاد کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ افسوس کا مقام ہے کہ آج ہمارے تعلیمی نظام میں علامہ کے افکار و نظریات کو وہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں جو ایک آزاد قوم کو نظریہ پاکستان کے خالق کو دینا چاہیئے تھا۔ نوجوان نسل کو فکرِ اقبال سے روشناس کرانے اور حضرت علامہ کی توقعات کو پورا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تعلیمی اداروں میں ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سطح پر بہترین قسم کے پروگرام ترتیب دیئے جائیں۔

گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں فکرِ اقبالؒ کے انہی عملی مظاہر کی تلاش میں ایوان سکیم کے خدوخال کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یوں تو کالجوں میں ٹیوٹوریل گروپ کی سکیم جاری و ساری ہے۔ مگر یہ کسی خاص جذبہ عمل اور روح جہاد سے عاری ہے۔ ہمارے ہاں کالج میں تمام طلبہ کو بیس ٹیوٹوریل گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور بعد ازاں ہر چار ٹیوٹوریل گروپوں پر مشتمل ایک ایوان تشکیل دیا گیا ہے۔ اس طرح سے کل پانچ ایوان معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ ایوان ٹیپو سلطان میں مولانا الطاف حسین حالی، سرور شہید، عبدالرب نشتر اور راشد منہاس شہید، ٹیوٹوریل گروپ شامل ہیں۔ دوسرے ایوان خالد بن ولید میں سرسید احمد خان، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، اور مولانا جلال الدین رومی کے نام سے ٹیوٹوریل گروپ شامل ہیں۔ تیسرا ایوانِ صلاح الدین ایوبی کے نام سے منسوب ہے جس میں مولانا ظفر علی خاں، محمد طفیل شہید، سعدی شیرازی اور ابن سینا کے ٹیوٹوریل گروپ شامل ہیں۔ چوتھا ایوان طارق بن زیاد کے نام نامی سے موسوم ہے۔ جس میں عزیز بھٹی شہید، سید سلیمان ندوی، مولانا شبلی نعمانی اور شیخو سلیم کے ٹیوٹوریل گروپ شامل ہیں۔ آخری ایوان برصغیر کے پہلے مسلم مجاہد محمد بن قاسم کے نام سے منسوب ہے جس میں جمال الدین افغانی، شاہ فیصل شہید، وارث شاہ، اور ابوبکر ذکریا رازی نامی ٹیوٹوریل گروپ شامل ہیں

کالج کے ان ایوان خمسہ میں ہر ایوان کے صدر اور معتمد کو اس میں شامل چاروں ٹیوٹوریل گروپس کے پریذیڈنٹ اور سیکرٹری منتخب کرتے ہیں۔ ان تمام ایوانوں کے اپنے دائرہ کار میں تمام سال مباحثے، مشاعرے مذاکرے، مقابلہ حسن قرأت، کھیلیں اور مختلف علمی مشاغل کی نمائشیں جاری رہتی ہیں اور پھر اسی قسم کے بین الا یوانی مقابلے جاری رہتے ہیں۔ ہر مقابلے میں اول آنے والے ایوان کو دس، دوم آنے والے کو

سات اورسوم آنے والے کو پانچ نمبر دیتے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیمی اعتبار سے نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کے نمبر بھی ان کے ایوانوں میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ ناظم فعالیات سال بھر ان سرگرمیوں کا ایک جامع ریکارڈ مرتب کرتے ہیں۔ اور آخر میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے ایوان کا پرچم تمام سال کالج کے پرچم کے ساتھ لہراتا رہے گا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان ایوانوں کو کالج بھر کی سطح پر منعقد ہونے والی تقریبات کا باری باری انتظام کرنا ہوتا ہے۔ ہر ایوان کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی تقریب کے موقع پر اس کا مخصوص پرچم لہراتا ہے اور اس کا مخصوص ترانا سنایا جاتا ہے۔ ان سطور کے آخر میں وہ تمام ترانے لکھے جا رہے ہیں۔ جنہیں پروفیسر احمد عقیل روبی کی فکر رسا نے ترتیب دیا ہے۔ جناب پرنسپل صاحب ان ترانوں کے تاریخی پس منظر پر مبنی ایک تعلیمی اور دستاویزی فلم بھی تیار کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نیز ان ایوانوں کے سرگرمیوں کو فعال اور مربوط بنانے کے لئے ایک ایوان ہال کی تزئین و آرائش کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

کالج ہذا میں ان تمام ایوانوں کا ایک مشیر اور ایک نگران پروفیسر حضرات میں سے ہوتا ہے۔ ایوانوں کے ان مشیران، نگران حضرات، صدور اور معتمد حضرات مل کر ایک مرکزی ادارے یعنی سنڈیکیٹ کی تشکیل کرتے ہیں پرنسپل صاحب بر بنائے عہدہ اس پالیسی ساز ادارے کے چیئر مین ہیں۔ سنڈیکیٹ کا یہ ادارہ تعلیمی، ادبی اور ثقافتی موضوعات پر مختلف قسم کی تقریبات کا فیصلہ کرتا ہے۔ نیز کالج میں ہر قسم کے معاملات کے لئے اس کی رائے حرف آخر اور قطعیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس طرح طلبہ بھی کالج کے بہترین مفاد میں بہترین اور مثبت فیصلے کرتے ہیں۔ جن سے ادارے کے ماحول میں ایک صحت مند تعلیمی فضا دکھائی دیتی ہے۔ اب آئندہ اوراق میں ہر ایوان کا ترانہ دیا جا رہا ہے تاکہ طلبہ اسے یاد کر کے اپنے ایوان کے تشخص میں مزید اضافہ کریں۔

فکر اقبال کو نوجوانوں میں ایک مثبت انداز سے نافذ کرنے کا یہ وہ فطری طریق کار ہے جو بہت جلد اپنے ثمرات پیش کر رہا ہے۔ یہ ایوان سکیم اب عمل کا قالب اختیار کر چکی ہے۔

"افراد اور اقوام فنا پذیر ہیں۔ لیکن تصورات جو ان کی معنوی تصویر ہیں۔ ہرگز فنا نہیں ہوتے۔"

ٹیپو سلطان

احمد عقیل روبی

فتح علی، ٹیپو سلطان
ہمت و جرأت کی پہچان
ناز زمانہ کرتا ہے!
تجھ پہ اے میسور کے شیر
پھر اس دھرتی سے نہ اگا
تیرے جیسا کوئی، دلیر

تجھ سے لرزاں ہر میدان
فتح علی ٹیپو، سلطان

تو نے کہا رازِ ہستی!
غیرت مند، حیالوں سے،
شیر کا اک دن بہتر ہے
گیدڑ کے سو سالوں سے

سچ تھا تیرا، یہ فرمان
فتح علی، ٹیپو، سلطان

احمد عقیل روبی

خالد بن ولیدؓ

جس کی ہر گرفت جنگ میں شدید ہے
کون ہے وہ ، خالد بن ولیدؓ ہے

تھر تھرا گئی اجل بھی جس کے نام سے
ہے بہت پرے وہ قیدِ صبح و شام سے
وقتِ جنگ ، جس کو روزِ جشنِ عید ہے
کون ہے وہ ، خالد بن ، ولیدؓ ہے

جب تلک جیا ، خدا کی راہ میں جنگ کی
جس نے کفر پر یہ سر زمین تنگ کی
جس کو دیکھنا ، خدا کے دیں کی دید ہے
کون ہے وہ ، خالد بن ، ولیدؓ ہے

سلطان صلاح الدین ایوبی

سلطان صلاح الدین ایوبی !
تم سے چمکا نام خدا کا
تم سے پھیلا ۔ دین سلطان صلاح الدین ایوّبی

رزم میں دشمن کو للکارا ، بزم میں اپنا بنایا
خلق نبی اور خلقِ محمد ، دنیا میں پھیلایا
جنگ میں سخت چٹانوں جیسا ، بزم میں گل جبین

صلاح الدین ،
سلطان صلاح الدین ایوّبی

صدقِ دل سے تو نے سینچی ، دین خدا کی کھیتی
کرتا ہے تجھے یاد زمانہ ، نام ہے دنیا لیتی
سارے عالم میں ہیں مثالی ، تیرے عزم و یقین

صلاح الدین
سلطان صلاح الدین ایوبی

احمد عقیل رو‌بی

احمد عقیل رُوبی

طارق بن زیاد

طارق دلیر، طارق جری
ترے زیر پا ہے خشکی و تری

تو مدام ہے مرا نہیں ہے تو
لوحِ آسمان پر لکھا ہے تو
کشتیاں جلا کے موت سے ملا
عزم کی۔ وفا کی۔ انتہا ہے تو

طارق دلیر، طارق جری
ترے زیر پا ہے خشکی و تری

تو عظیم۔ وقت تیرے ہاتھ میں
تو چراغ ہے اندھیری رات میں
موت کا، اجل کا، اور حیات کا
فلسفہ چھپا ہے تیری ذات میں

طارق دلیر، طارق جری
ترے زیر پا ہے خشکی و تری

احمد عقیل روبی

محمدؐ بن قاسم

محمد بن قاسم زندہ باد
کفر میں خدا کے دین کا دیا جلا دیا
ہند کو عرب کا فلسفہ ، بتا دیا

محمد بن قاسم زندہ باد
تو حیا کی منفرد مثال تھا
تیرا عزم ، عزم بے مثال تھا
عزتوں کا کس قدر تجھے خیال تھا

محمد بن قاسم زندہ باد
ہے ورق ورق پہ تیری داستان
تو ہے ہمتوں کا بحرِ بیکراں
قاسم جہاں جہاں تو تھا وہاں وہاں

محمد بن قاسم زندہ باد
کفر میں خدا کے دین کا دیا جلا دیا
ہند کو عرب کا فلسفہ ، بتا دیا

حضورِ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

مرحبا، اقبال، اے دانائے رازِ کُن فکاں
حبّذا، اے آشنائے بحرِ امکانِ مکاں

اے رسولِؐ ہاشمی کے عاشق مدحت سرا
اے خدائے لم یزل کی عظمتوں کے ترجماں

اے اتالیقِ خودی، اے کاشفِ سرِّ طلب
ناشرِ منشورِ وحدت، کاسرِ قصرِ بُتاں

تو مصوّر، تو مفسّر، تو محدّث، تو حکیم
حلقۂ ہوش و خرد، قلب و نظر ہے یکزباں

بسکہ مشکل ہے رقم کرنا ترے اوصاف کا
محوِ حیرت ہے سراپا خامۂ عاجز بیاں

وادیٔ شعر و سخن میں مَیں ذراسی آب جُو!
تو جہانِ علم کا اِک بحرِ ناپیدا کراں

تو کہ تھا نورِ ازل کی روشنی سے بہرہ ور
تو کہ تھا حورِ ابد کی خلوتوں کا رازداں

تو کہ تھا بادہ کشِ قدحِ صفائے مصطفیٰؐ!
تو کہ تھا مستِ مئے توحید، نحو العارفاں

مرغزار

تو کہ تھا شعر و سخن کی مملکت کا تاجدار
تو کہ تھا شاہنشہِ اقلیم حکمت، بیگماں

آج بھی تو شہر یاری میں بے شک منفرد
آج بھی سینوں کے اندر ہے ترا سکہ رواں

"نطق کو سو ناز ہے تیرے لبِ اعجاز پر"
زیب دیتا ہے تجھے کہئے معانی کا جہاں!

"نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر"
کل بھی تو عظمت نشاں تھا، آج بھی عظمت نشاں

ضربتِ کاری سے تو نے ریزہ ریزہ کر دیا
مغربی تہذیب کا ہیبت فزا کوہِ گراں

کر دیا خاموش افلاطونیوں کا ارغنوں!
ہو گئی الکن بسم کے صوفیوں کی داستاں

موڑ دی تو نے بستام رہ ہموار زندگی
تو ہی تھا، بے شک سوارِ اشہبِ عصرِ رواں

تھا ترا سیلِ جنوں حسنِ عمل کا رہنموں
فیض بخشِ زندگانی تھا ترا فکر جواں

تیرے خواب "فرد" کی تعبیر ہے یہ سر زمیں
اور بھی ہیں خواب تیرے حرفِ ملت میں نہاں

ایں چہ روز آمد کہ مار ایک بلای جان شدہ
یارہئے خواہیم، اقبالؒ، از معین و مستعاں

حبیب فخری

غزل

نذرانۂ عقیدت بزمِ سینِ اقبالؒ

یوُں تو آتا ہے یہاں ہر شخص کو باتوں کا فن
پھر بھی اس گفتار کے جنگل میں گونگا ہے سخن

گر نہ جائے ایک دن چپکے سے دیوارِ بدن
جمع ہے اس میں نہ جانے کتنے قرنوں کی تھکن

یہ نہیں معلوم کس کے پاس ہے اس کا سرا
یہ خبر ہے میری گردن میں پڑی ہے اک رسن

زندگی اندھی گلی ہے ذہن اندھا راہ رو!
اور اس اندھے کو اک عنقا کی ہے شاید لگن

اشکِ انجم روتے گزری ہے اُس کی ساری عمر
سینۂ شب میں خدا جانے یہ کیسی ہے دُکھن

بند جس گھر نے کیا در مجھ پہ وہ بھی ہے مرا
غیر ہوُں اب تک جہاں پر وہ بھی ہے میرا وطن

سچ تو یہ ہے تُو نے فخریؔ آپ لوٹائی بہار
اتنی اونچی بھی کوئی رکھتا ہے دیوارِ چمن

پروفیسر صدیق شاہد

ایک تضمین

غم کی بارش میں بھی دل اپنا کبھی میلا نہ کر — غم بھرم ہے زندگی کا غم ہے میراثِ بشر

ہم ازل کے ساز کا ٹوٹا ہوا اک تار ہیں — ہم اک اونچی ڈال سے اترے ہیں مانندِ ثمر

اشک و آہ و یاس کا سرمایہ لے کر ساتھ اپنے — ہم نے پامردی سے کاٹا ہے یہ صدیوں کا سفر

ہم سمجھتے ہیں بشر کی زندگی کے راز کو! — دل قوی رہتا ہے اپنا درمیانِ خیر و شر

شر کے پنجے میں گلا دھرتی کا خوں آلود ہے — آدمی کا پیرہن غم کے لہو میں تر بتر

کیا مگر لازم ہے غم کی فصل اگتی ہی رہے — کیا ضروری ہے کہ لاکھوں بوئیں کھائیں چند گر

آدمی کے ہاتھ میں ہو، آدمی صید زبوں! — یہ تماشا کب تلک دیکھا کریں، دل تھام کر!

اس زمانے کے خداؤں کے جدا اسلوب ہیں — نرم خو ہو کر بھی ہیں یہ مصدرِ ایذا و شر

اس زمانے کے خدا تہذیب کا شاہکار ہیں — "چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر"

آؤ مل کر کاٹ دیں چنگیزیت کے پیڑ کو — ہاتھ میں لے کر یقین و عزم و ہمت کا تبر

آؤ دستِ جبر کو کاٹیں بہ ضربِ صف شکن! — پھر سے پابندوں کو دیں احرار کا عزمِ سفر

زندگی کے دشت کو ہم کر دیں فردوس بریں — مائل نشو و نما ہوں زخمی روحوں کے شجر

خیر کے شر پر تسلط سے ہے تہذیبِ حیات
یہ وہ نکتہ ہے کہ رہنا چاہیئے پیشِ نظر!

بہ نذرِ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

حضرتِ اقبال اقلیمِ خودی کے تاجدار! / دانش و حکمت شعور و آگہی کے شہریار

تو کہ تھا سقراطِ دوراں اے فلاطونِ زماں / عصرِ حاضر کے ارسطو رازدارِ کن فکاں!

وا کیے تیرے تجسس نے سب اسرارِ جنوں / رازدارِ دینِ فطرت محرمِ سوزِ دروں

شمعِ حق احمدؐ مرسل کا تو پروانہ تھا / تھا رگ و پے میں ترے عشقِ محمدؐ مصطفےٰ!

تو نے سمجھایا ہمیں کیا چیز ہے رازِ خودی / تو نے بتلائے ہمیں کیا کیا ہیں اعجازِ خودی

تو نے درسِ آگہی سے کر دیئے روشن ضمیر / تو نے بتلایا مسلماں ہو نہیں سکتے اسیر

کر دیا آگاہ درسِ لَا تَخَفْ لَا تَحْزَنُوْنَ / منکشف تو نے کیے ہر چند اعجازِ جنوں!

قوم کو تو نے دیا وہ درسِ تعمیرِ خودی / چیر سکتی ہے ہمالہ آبِ شمشیرِ خودی

لالۂ صحرا کو بھی دیکھا ہے تجھ سے ہمکلام / تو نے دیکھا ہے تہِ دریا بھی موجوں کا خرام

آشنائے رازِ تقدیرِ اُمم تو نے کیا! / واقفِ سود و زیان و بیش و کم تو نے کیا

محرمِ رازِ حقیقت آشنائے سوز و ساز / تیرے ضیائے سخن میں تھی وہی بوئے حجاز

ہیچ ہیں تیری نظر میں یہ ستاروں کے جہاں / مردِ مومن بندۂ حق وارثِ کون و مکاں

گوشۂ دامن میں تھے تیرے زمین و آسماں / تیری پروازِ تخیل تھی ورائے لامکاں

کاشفِ رازِ محبت محرمِ صبحِ ازل! / تُو کہ تھا شیدائی نورِ خدائے لَمْ یَزَلْ

تُو نے سمجھایا کہ ہے تفریقِ ملت میں فساد / ہے عمل برتر عرب ہو یا کوئی عجمی نژاد

خونِ دل سے تو اٹھاتا تھا خمیرِ آرزو / بادۂ باقی و رُومی سے تھا پُر تیرا سبُو!

صاحبِ سرِّ نہاں اے شارحِ موت و حیات — تُو نے سمجھایا کہ کیا شے ہے وجودِ کائنات

تُو نے ہی تقلیدِ مغرب کے بتائے مضرات — اور سمجھایا کہ کیا ہیں فلسفہ ہائے حیات

مغربیت ہے حیا سوزی ریاکاری کا نام — دینِ احمدؐ جان و دل سوزی و دلداری کا نام

تُو کہ ذرّوں کے دلوں کی دھڑکنیں سنتا رہا — فکر کے گردوں سے الماس و گہر چنتا رہا

دیدۂ بینائے فطرت یہ تیرا ذوق بلند — تُو نے شبنم میں بھی دیکھا آفتاب آئینہ بند

جذب و مستی ذوق و شوقِ عشق ہے تیری نماز — تیری آہِ نیم شب سرمایۂ سوز و گداز

خاکِ پاکِ یثرب و بطحا تیری آنکھوں کا نور — اور حدیثِ صاحبِ قرآں ترے دل کا سرور

اے محقق، اے محدّث، اے مفسّر، اے حکیم — اے کلیمِ طورِ جاں اے وارثِ ولی و کلیم

آسماں پر آج بھی چرچے ہیں تیرے نام کے
نقش قائل ہیں فرشتے بھی تیرے الہام کے

شاعرِ ملت جناب نقش ہاشمی

اقبال رحمتہ اللہ علیہ

سید حسان گیلانی
سال چہارم

دے گیا قوم کو اقبالؒ خودی کا پیغام
ہاں وہ پیغام، کہیں جس کو سراسر الہام

اس کے پیغام میں ہے نوعِ بشر کی تعظیم
جس میں ہے جرم، شہنشاہ و گدا کی تقسیم

اس کے پیغام میں ہے علم و عمل کی تاکید
اس کے پیغام میں ہے اہلِ ہمم کی تقلید

اس کے پیغام کا ہے نقطۂ مرکز توحید
کہ یہی نکتہ ہے اوجِ بشریت کی کلید

اس کا پیغام ہے، پیغام نبوت کا امین
رہنما اک یہی پیغام ہے دُنیا ہو کہ دین!

اس کے پیغام میں ہے رومیؔ و رازیؔ کی تڑپ
مومن و مخلص و جانباز کی غازی کی تڑپ

اس کا پیغام ہمہ گیر ہے آفاقی ہے!
اس کا پیغام ابد تک کے لئے باقی ہے

اس کی آواز ہے قرآن کی آواز کے ساتھ
اس کی پرواز ہے جبریلؑ کی پرواز کے ساتھ

اظہر حسین گل
سال دوم (انٹرمیڈیٹ)

اقبالؒ

شاعرِ مشرق تیرے در پہ نگوں ہے آسماں
تیری عظمت پر انگشتِ بدنداں دوجہاں

تیری رفعت اور بلندی ہے پہاڑوں سے سوا
گونجتی ہے چاروں جانب تیرے نغموں کی صدا

علم و فن میں گو میٹے سے کم نہیں تیرا مقام
حکمت و فہم و خرد میں ہے درخشاں تیرا نام

سوچ کا اک نیا انداز بخشا قوم کو!!
جو شرر برسائے ایسا ساز بخشا قوم کو

ہوگئے بیدار خفتہ تن تیری آواز سے
زندگی نے گیت پھوٹے شاعری کے ساز سے

آگ بھر دی عزم و استقلال کی کردار میں
عظمتِ آدم کو زندہ کر دیا اشعار میں

تو نے اک تازہ جہاں کا خواب افشا کر دیا
خواب کی تعبیر کا جذبہ دلوں میں بھر دیا

فلسفہ شعر و سخن کا دہر کو سمجھا گیا!
چاند بن کر شاعری کی بزم کو چمکا گیا

ارمغانِ اقبالؒ

عبد الجبار شاکر

(حکیم الاُمت علامہ اقبالؒ کے فکر و فن پر مرتبہ اسٹوڈیو ن)

بیا بہ مجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد، قلندری داند

۱۹۷۷ء کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اسے شاعرِ مشرق، حکیم الاُمت، ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمہ کے صد سالہ جشنِ ولادت کے طور پر منایا گیا، اگرچہ پورا سال ملک اور بیرون مختلف انجمنوں اور تعلیمی و ادبی اداروں نے حیات و فکرِ اقبالؒ کے موضوع پر اپنی بساط کے مطابق ہدیہ تبریک اور خراجِ تحسین پیش کیا۔ مگر ان تقریبات میں جامعہ پنجاب کی "انٹرنیشنل کانگریس" اس اعتبار سے منفرد تھی۔ کہ اس میں اطراف و اکنافِ عالم سے دبستانِ اقبالؒ کے ایسے ایسے خوشہ چین، مداح اور نقاد جمع ہوئے، جو رنگ و نسل اور زبان کے اختلافات کے باوجود ایک ہی طرح کے جذبات و احساسات میں رنگے ہوئے تھے۔ یہ ایک ایسا اجتماع تھا جو اقبالیات کی تاریخ میں اپنی مثال آپ تھا۔ کسی فلسفی یا شاعر کو بین الاقوامی سطح پر شاید اس سے بڑھ کر آج تک پذیرائی نہ مل سکی ہوگی۔ جو اس برس حضرت اقبالؒ کے حصہ میں آئی۔ اس کانگریس میں ۲، دسمبر سے ۸، دسمبر، ۷۷ء تک علماء و فضلائے روزگار کا یہ حسین اجتماع ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل اور دیگر مقامات پر شاعرِ مشرق کے حضور اپنے جذبات و خیالات کا ہدیہ پیش کرتا رہا۔ اور اس تمام تر وجد آفریں اور روح پرور ماحول پر مجھے ایران کے عظیم شاعر ملک الشعراء بہار کی شاعرانہ حقیقت کا پہلی مرتبہ عملی منظر دکھائی دیا ؎

قرنِ حاضر خاصہ اقبالؒ گشت
واحدے کز صد ہزاراں بر گذشت

میں اسے اپنی بے پناہ خوش نصیبی پر محمول کرتا ہوں کہ مجھے اس کانگریس کے آغاز سے اختتام تک جملہ کارروائی کو بچشم خود دیکھنے اور بگوش دل سننے کا اتفاق میسر آیا۔ یہاں ایک نیا اقبالؒ میری فکر اور روح کے مسلمات کا شاہدِ عادل تو تھا ہی لیکن وہ مستقبل کی آفاقی صداقتوں کا ترجمان بھی نظر آیا۔ اور اس ماحول میں اس کی فکر کے پیغمبرانہ شکوہ نے مجھے شدت سے اپنی گرفت میں لے لیا ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی　　برہمن زادۂ رمز آشنائے رُوم و تبریز است

اس موقع اور ماحول کی سعادتوں سے مزید بہرہ ور ہونے کے لئے میں نے عجلت میں ایک گیارہ نکاتی سوالنامہ ترتیب دیا اور ایلائے مقصود کے حصول کے لئے انٹر کانٹی نینٹل میں مقیم مختلف ملکی وغیر ملکی ماہرین اقبالیات تک رسائی حاصل کی۔ اوران حضرات کے تعاون سے میں نے معلومات اور فکر کا جو ذخیرہ حاصل کیا وہ اقبالیات کے پرستاروں اور نقادوں کے لئے یقیناً ایک گنجینۂ گوہر ثابت ہوگا۔ ان انٹرویوز کے حصول کے لئے مجھے سفر و حضر کے مختلف اوقات میں مختلف مہمانوں سے تعاون حاصل ہوا۔ ان میں سے چند انٹرویو اس کانگرس کے مندوبین سے سفر سیالکوٹ کے دوران مرتب کئے گئے جب کہ چند ایک "چوتھی کل پاکستان جیورسٹ کانفرنس" (بیادِ اقبالؒ) منعقدہ ۹ تا ۱۱، دسمبر ۷۷ء بمقام واپڈا آڈیٹوریم لاہور کے موقع پر حاصل کئے گئے ہیں۔ یوں مجموعی اعتبار سے اردو میں ۱۶ اور انگریزی میں ۲۰ انٹرویوز لئے گئے جنہیں مرتب و مدون کرنے کے بعد قارئین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ مجوّزہ سوالنامہ میں درج ذیل گیارہ سوالات مرتب کئے گئے تھے۔

۱۔ آپ کے نزدیک اقبالؒ کے پیغام کا مرکزی نقطہ کیا ہے ؟

۲۔ آپ اقبالؒ کی کس کتاب کو پسند کرتے ہیں اور کیوں ؟

۳۔ اقبالؒ کے فکروفن پر لکھی جانے والی کتب میں آپ کی پسندیدہ کتب کون سی ہیں ؟

۴۔ اقبالؒ پر آپ کے تحقیقی اور تصنیفی کام کی تفصیل کیا ہے ؟

۵۔ آپ کے نزدیک فکرِ اقبال کا مستقبل کیا ہے ؟

۶۔ آپ کو اقبالؒ کے کردار کا کونسا پہلو زیادہ پسند ہے ؟

۷۔ آپ کو اقبالؒ کا کونسا شعر زیادہ پسند ہے۔ (ایک فارسی ایک اردو) ؟

۸۔ آپ کے نزدیک اقبالؒ کا تصورِ پاکستان کیا ہے ؟

۹۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اقبالؒ کا فنی مقام کیا ہے ؟

۱۰۔ کیا آپ اقبالؒ کو ایک شاعر یا فلسفی کی حیثیت سے چاہتے ہیں ؟ یا کسی اور حیثیت سے ؟

۱۱۔ فلسفۂ اقبال کا کونسا پہلو آپ کو زیادہ پسند ہے ؟

ہر انٹرویو سے پہلے متعلقہ شخصیت کے بارے میں ایک تعارفی نوٹ دیا گیا ہے تاکہ انٹرویو دینے والی شخصیت کا علمی مقام و مرتبہ واضح ہو جائے۔ کوشش کی گئی ہے کہ جو ترتیب سوالنامے میں موجود ہے۔ اسی ترتیب سے جوابات مرتب ہوں زیرِ نظر حصے میں ان حضرات کے انٹرویو دیئے گئے ہیں۔ جن سے گفتگو ہوئی تھی۔ جب کہ بہت سے حضرات سے انگریزی زبان میں مکالمہ ہوا۔ یہ انگریزی انٹرویو دوسرے حصے میں من وعن درج کئے جا رہے ہیں تاکہ ترجمہ سے متعلقہ حضرات کے خیالات و جذبات میں معمولی سا بھی فرق واقع نہ ہو جائے۔ لیجئے خمکدۂ اقبالؒ سے کوثر تسنیم کے جرعہ ہائے حیات نوش جاں کیجئے۔

سید صباح الدین عبدالرحمن

سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ہندوستان کی معروف علمی شخصیت اور شہرہ آفاق علمی وتحقیقی جریدے "معارف" کے مدیر ہیں۔ لمبا قد، سانولی رنگت، چہرے پر مناسب داڑھی اور نظر کے چشمے نے ایک خاص متانت پیدا کر دی ہے۔ لہجے میں ایک خاص ٹھہراؤ، مٹھاس اور اپنائیت ہے۔ شیروانی، پاجامہ اور ٹوپی نے انہیں وضع مشرق کا نمائندہ بنا رکھا ہے۔ آپ ہندوستان کے صوبہ بہار کے ضلع پٹنہ میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ اور علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ اور کئی مضامین میں ایم۔ اے کی سندات رکھتے ہیں۔ استاذ الکل سید سلیمان ندوی کی دعوت پر آپ ۱۹۳۵ء میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی سے وابستہ ہوئے اور آج تک برصغیر کے اس معروف اور معیاری علمی اور تہذیبی ادارے سے منسلک ہیں اور ان دنوں اس ادارے کے ناظم اعلیٰ، نگران اور معتمد کی حیثیت سے گرانبہا ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ آپ ۱۶ کتب کے مصنف ہیں۔ ان کے علاوہ تین ہزار صفحات سے زائد پر مشتمل مقالات ملک اور بیرونِ ملک کے مختلف علمی وادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں جن میں ایک خاص تعداد اقبالؒ کے بارے میں ہے آپ نے "مثنویاتِ اقبالؒ" کے نام سے ایک جامع کتاب تحریر کی ہے سید سلیمان ندوی کی بہت سی کتب کو آپ نے انگریزی کا جامہ پہنایا ہے۔ آپ ہندوستان اور بیرونی ممالک میں بہت سی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ برصغیر کے مشہور علمی جریدہ "معارف" کی ادارتی ذمہ داریاں بھی آپ ہی کے سپرد ہیں۔

آپ ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کے کمرہ نمبر ۵۰۳ میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں پاکستانی علماء اور ادیبوں کا ایک مجمع ہر وقت آپ سے استفادے اور خوشہ چینی میں مصروف دکھائی دیتا۔ مصروفیات کے اسی ہنگام میں خاکسار نے بھی اپنا سوالنامہ پیش کر دیا۔ جسے مولانا نے کمال محبت وشفقت سے وصول کیا اور شدید مصروفیات کے پیش نظر باقاعدہ انٹرویو دینے کی بجائے سوالنامے کے جوابات خود تحریر فرمائے۔ میں ان اوراق کو اپنے لئے ایک تبرک و سعادت محسوس کرتا ہوں۔

۱:۔ نشاۃ الثانیہ اسلام

۲:۔ دیکھئے! یہ تو بتانا بہت مشکل ہے کہ علامہ اقبالؒ کی کونسی کتاب مجھے سب سے زیادہ پسند ہے اس لئے کہ ان کی ہر کتاب اپنے اندر ایک شان رکھتی ہے۔ اور گوناگوں خوبیوں کی حامل ہے۔ البتہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ "زبورِ عجم" مجھے نسبتاً زیادہ پسند ہے یہ مجموعہ کلام فارسی میں ہے۔ اور اس میں علامہ کی فکری گہرائیاں سب سے زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال نے بھی ایک جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم

فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں!!

نثر میں ان کی کتاب " RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM

کو پسند کرتا ہوں۔ اردو شاعری میں ان کی "بال جبریل" پسند ہے، فارسی میں ان کی "جاوید نامہ" کو بار بار پڑھتا ہوں۔

۳:۔ ہمارے ادارہ دارالمصنفین سے "اقبال کامل" شائع ہوئی ہے۔ ہندوستان میں اقبال اسی کتاب کے ذریعہ سے سمجھے گئے ہیں۔ یہ مجھ کو بہت پسند ہے اس کے بعد ڈاکٹر یوسف حسین کی "روح اقبال" کو پسند کرتا ہوں۔

۴:۔ میں "معارف" کا ایڈیٹر ہوں ۱۹۶۱ء سے اس میں ڈاکٹر اقبال پر مضامین شائع ہو رہے ہیں، اگر ان کو شائع کیا جائے تو کئی جلدوں پر یہ مضامین مشتمل ہوں گے۔ ادھر دو سال کے اندر میری ادارت میں "معارف" میں اقبال پر بہت سے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ میں نے خود "مثنویات اقبال" پر ایک کتاب لکھی ہے جو زیر طبع ہے۔

۵:۔ اقبال فکری حیثیت سے اسلام کے ایک نئے متکلم ہیں۔ ان کے کلامی فکر کا مستقبل روشن ہے۔ ان کا جتنا گہرا مطالعہ کیا جائے گا۔ ان میں مستقبل کی روشنی نظر آئے گی۔

۶:۔ مردِ مومن قلندر اور درویش۔

۷:۔ اقبال کا ہر شعر پسند ہے خصوصاً فارسی کا یہ شعر بہت ہی پسند ہے ؎

من نہ گویم از بتاں بیزار شو
کافری، شائستہ زنار شو

۸:۔ وہ ایسی اسلامی مملکت چاہتے تھے۔ جہاں کے لوگ ایام کے مرکب نہیں بلکہ راکب بن کر آئیں۔

۹:۔ وہ فن کے لحاظ سے رومی، سنائی، خاقانی، خسرو، عرفی، فیضی، رضی دانش، صائب، طالب، کلیم، عبدالقادر بیدل، میر درد، میر تقی میر، اور غالب سے متاثر ہیں۔ غنی کشمیری کی رنگین نوائی داغ کا بانکپن اور شوخیٔ طرزِ بیان کو بھی پسند کرتے ہیں۔ مگر ان شعراء سے متاثر ہونے کے باوجود اپنے اندازِ بیان میں منفرد ہیں ان کے یہاں رومانیت بھی ہے۔ جذب و مستی کی کیفیت بھی ہے۔ نشاط انگیز اور ولولہ خیز جذبات بھی ہیں پھر کلاسیکیت بھی ہے۔ فلسفہ بھی ہے فکر بھی ہے وہ اپنے عمیق خیالات کو ادا کرنے میں حسن الفاظ کا بھی بے حد خیال رکھتے ہیں۔ پھر ان کی شاعری کا جو لب و لہجہ ہے وہ ایسا ہے جو دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ اور باطن میں انقلاب بھی پیدا کرتا ہے۔ اور یہ لب و لہجہ موضوع کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ جہاں سوز و گداز پیدا کرنا چاہتے ہیں ان کا لہجہ نہایت دردمندانہ ہو جاتا ہے، مگر ان کا ناصحانہ لہجہ نہایت نرم تر ہو جاتا ہے۔ مگر جہاں پیغام دیتے ہیں وہاں ان کا لہجہ نہایت تیز اور انقلاب انگیز ہو جاتا ہے۔ ان کے لہجہ میں قلندرانہ، درویشانہ اور فقیرانہ انداز بھی پایا جاتا ہے وہ قافیہ اور ردیف کے حسن کا بھی لحاظ رکھتے ہیں۔ بعض اوقات انکے ہاں غیر معروف قافیے بھی پائے جاتے ہیں، لیکن ان سے بھی تازگی کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ ان کے یہاں رستاخیز، خونریز، زرخیز اور پرویز جیسے قافیے بھی ملتے ہیں۔ وہ تشبیہ و استعارہ کے استعمال میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ بعض اوقات مرکب تشبیہات بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی لطافت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی بعض تشبیہات میں عربی زبان کا بھی انداز پیدا ہو جاتا ہے مثلاً :۔

تیری بنا پائیدار تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل

جلوۂ طور میں جیسے ید بیضائے کلیم
موجۂ نکہت گلزار میں غنچہ کی شمیم

جس طرح ڈوبتی ہے کشتئ سمین قمر
نور خورشید کے طوفان میں ہنگام سحر

وہ اپنی تلمیحات سے بھی اپنے اشعار کو بہت ہی باوقار بنا دیتے ہیں۔ گلزار خلیل، آتش نمرود، خون حسین، شبانی شعیب خون زلیخا، چادر زہرا، کشتئ مسکین، جان پاک، دیوار یتیم، مسلک شبیر، شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی، شور رومی سوز خسرو، شعلۂ خلیل، فقر مسیح، روح سلمانی، طلسم افلاطون وغیرہ جیسی تلمیحات سے ان کے اشعار میں وزن کے ساتھ بڑی روحانی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ پھر کسی موقعہ پر یہ نہیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اشعار میں آورد ہے۔ بلکہ برجستگی اور بے ساختگی کی اعلیٰ مثالیں ملتی رہتی ہیں۔ ان کے یہاں تکرار معانی بہت ہے۔ عقل، عشق، خودی، اَنا، فقر اور درویشی کے مضامین کو معلوم نہیں کتنی دفعہ ادا کیا ہے۔ لیکن ان کے ہر پیرایہ مضامین میں تازگی، نیا پن بلکہ رعنائی کا احساس ہوتا ہے۔ جس میں رفعت تخیل کی بھی پوری شان جھلکتی ہے۔ شاعر کی حیثیت سے ان کا اپنا مقام ہے اور وہ اتنا اونچا ہے کہ شاید ایک مدت مدید تک اس برصغیر میں کوئی اور شاعر ان کی اونچائی تک پہنچ سکے۔

۱۰:۔ ہم دارالمصنفین والے اقبال کو اس حیثیت سے جانتے ہیں کہ وہ صحیح معنوں میں الشعراء تلامذۃ الرحمٰن تھے۔ اور ان کی شاعری من الشعر الحکمۃ کی مصداق تھی۔ انہوں نے اپنی شاعری سے عصائے موسیٰ اور ید بیضاء کا کام لیا اور مغربی تہذیب اور جدید افکار کے ایک ایک عیب کو بے نقاب کیا۔ اور اسلام کو بڑے حکیمانہ انداز میں پیش کیا۔ وہ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ حکیم بھی تھے۔ مگر بقول میرے استاد محترم علامہ سید سلیمان ندوی وہ ارسطو کی گاڑی کے قلی نہ تھے وہ نئے فلسفے کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتے تھے۔ ہم دارالمصنفین والے اس کے بھی قائل ہیں کہ وہ کسی فرنگی فلسفی سے متأثر ہونے کے بجائے کلام پاک، رسولؐ کی زندگی، صحابہ کرامؓ کے اسوۂ حسنہ اور اسلام کے حکماء اور صوفیاء سے متأثر رہے۔ ان کا فلسفۂ خودی کلام پاک ہی سے ماخوذ ہے۔ ان کے نعتیہ اشعار سے بھی ظاہر ہے کہ خودی کا فلسفہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کیا ہے۔ یہ اشعار اس کی شہادت دیتے ہیں ؎

چو خود را در کنار خود کشیدم
بہ نور تو مقام خویش دیدم!
دریں دیرانہ نوائے صبحگاہی
جہاں عشق و مستی آفریدم!

(ارمغان حجاز)

جان از عشق و عشق از سینۂ تست
سرورش از مئے دیرینۂ تست
جز ایں چیزے نمیدانم ز جبریل
کہ او یک جوہر از آئینۂ تست (ارمغان حجاز)

اور اگر ان کی تحریروں اور اشعاروں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ رُومی کے علاوہ غزالیؒ ابن خلدون، ابن حزم، فخر الدین رازی، البیرونی، عراقی، ابن تیمیہ اور جمال الدین افغانی سے متاثر ہیں۔ صوفیوں میں حلاجؒ، فضل بن ایاز، جنید بغدادی، بایزید بسطامی، حضرت داتا گنج بخش، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ نظام الدین اولیاء، خسرو، حضرت عبدالقدوس گنگوہی اور شیخ مجدّد الف ثانی کے عارفانہ خیالات کا بھی ان پر گہرا اثر ہے ہم دارالمصنفین والے ان کو عاشق رسولؐ، شاعر، فلسفہ اسلام کا ترجمان، عارف، فلسفی اور کاروانِ ملت کا حدی خوان سمجھتے ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور

اردو ادب کے تنقیدی سرمائے میں پروفیسر آل احمد سرور کا نام بہت بلند آہنگ ہے۔ میانہ قد، سرخ و سپید رنگت، دانتوں پر پان کے اثرات، نظر کی رنگین عینک، کلین شیو، سر کے بال چاندی کی طرح سفید، لہجے میں کاٹ، اور مزاج میں طرحداری ہے۔ آپ کے ساتھ آپ کی بیگم بھی تشریف لائی ہوئی تھیں۔ ۱۹۱۲ء میں سرور صاحب ہندوستان کے قصبہ بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آپ نے بی۔ ایس۔ سی۔ ایم۔ اے (انگریزی) اور ایم۔ اے (اردو) کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۵ء تک علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی میں لیکچرار رہے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۵ء تک لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبہ اردو میں ریڈر رہے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۸ء تک علی گڑھ یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ ۱۹۵۸ء ۱۹۷۳ء تک پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے کام کیا۔ مئی ۱۹۷۷ء سے کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر" اقبال چیئر" کی حیثیت سے تعینات ہیں۔ آپ انجمن ترقی اردو ہند کے اعزازی سیکرٹری رہے ہیں۔ ان دنوں ہفتہ وار رسالہ" ہماری زبان" اور سہ ماہی جریدے" اردو ادب" کے مدیر ہیں۔ تنقیدی ادب میں آپ کی چھ گرانقدر تصنیفات شائع ہو چکی ہیں۔ شاعری پر دو کتب درجہ کتب دیگر موضوعات پر مرتب کی ہیں۔ اقبالیات پر آپ کی کتاب" اقبال اور ان کا فلسفہ" لاہور سے ابھی دنوں شائع ہوئی ہے۔ اور" اقبال بحیثیت شاعر" زیرِ طبع ہے۔ آپ کے پچاس سے زیادہ مضامین اردو اور انگریزی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ بہت سے ممالک اور امریکی یونیورسٹیوں میں لیکچر دے چکے ہیں۔ پروفیسر سرور صاحب اقبال سے خصوصی لگاؤ رکھتے ہیں۔ آپ نے اقبال پر کبھی روایتی انداز میں نہیں لکھا ہے۔ بلکہ ان کا قلم اقبال فہمی اور اقبال شناسی کے بہت سے نکتے بکھیرتا ہے۔ سرور صاحب کی علامہ سے مراسلت بھی رہی ہے۔ اور ملاقات بھی خصوصاً مسولینی کے سلسلہ میں آپ کے نام حضرت علامہ کا مکتوب ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

راقم الحروف جب انٹرویو کی غرض سے سردر صاحب سے ملا تو آپ نے بڑی محبت سے کمرہ نمبر ۶۴۳ میں آنے کی دعوت دی۔ میں اپنے ذہن میں ذوقِ طلب کی دنیا بسائے کشاں کشاں وہاں پہنچا تو اگرچہ بیگم سرور ان کے ساتھ کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ لیکن انہوں نے کمال مروت اور مہربانی سے میرے سوالنامے کی گرہوں کو کھولنا شروع کر دیا۔ اس لذت کشودگی سے آپ بھی لطف اندوز ہوں۔

۱:۔ میرے خیال میں اقبال نے اپنے پیغام کے مرکزی نقطہ کو چند اشعار میں پیش کیا ہے ؎

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

اقبال کے ہاں ارضیت اور ماورائیت کا امتزاج ملتا ہے ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار کر!

دنیا میں انسان کا کام بڑے تخلیقی مقاصد رکھتا ہے۔ اس لیے اپنے خونِ جگر سے دنیا کو جنت بنانا ہی اقبال کے پیغام کا مرکزی نقطہ ہے۔

۲:۔ اردو میں "بال جبریل" اور فارسی میں "پیام مشرق" اور "جاوید نامہ" زیادہ پسند ہیں۔ اردو شاعری کی بلندی مجموعی طور پر "بال جبریل" میں نظر آتی ہے۔ "پیام مشرق" اور "جاوید نامہ" میں شعر و حکمت، آفاقیت اور عصریت دونوں ملتی ہیں۔ جاوید نامہ بالخصوص تخیل کی پرواز، اور انسانیت کے کارواں کے اہم منازل کا ایک بڑا خلاقانہ عکس ہے۔

۳:۔ فکرِ اقبال پر اچھی کتاب تو لکھی جائے گی اور گہری سوچ کے بعد کہا کہ اہم کتاب تو خلیفہ عبدالحکیم کی "فکرِ اقبال" ہے۔ مگر اس میں بھی اقبال کے ساتھ انصاف نہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی "روحِ اقبال" کے بعض اجزاء میں فن پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ قابلِ قدر ہے۔

۴:۔ اقبالیات پر تحقیقی سلسلہ میں اب کچھ کام کرنے کا ارادہ ہے میں نے اپنے بعض مضامین اقبال کی ترجمانی اور اقبال کے فکر و فن کے تجزیئے کی کوشش کی ہے۔ میری دو کتابیں۔ ایک مکتبہ عالیہ لاہور سے "اقبال اور اس کا فلسفہ" کے نام سے اور دوسری "عرفانِ اقبال" کے نام سے شائع ہوئی ہے، مگر میں نے اسے ابھی تک نہیں دیکھا ہے جو کام میں کر رہا ہوں وہ اقبال کے فن پر "ہمالیہ" سے لے کر "ابلیس کی مجلس شوریٰ" تک اہم نظموں کا تنقیدی مطالعہ ہے۔

۵:۔ آپ نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پان کی گوری منہ میں دبائی اور گنگناتے لفظوں میں کہا کہ صورتِ حال یہ ہے کہ اب دنیا میں جو ترقی یافتہ ممالک ہیں۔ عالمی پس منظر میں ان کی صورتِ حال یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک، ترقی یافتہ اقوام سے اپنی آئندہ زندگی کا عکس لیتے ہیں۔ اب تک تو یہ صورتحال تھی کہ برصغیر میں اور دوسرے ترقی پذیر ممالک

میں مغرب ایک ماڈل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب جب کہ برصغیر اور افریشیائی اقوام کو آزادی کی نعمت ملی ہے تو یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ مغرب سے ہر چیز لو۔ مگر مغربیت قبول نہ کرو۔ ہم مغرب کے اداروں کو بجنسہٖ یہاں نہیں لائیں گے مگر اپنے حالات کے مطابق انہیں ڈھالیں گے۔ ترقی پذیر ممالک میں اپنی خودی کا احساس بڑھ رہا ہے۔ اور اس کے لئے یورپ یا امریکہ کی تقلید ضروری نہیں۔ اقبال اس نکتے کو سمجھ چکے تھے کہ مغرب کی اہمیت علم و فکر میں ہے۔ لاطینی یا انگریزی زبان میں نہیں۔ مغرب کی ترقی اور عروج بھی عربوں کی دین ہے۔ مغرب کی روح کو سمجھا جائے اور اس کے بظاہر روشن پہلو سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ پس اقبال کی معنویت یوں ظاہر ہوئی کہ ہم مغرب سے صنعت و حرفت لے سکتے ہیں۔ مگر بجنسہٖ مشرق کو مغرب نہیں بنا سکتے۔ ہمیں ایک طرف روایت کے عرفان سے اور دوسری طرف حال کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونا ہے۔

۶:۔ اقبال کے یہاں جو زندگی میں درویشانہ انداز ملتا ہے اور محض حب جاہ و مال سے بے نیازی دکھائی دیتی ہے جسے انہوں نے فقر کہا ہے۔ میں اسے بہت اہم سمجھتا ہوں۔ شاعرانہ اعتبار سے مکالمہ "جبریل اور ابلیس" میں ابلیس کا کردار حسن تخلیقی توانائی کا حامل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال اسے ایک رومانی پیکر سمجھتے ہیں۔ اقبال کے ہاں اس انداز کا تفکر مجھے بہت ہی پسند ہے۔

۷:۔ پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ آپ کی شرط بہت کڑی ہے۔ بہر طور اردو میں مجھے یہ شعر پسند ہے ؎

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے۔

اور فارسی میں یہ شعر لکھ لیجئے ؎

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد ز باد صبح
در کار زندگی صفت سنگ خارا ایم

۸:۔ اس سوال پر آپ نے قدرے توقف کے بعد کہا کہ اقبال کی تحریروں میں پہلے ان کا خطبۂ الہ آباد ہے۔ اس کے بعد وہ خطوط جو جناح صاحب کو لکھے گئے تھے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کی اصطلاح بعد کی وضع کردہ ہے[1] اقبال یہ چاہتے تھے کہ شمال مغربی ہندوستان کے ریاستوں کو ایک اکائی مان لیا جائے تاکہ یہاں کے باشندوں کی اکثریت اپنی اجتماعی خودی کا بھرپور اظہار کر سکے اور اس کی تکمیل کر سکے۔

۹:۔ اس سوال پر سرور صاحب کے چہرے پر شگفتگی کی ایک لہر دوڑ گئی اور آپ نے فرمایا کہ میں اقبال کو بہت بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ اگر اقبال کے "لیکچر" ہمارے سامنے نہ بھی ہوتے تب بھی بحیثیت شاعر ان کا درجہ مسلم تھا۔ اقبال کی عظمت اس بات میں ہے کہ ایک طرف وہ اردو اور فارسی کی ساری روایات کے محرم ہیں اور ان کے فن میں تشبیہات و استعارات اور ان کے رمز و ایماء کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور انہوں نے اس روایت کی توثیق اور تجدید

---

[1] ظاہر ہے یہ ایک بھارتی شہری کا نقطۂ نظر ہے۔ جو مستند حوالوں سے غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔ (مرتب)

کی ہے۔ اور بہت سے الفاظ کو نئے مفاہیم اور معانی عطا کئے ہیں۔ پھر ان کے ہاں جو غنائی لہجہ ہے وہ بھی بلندی رکھتا ہے اور ان کی شاعری کے ڈرامائی پہلو میں شاعری کی ایک بہت اہم آواز ملتی ہے۔ اس لئے میں اقبال کو ان عظیم شاعروں میں سے سمجھتا ہوں۔ جنہوں نے نہ صرف اردو میں نظم نگاری کو، جو ان سے پہلے گھٹنوں چل رہی تھی، علو عطا کیا بلکہ غزل کو جو حالی کی کوششوں کے باوجود زیادہ تر حدیثِ دلبری تھی صحیفۂ کائنات بنا دیا۔ اقبال کی غزلیں اپنے پیشرووں اور ہم عصروں کی غزلوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان میں فلسفہ بھی ہے اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ بھی۔ مگر غزل کا لب ولہجہ اور آہنگ برقرار رہتا ہے۔ پھر اقبال کے بلند آہنگی کے باوجود حسن ملتا ہے۔ اور جس طرح انہوں نے اپنے مردِ مومن کو جلیل وجمیل کہا ہے۔ اس طرح ان کا اسلوب بھی جلیل وجمیل تھا۔

۱۰:- پروفیسر صاحب نے اپنا بایاں ہاتھ چاندی سے چمکتے ہوئے ملائم بالوں پر پھیرا اور یوں گویا ہوئے کہ میں سب سے پہلے تو اقبال کو ایک شاعر کی حیثیت سے مانتا ہوں لیکن اقبال کا کمال یہ ہے کہ ان کی حیثیت صرف ایک بڑے شاعر کی نہیں بلکہ وہ ایک اہم فلسفی بھی ہیں۔ اور شاعری میں جو بات رمز وایما ر میں بیان ہوئی ہے فلسفہ میں اس کی وضاحت ملتی ہے۔ اپنی نثری تحریروں اور خطبات میں اقبال کے ہاں ایک اور پہلو ملتا ہے۔ جس کو ہم دانشوری کہہ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے اقبال کے یہ تینوں پہلو میرے نزدیک اسی ترتیب سے اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۱:- ع ماز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم

انٹرویو ختم ہوا میں نے اجازت چاہی۔ رخصت ہوا تو اردو ادب کے اس کوہ گراں کا سایہ ہمارے ساتھ تھا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

یہ معروف نام، برصغیر کے مشہور شاعر تلوک چند محروم کے فرزندِ ارجمند کا ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی شاعری کا پہلو متوارث ہے۔ پروفیسر موصوف سے مل کر مجھے یہ احساس ہوا کہ اردو زبان کے تہذیبی تشخص کے اثرات بہت واضح انداز میں آزاد کی شخصیت پر مرتب ہوئے ہیں۔ متناسب اور گٹھا ہوا قد، حسن ملیح، چہرے پر چشمہ، ملنسار، نرم وآمیز باتوں میں گلوں کی خوشبو، لہجے میں پیار کا رچاؤ، چال میں میانہ روی، چہرے پر تفکر کی چھاپ، اور شخصیت میں اپنائیت یہ ہیں پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جن کا شمار اقبالیات کے ممتاز مفکرین میں ہوتا ہے۔ آپ عیسیٰ خیل ضلع میانوالی (پاکستان) میں ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ آپ مدت العمر تک حکومت ہندوستان میں سری نگر کے مقام پر ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز اور پریس انفارمیشن بیورو میں کام کرتے رہے۔ ابھی حال میں آپ نے جموں یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے پروفیسری کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں۔ آپ کثیر تعداد میں مضامین اور کتب کے مصنف ہیں۔ آپ نے اقبال کی حیات اور شاعری پر بہت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اپنے مطالعات کو مضامین اور کتب کی صورت میں قلمبند کیا ہے آپ نے کشمیر، جموں، دہلی اور علی گڑھ کی یونیورسٹیوں میں اقبال پر خصوصی لیکچر دیئے ہیں۔ آپ نے حیاتِ اقبال کو تصاویر کے حوالے سے بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ اردو ادب کے بالغ نظر ادیب ہیں۔ آپ کے رشحاتِ قلم ادب

میں ایک دائمی حسن کے حامل ہیں ۔

ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل جس کے ہال میں اقبال کانگریس منعقد ہو رہی ہے ۔ اس کا کمرہ نمبر ۳۲۳ ان دنوں مرجع خلائق بنا ہوا ہے ۔ صحافی ، ادیب ، شاعر ، عام شہری اور سیاستدان سبھی پروفیسر صاحب سے ملنے کے لئے آ رہے ہیں ۔ مختلف اداروں اور انجمنوں میں آپ کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں ۔ مختلف اشاعتی اداروں کی طرف سے آپ کو کتابیں تحفہ کے طور پر پیش کی جا رہی ہیں ۔ اور ان کا ایک انبوہ آپ کے کمرے میں دکھائی دے رہا ہے ۔ میں جب انٹرویو کی استدعا لئے آپ کے کمرے میں حاضر ہوا تو اس وقت مشہور ملکی سیاستدان ملک غلام جیلانی آپ سے مصروف گفتگو تھے ۔ لیکن آج ان کا موضوع سیاسی جھمیلوں کے برعکس ماضی کی یادوں کے دریچے سے جھانکتے ہوئے گزشتہ لاہور کے در و بام تھے ۔ میں نے عرض حال بیان کیا تو آپ نے کسی دوسرے وقت آنے کو کہا لیکن پھر خود ہی مائل بہ کرم ہوئے اور ملک صاحب کی موجودگی میں یہ انٹرویو لیا گیا ۔ میرے ساتھ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی بھی تھے ۔ لیکن آپ تو آزاد صاحب کے ساتھ تصویر اتروانے کے بعد واپس نمائش گاہ اقبال میں تشریف لے گئے ۔ اور میں اپنے کام میں مشغول ہو گیا ۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے نہایت مختصر مگر جامع جوابات عنایت فرمائے ۔ لیجئے سوغات حاضر ہے ۔

آپ نے باقاعدہ انٹرویو سے پہلے ہندوستان میں اقبالیات کی صورت حال پر مختصر تبصرہ کیا کہ وہاں ۵۵ یونیورسٹیوں میں اردو زبان وادب کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ ۵۰ یونیورسٹیوں میں مطالعہ اقبال کا خصوصی انتظام ہے جموں یونیورسٹی میں ایم فل کی سطح پر اقبال پر تحقیقی کام جاری ہے ۔

۱ :- اقبال کے پیغام کا مرکزی نقطہ "جب آدم" ہے ؎

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم ! !
مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم ؟

۲ :- اس سوال پر آپ کی آنکھوں میں خیالات کے کنول کھل اٹھے اور آپ نے فرمایا کہ میرے نزدیک اقبال کے تمام کام اعلیٰ درجہ کے ہیں ۔ لیکن اردو میں "بال جبریل" اور فارسی میں "جاوید نامہ" اعلیٰ تر ہیں ۔ ایک طویل وقفہ کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں تو اقبال کو اردو کا سب سے بڑا شاعر مانتا ہوں ۔

۳ :- پروفیسر صاحب نے شگفتہ مزاجی سے کہا کہ یوں تو مجھے اپنی کتابیں بھی پسند ہیں ۔ مگر بشیر احمد ڈار کی کتاب ——
" IQBAL AND POST-KANTIAN- VOLUNTARISM " میں اقبال کے فلسفیانہ پہلو کو خوب اجاگر کیا گیا ہے ۔ اردو میں ڈاکٹر یوسف حسین خان کی " روح اقبال " مجھے پسند ہے ۔

۴ :- میں نے اقبال پر بہت کچھ لکھا ہے ۔ باقاعدہ تصانیف میں " اقبال اور اس کا عہد " " اقبال اور مغربی مفکرین " " اقبال کی کہانی " " اقبال ، زندگی ، شخصیت اور شاعری " " محمد اقبال " کے نام سے ایک کتاب زیر طبع ہے " " اقبال اور کشمیر "

"مرقعِ اقبال" اور "بچوں کا اقبال" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی اور اردو میں بہت سے مقالات کا ایک مجموعہ عنقریب شائع ہوگا۔

۵:۔ آپ نے برجستہ کہا کہ اقبال تو اب دریافت ہوا ہے۔ اس DISCOVERY OF IQBAL کے بعد اقبال پر اصل کام تو اب شروع ہوگا۔

۶:۔ آپ نے مختصراً فرمایا صدق مقال اور اکل حلال۔

۷:۔ فارسی کا یہ شعر لکھ لیجئے ؎

تو نہ دانی ہنوز شوق بمیرد ز وصل

چیست حیات دوام، سوختن ناتمام

اور اردو میں یہ شعر زیادہ پسند ہے ؎

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو

نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

۸:۔ اس سوال پر آپ کے ہاں تذبذب کا ایک رویہ موجود تھا۔ پروفیسر صاحب نے کہا یہ بہت طویل سوال ہے۔ اس موضوع پر جواہر لال نہرو کی تحریریں بھی ملتی ہیں۔ بہر طور مسلم لیگ کے الہ آباد کے سیشن میں جو ایڈریس علامہ اقبال نے پڑھا۔ اس میں اس کی اساس موجود ہے۔ اور اسی میں پاکستان کی تصویر ہے۔

۹:۔ صوفہ پر کروٹ لیتے ہوئے آپ یوں گویا ہوئے کہ اقبال کا فنی مقام بہت بلند ہے۔ جو دوسری زبانوں میں ملٹن، دانتے فردوسی اور رُومی کا ہے۔

۱۰:۔ اس سوال پر آپ نے متعجبانہ لہجے میں فرمایا کہ اقبال تو ایک ہی تھا۔ دو نہیں تھے۔ شاعر اقبال اور فلسفی اقبال دو نہ تھے۔ ہمیں اقبال کے فلسفے کا مطالعہ ان کے شعر سے ہی کرنا ہے۔ وہ عظیم شاعر کیسے ہوسکتا ہے۔ جس کے ہاں عظیم خیال اور جذبہ موجود نہ ہو۔

۱۱:۔ آخری سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے کہا کہ فلسفے کو ہوا میں معلق نظریہ نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ ہماری زندگی میں ڈھلنا چاہیئے۔ جیسے کہ مغرب میں رہا ہے۔ مغرب میں فلسفہ ایک مضمون ہے۔ لیکن مشرق میں یہ تمام مضامین کو پڑھنے کی ایک کلید ہے۔

سوال و جواب کا سلسلہ ختم ہوا لیکن پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی مصروفیات کا وہی عالم تھا۔

ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف

ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف ـــــ یہ نام اپنا سا ہے مگر ذہن کس قدر مسموم اور رویے کتنے تبدیل ہوگئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب شاہراہ قائداعظم پر واقع عجائب گھر میں ایک تصویری نمائش دیکھنے میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ

ڈاکٹر اے ۔ ایس سوخوچوف اور ڈاکٹر یوسانی بھی تھے ۔ یہ سب حضرات ممتاز پاکستانی فنکار اسلم کمال کی تصاویر کو بڑی تحسین اور محبت کے ساتھ دیکھ رہے تھے ۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے اقبال کے بارے میں انٹرویو لینے کی درخواست کی تو آپ نے خوش دلی کے ساتھ رات ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے کمرہ نمبر ۱۲ میں آنے کو کہا ۔ وقت مقررہ پر راقم الحروف نے دستک دی ۔ ڈاکٹر صاحب نے مزاج پرسی کے بعد سوالنامے کے بارے میں ڈاکٹر اے ۔ ایس سوخوچوف سے روس کی کسی علاقائی زبان میں گفتگو کی جو میری سمجھ سے بالاتر تھی ۔ لیکن ان ہر دو بزرگوں کے چہروں پر پھیلی ہوئی تشویش اور اندیشہ ہائے گوناگوں کی پرچھائیاں دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ شاید یہ سوالنامے کو اپنے مزاج کے موافق نہیں پا رہے ہیں ۔ کچھ لمحوں بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا ۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب انگریزی ، روسی اور تاجیکستانی زبان کے علاوہ فارسی اور اردو زبان میں بھی اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتے ہیں ۔ فارسی آپ زیادہ روانی سے بول سکتے تھے ۔ مجھے فارسی کی کچھ شد بد تھی ۔ لہٰذا میرے سوال انگریزی میں اور ان کے جوابات فارسی میں دیئے گئے ۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ میں روس میں تاجکستان کی اکادمی علوم میں صدر شعبہ ہند و پاکستان ہوں ۔ اقبال دنیا کے ان عظیم فنکاروں میں شامل ہے جن کے کلام کو روسی عوام بڑی عزت اور احترام کے ساتھ پڑھتے اور سنتے ہیں ۔ اقبال کے بہت سے کلام کا روسی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے ۔ اور ہماری ریاستوں میں تو فارسی بولنے اور سمجھنے والے بہت سے لوگ موجود ہیں ۔ اس لئے اقبال ان کے لئے اجنبی نہیں ہے ۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں تفکر اور ٹھہراؤ تھا ۔ آپ میانہ قد ، سرخ و سپید رنگت ، وجیہہ چہرہ ، دوہرا جسم اور کشادہ جبیں بزرگ ہیں ۔ سوال وجواب کا سلسلہ مختصر طور پر جاری رہا ۔ اس سے آپ روس میں اقبال شناسی کے رویے کا جائزہ لے سکتے ہیں ۔

۱ : میرے خیال میں اقبال کے پیغام کا مرکزی نقطہ انسان کی آزادی اور عظمت انسانی کا احترام ہے ۔ ان کی شاعری میں اعلیٰ دوستی کا پیغام موجود ہے ۔ ان کے ہاں افراد کے درمیان رفاقت اور عالمی برادری کا تصور بھی موجود ہے اقبال برصغیر کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مغربی استعمار اور اس کے ظلم و ستم کے خلاف مؤثر آواز اٹھائی

۲ : یوں تو مجھے اقبال کی سب ہی کتابیں پسند ہیں مگر " جاوید نامہ " اور " پس چہ باید کرد اے اقوام شرق " خصوصیت سے پسند ہیں ، کیونکہ ان مجموعوں میں ان کے انقلابی عقائد کا اظہار ہوتا ہے ۔ محمد اقبال ہندوستان میں پہلا شاعر تھا جس نے انقلاب روس کا خیر مقدم کیا ۔ ان کے اردو اشعار اس کی گواہی دیتے ہیں ؎

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشم آدم کب تلک

اور پھر پیام مشرق میں فارسی زبان میں کہتے ہیں ؎

شرارِ آتشِ جمہور کہنہ ساماں سوخت　　　　ردائے پیر کلیسا ، قبائے سلطاں سوخت

۳ :- مجھے "اقبال کامل" بہت پسند ہے۔ (ڈاکٹر سوخروف سے رجوع کرتے ہوئے مجھے جواب دیا۔) کہ اسے عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے۔ اور اس میں بہت سے مسائل آگئے ہیں۔

۴ :- میں نے اقبال پر تین کتابیں اور بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ میری پہلی کتاب "محمد اقبال — حیات و آثار" ہے۔ دوسری کتاب "فارسی ہند و پاکستان در نیمہ دوم نوزدہم و عصر بست" ہے۔ اور تیسری کتاب "محمد اقبال" کے نام سے سات فصلوں پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ کچھ مضامین بھی لکھے ہیں۔

۵ :- اس سوال پر آپ کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوئی، چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور کہا کہ محمد اقبال آج کل بہت مشہور ہے۔ لیکن مستقبل میں مزید شہرت اختیار کرے گا۔ کیونکہ وہ بنیادی طور پر انسان کا وصف بیان کرنے والا شاعر ہے اور ظلم و استبداد کا شدید دشمن ہے۔

۶ :- وہ پیش قدم لوگوں میں سے تھا۔ وہ بیک وقت مشرقی بھی تھے۔ اور مغربی بھی۔ لیکن نوعِ انسان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی شخصیت میں محبت کا یہ پہلو مجھے بہت پسند ہے۔

۷ :- اردو شاعری میں مجھے "خضر راہ" بہت پسند ہے جب کہ فارسی میں مجھے وہ نظم پسند ہے جس کا ایک بند یہ ہے ؎

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز
کاشانۂ ما رفت بتاراجِ غماں خیز
از نالۂ مرغِ چمن، از بانگِ اذاں خیز
از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز!
از خوابِ گراں خیز

۸ :- پاکستان کا تصور اقبال نے مسلم لیگ کے ایک جلسہ الہ آباد میں صدارت کرتے ہوئے پیش کیا تھا۔

۹ :- اقبال کو جہانِ ادب میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔ آپ مشرق و مغرب کے عظیم شاعر ہیں اور ان کے فن میں تازگی ہے۔

۱۰ :- ہم اقبال کو ایک سیاسی شاعر کی حیثیت سے زیادہ پہچانتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ شاعرِ انقلاب ہیں، بعد میں کچھ اور ہیں۔

۱۱ :- اقبال کے فلسفہ میں انسانی عظمت کے راگ الاپے گئے ہیں۔ اور ان کی شاعری انسان شناسی پر مبنی ہے۔

بہر انسان چشمِ من شبہا گریست
تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
از درونِ کارگاہِ ممکنات !!!
برکشیدم سرِّ تقویمِ حیات !!

(اسرار و رموز)

انٹرویو کے آخر میں آپ نے ارمغان حجاز کا یہ قطعہ اپنے ہاتھوں سے لکھا ؎

خدا آں ملتے را سروری داد
کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت
بہ آں ملت سروکارے ندارد
کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

انٹرویو ختم ہونے کے بعد باہر نکلا تو رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ اور فضا میں ایک ہمہ گیر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جسے ہوٹل کے سامنے کی شاہراہ پر سے گزرنے والی گاڑیاں کبھی کبھی توڑ دیتی تھیں۔

ڈاکٹر انور شبنم دل

عجز و انکسار کا مرقع، شرافت و متانت کا پیکر، خلوص و وفا کا مجسمہ، علم و حلم کی تصویر، سوز نفس کا شاہکار، جلال و جمال کی تفسیر، زبان و ادب کا نقاد اور اقبال کے تصورات کا ایک سنجیدہ قاری ——— یہ ہیں۔ جناب پروفیسر ڈاکٹر انور شبنم دل صاحب جو جغرافیائی اعتبار سے تو اسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن مدت العمر سے امریکہ کی انٹرنیشنل یونیورسٹی سان ڈائیاگو میں زبانوں کی سائنس اور ابلاغ کے پروفیسر ہیں۔

(PROF. OF LANGUAGE,SCIENCE AND COMMUNICATION)

انٹرنیشنل کانگرس میں ڈاکٹر صاحب یہاں اپنے علم کا جادو جگا رہے تھے۔ اور اپنی شخصیت و وضع داری کی خوشبو پھیلا رہے تھے۔

مجھے ایک دوست غالباً پروفیسر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کے عظمت کردار کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ کو امریکہ کی مستقل شہریت کی پیش کش کی گئی تاکہ وہ یونیورسٹی میں مستقلاً پڑھا سکیں۔ تو آپ نے پاکستان سے اپنی والہانہ محبت کے پیش نظر اسے ٹھکرا دیا۔ نتیجۃً آپ کی سروس کو ختم کرنے کا نوٹس دے دیا گیا۔ مگر آپ نے اس کی سرمو پرواہ نہ کی۔ ان کے کردار کی عظمت کا یہ نتیجہ ہے کہ ابھی تک اسی جگہ کام کر رہے ہیں۔ آپ کی بیگم ڈاکٹر عافیہ دل بھی اسی یونیورسٹی میں آپ کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ اور یہاں ڈاکٹر صاحب نے زبانوں کی سائنس پر بہت بنیادی کام کیا ہے آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو بیرون ملک خدمت سے اپنے ملک کا نام روشن کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے گزشتہ دنوں USIV امریکہ میں اقبال علیہ الرحمۃ کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ایک دو روزہ انٹرنیشنل کانگرس کا اہتمام کیا۔ جس کا دعوت نامہ اور پروگرام یہ سطور لکھتے ہوئے میرے سامنے ہیں۔ اس کے بعد آپ یہاں پاکستان میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ کانگرس میں تشریف لائے ہیں۔ آپ انٹرکانٹی نینٹل ہال میں اقبال پر ترتیب دی گئی نمائش دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے۔ تو ابتدائی تعارف کے بعد میں نے آپ سے اقبال

پر انٹرویو کے لئے وقت کی درخواست کی۔ آپ نے اسے قبول کیا۔ اور کل صبح صادق کے وقت ہوٹل میں موجود مسجد میں تشریف لانے کی دعوت دی کہ وہاں فجر کی نماز کے بعد اس کے بارے میں کچھ فیصلہ کریں گے۔ لیکن انٹرویو آپ کے کمرہ نمبر ۱۵۱ ہی میں لیا جا سکا۔ ڈاکٹر صاحب مختلف وفود سے علمی گفتگوؤں میں مشغول تھے کہ میں نے شام سے قبل وقفہ میں آپ کو مجبور کیا۔ کہ آج آپ مجھے وقت ضرور عنایت فرما دیجئے۔ ڈاکٹر صاحب مجھے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں تشریف لے گئے اور وہاں آپ نے رسمی گفتگو کے بعد اپنا ٹیپ ریکارڈ آن کیا۔ اور انٹرویو کے مراحل شروع ہو گئے۔

۱۔ میں ماہر اقبالیات تو نہیں ہوں لیکن جہاں تک میں نے اقبال کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں ایک نکتہ مجھے بہت پسند ہے۔ کہ اقبال چاہتے ہیں کہ انسان اپنی شخصیت کی تعمیر نو کرے۔ اور آج کی دنیا کے مسائل زندگی کو حل کرے جس سے انسان کی ساخت اور تخلیق کا مقصد پورا ہو سکے۔ اس سلسلہ میں ہمیں ماضی کی روایات و اقدار کا سہارا لینا ہوگا۔ لیکن اس طرز زندگی کی اساس صرف اسلام پر رکھی جا سکتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا کو کوئی نیا دین پیش نہیں کیا۔ رسول کریم کی زندگی ایک عام انسان کی زندگی کی طرح ہے۔ لیکن اس شخصیت نے جو پیغام دیا وہ ازلی اور ابدی ہے۔ آپ نے بہت زور دے کر کہا کہ اقبال کے پیغام کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ تخلیق ارتقاء ہے اور ارتقاء ہی تخلیق ہے۔

۲:۔ اقبال کے شعری مجموعوں اور دیگر تصانیف میں مجھے "جاوید نامہ" خصوصیت سے پسند ہے۔ اقبال نے جو سوچا اور جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے۔ جس کے لئے انہوں نے نثر، شعر اور خطوط میں لکھا، مطالعہ کیا۔۔۔۔ یہ تمام باتیں صرف "جاوید نامہ" میں نظر آتی ہیں۔ "جاوید نامہ" میں اقبال کے ذہن کا حتمی رُخ کا تعین ہوتا ہے مجھے افسوس ہے کہ اقبال کی زندگی کے آخری سالوں میں صحت کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے بہت سے کام ادھورے رہ گئے۔ اور کچھ بالکل نہ ہو سکے۔ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ اقبال کن موضوعات پر سوچتے تھے۔

۳:۔ ڈاکٹر ول خیالات کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کہ میں نے اگلا سوال پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ڈاکٹر این میری شمل کی کتاب "GABRIEL.S WING" بہترین کتاب ہے۔ اس کتاب میں اقبال کے مذہبی افکار سے بحث کی گئی ہے۔ اور یہ اقبال فہمی میں شاہ کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ سید ابو الحسن ندوی کی کتاب "THE GLORY OF IQBAL" (نقوش اقبال) بھی بہت اہم ہے۔ گو یہ ابتداً عربی زبان میں لکھی گئی مولانا نے فہم اقبال کا حق ادا کر دیا ہے۔ مگر کہیں کہیں اختلاف بھی کیا ہے۔ لیکن انہوں نے اقبال کو ایک عظیم مفکر کے طور پر پڑھا ہے۔ تیسری کتاب خلیفہ عبد الحکیم کی "فکر اقبال" ہے۔ خلیفہ صاحب کے عقائد و افکار کے بارے میں لوگ جو رائے رکھیں مگر وہ اقبال کے کلام کو سمجھنے والے گنتی کے لوگوں میں شامل ہیں۔ خلیفہ صاحب کی شخصیت میں مشرق و مغرب کا ملاپ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام کے جو بنیادی اصول ہیں ان پر اکٹھے ہونا چاہیئے۔

۴:۔ ڈاکٹر صاحب نے ذہن کے دریچوں کو وا کیا۔ اور اس سوال کے جواب کی تلاش میں دُور تک نکل گئے اور بالآخر

فرمانے لگے کہ میں اس میں چار باتیں کہونگا۔ اوّلاً میں نے پچھلے چند سالوں میں محنت کے بعد ایک کتاب تیار کی ہے۔ "THE VISION OF IQBAL" اس کا عربی، فارسی اور اردو میں ترجمہ "بصیرت اقبال" کے نام سے شائع ہوگا۔ بیگم حافیہ دل اس کا بنگلہ میں ترجمہ کریں گی۔ اس کتاب میں اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ اقبال کے VISION کی عصر حاضر کو کیا ضرورت ہے۔

ڈاکٹر حافیہ دل نے اپنے مقالے میں تین سوال اٹھائے ہیں۔ اقبال جب فوت ہوئے تو ۱۱ بجے کلکتہ میں وفات کی خبر پہنچی۔ "THE STAR OF INDIA" نے ڈیڑھ ماہ تک ہر روز اپنی اشاعت کو اقبال پر مضامین کے لئے وقف رکھا۔ مسلم بنگال نے اقبال کو ایسے کیوں یاد کیا۔ اس لئے کہ مسلم بنگال کو انگریزوں اور ہندوؤں کی نسبت سب سے زیادہ مار پڑی۔ بنگالی مسلمانوں کو اپنے مصائب کا حل اقبال کی فکر میں نظر آیا۔ لہٰذا انہوں نے اقبال کے کلام اور فکر سے محبت کی۔ اس وقت مشہور بنگالی شاعر نذرالاسلام نے بھی بغاوت، آزادی اور اسلام پر نظمیں لکھیں۔ لیکن اس کے جذبات میں توجید کی کمی تھی۔ اس لئے وہ کوئی واضح پیغام نہیں دے سکا۔ اس کمی کو اقبال نے پورا کیا۔ تیسری بات حافیہ صاحبہ کے مقالہ میں یہ ہے کہ آیا بنگالی مسلمانوں پر یہ اثر ہنگامی نوعیت کا تھا۔ اور اب جب کہ بنگلہ دیش بن گیا ہے۔ تو کیا یہ تصور کر لیا جائے کہ اقبال کے نظریات کی نفی ہوئی ہے۔ محترمہ حافیہ صاحبہ نے ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں دیا ہے۔ یعنی بنگلہ دیش کے قیام نے اقبال کے تصورات کی نفی نہیں کی، نہ ہی بنگالیوں پر ان کے اثرات ہنگامی نوعیت کے تھے۔

میری دوسری کتاب کا نام "IQBALS THOUGHT AND THE EMERGENT WORLD ORDER" ہے

میری تیسری کتاب "POEMS OF IQBAL" ہے۔ اس میں پچاس نظموں کا ترجمہ پانچ طریقوں سے کیا جائیگا صوتیاتی اعتبار سے لوگ اسے پڑھ سکیں گے۔ لفظی ترجمہ ہوگا۔ نظم کی ساخت میں بھی معنی ہوتے ہیں۔ INTERNATIONAL PHONETIC ALPHABET میں بھی اس کو ڈھالا جائے گا۔ نیز ہر لفظ کے نیچے ترتیب وار ترجمہ بھی موجود ہوگا۔

ایک چوتھی کتاب بین الاقوامی سطح پر اقبال پر لکھے جانے والے ان مقالات پر مشتمل ہوگی۔ جو فارسی، روسی، چینی انگریزی اور جرمن زبانوں میں لکھے گئے ہیں۔ اس کو دل صاحب مرتب کر رہے ہیں۔ اور اس مجموعے کا انگریزی نام "ESSAYS ON IQBAL" ہوگا۔ اسی طرح اقبال کی فکر سے ماخوذ انگریزی نظمیں بھی جمع کی جاسکتی ہیں۔

۵۔ عزیز گرامی! یہ بہت ہی اہم اور نازک سوال ہے۔ ہم اکیسویں صدی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور اکیسویں صدی کے اختتام تک ایک نئی پود تیار ہو جائے گی۔ اور اس کی تعمیر ہمارے ذمہ ہے۔ مستقبلات یا "FURTURISTICS" امریکہ میں باقاعدہ ایک مضمون ہے۔ اس مضمون کے ماہر کا یہ کہنا ہے کہ ہمیں پرانے مفکر کے کام کو سامنے لانا چاہیئے۔ جس نے انسانی شخصیت کی تعمیر کے لئے کوئی پیغام دیا ہے۔ علامہ کا ذاتی، علمی اور فکری مقام کس قدر روشن تر ہے۔ ہم ابھی اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ اقبال آج دنیا کے عظیم مفکروں کی صف میں شامل ہیں۔

ایک عظیم عیسائی MARTIN BUBE" عظیم یہودی مفکر اور TEIL-HARD DE CHARDIN مفکر ہے۔ لیکن یہ لوگ اجتہاد کے نکتے کو سمجھ نہیں سکے ہیں۔ لیکن اقبال اجتہاد کے نہ صرف قائل بلکہ پیامبر ہیں۔ اس اعتبار سے اقبال کا مقام آئن سٹائن، لینن اور ماؤزے تنگ سے بھی آگے ہے۔ جو صرف اپنے دور کے حالات تک محدود رہ گئے۔

۶ :۔ اقبال کے کردار کا سب سے اچھا پہلو سوز و گداز، آہ سحر گاہی اور خدا اور رسول سے عشق ہے۔ اقبال نے مقام انسانیت کو پہچانا ہے۔ اقبال بیک وقت خاک سے پیوند اور بیک وقت شان معراج بھی رکھتا ہے۔ وہ خدا سے ڈرتا ہے اور بسا اوقات جسارت آفریں انداز میں اس سے گفتگو کرتا ہے۔

۷ :۔ اردو کا پسندیدہ شعر یہ ہے ؎

اسی کش مکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

فارسی میں ذیل کا شعر مجھے بہت محبوب ہے ؎

چناں بزی کہ اگر مرگ تست، مرگ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

۸ :۔ آپ نے ایک گہری سانس لی۔ کچھ دیر کے لئے آنکھیں موند لیں جیسے ماضی کے حالات و واقعات کو ذہن میں تازہ کر رہے ہوں۔ سکوت کے بعد یوں گویا ہوئے کہ اقبال نے جو پاکستان کا تصور پیش کیا ہے۔ وہ جغرافیائی، نسلی سیاسی، عمرانی، قومی اور دوسری حدود سے بہت بلند ہے۔ یہ ایک ایسا خطۂ زمین ہوگا۔ جہاں اسلام اپنی اصل صورت میں جلوہ گر ہوگا۔ جو بد قسمتی سے اسلام کی گزشتہ چند صدیوں سے مختلف وجوہات کی بنا پر ملبے کے نیچے دب گیا ہے۔ ان گوناگوں غیر اسلامی اور عجمی اثرات کی وجہ سے اسلام کی اصل شان میں بہت فرق واقع ہو چکا ہے۔ لیکن یہ خطۂ زمین ان لوگوں کو ایسے مواقع مہیا نہیں کر سکا۔ کہ جس سے یہ لوگ اپنے آپ کو پا سکیں، ڈھونڈ سکیں اور اس کے ساتھ انسانیت کی تعمیر اور تخلیق کے لیے ایک باکردار نسل تیار کی جائے۔ پاکستان کو ان تجربات کی لیبارٹری بنایا جائے اور یہاں کئے جانے والے مثبت تجربات کو معاشرے میں نافذ کیا جائے۔ تاکہ افراد اور ملت کی زندگی اور عمل سے اسلام کی درخشاں تعلیمات کا عکس جھلکنے لگے۔ اور جب اس کی خوشبو دوسرے لوگوں تک پہنچے گی۔ تو یہ اقبال کا تصورِ پاکستان ہوگا۔

۹ :۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلو بدلتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے اس سوال کو سنا اور فرمانے لگے کہ یہ عجیب و غریب بات ہے کہ ہم جب اقبال کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے صرف فکر کا بیان ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے اقبال کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن ہم اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کہ کہنے کا انداز کیا ہے؟ آج بھی اقبال جیسی باتیں کرنے والے موجود ہیں مگر وہ اثر کہاں سے لایا جائے ؎

ابھی چمن میں میرا ہم نفس نہیں کوئی کہ میں بہار کی آمد کا اولیں گل ہوں

اقبال نے فنی اعتبار سے مختلف تجربات کئے۔ انہوں نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں انگریزی اور اردو نثر میں خطوط اور گفتگو (ملفوظات) میں ہر جگہ ایک آرٹسٹ کے روپ میں کردار ادا کیا ہے۔ میں لسانیات COMMUNICATION کا استاد ہوں۔ اقبال یہ بات جانتے تھے کہ مختلف مواقع پر کیا اسلوب اختیار کیا جائے۔ وہ عظیم فن کار تھے۔ ان کا لہجہ خطابیہ تھا جس سے بسا اوقات اگرچہ شاعر کا فن محدود ہو جاتا ہے، مگر اقبال صاف بچ نکلے۔

۱۰:- فلسفی کی حیثیت سے یوں نظر آتا ہے کہ شاید وہ زندگی سے کٹے ہوئے ہوں گے۔ لیکن وہ ایک باعمل انسان تھے۔ اور اس اعتبار سے وہ عظیم انسان تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی تعمیر کی۔ اور ایک مؤثر شخصیت بن کر ابھرے۔ وہ بیک وقت مولانا انور شاہ کاشمیری، سید سلیمان ندوی اور برگساں جیسے لوگوں سے مراسم رکھتے تھے۔ اقبال کی حیثیت ایک عظیم انسان کی ہے جس کا ایک پہلو شاعر کا ہے۔ اور دوسرا فلسفی کا ہے۔ چونکہ خود عظیم انسان تھے۔ اس لئے جو بات کہتے تھے وہ بھی عظیم ہوتی تھی۔ وہ حقائق کا مطالعہ فلسفیانہ اعتبار سے کرتے تھے۔ اور ان کو شاعرانہ پیرائے میں بیان کر دیتے تھے۔ اس اعتبار سے انہیں ایک فلسفی شاعر بھی کہا جا سکتا ہے۔

۱۱:- فلسفہ اقبال کا سب سے اہم پہلو علم و عشق اور KNOWLEDGE, FAITH REASON INTUTION ہے اقبال انسانی عظمت سے واقف تھے۔ وہ قرآن کے سنجیدہ طالب علم اور قاری تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ٹھہر جاؤ اور سوچو۔ جب تک فکر نہیں کرو گے۔ اپنے حال کو درست نہیں کر سکو گے۔ اقبال تمام عمر علم کی وادیوں میں سرگرداں رہے اور انسانی ذہن کو اپنا رفیق سمجھتے رہے۔ اس دور کے بڑے بڑے مفکر اقبال کے ساتھ تو نظر آتے ہیں۔ لیکن جہاں عقل کا گزر ممکن نہیں اقبال وہاں جست لگا کر پہنچ گئے۔ آئن سٹائن بھی آخری عمر میں اس بات پر پہنچا۔ وہ تمام عمر یہودیت سے دور رہا مگر آخر عمر میں کہا کہ میرے علم نے مجھے مذہب تک پہنچا دیا ہے۔ اقبال نے اپنے مشہور فلسفیانہ خطبات میں کہا ہے کہ جوں جوں مذہب اور سائنس ترقی کریں گے۔ ان کی حدیں ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں گی۔ اقبال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے جو والہانہ عشق رکھتے تھے۔ وہ آج کس سے مخفی ہے لیکن وفات سے ایک روز قبل ایک جرمن ادیب کے ساتھ جرمنی ادب اور ثقافت پر گفتگو کرتے رہے۔ اقبال کا فلسفہ خشک نہیں بلکہ اس میں عقیدہ و عقل کا امتزاج ملتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ انٹرویو ختم ہوا تو میں نوائے صبحگاہی سے خفقان نو شبی کے تمام مراحل طے کر لئے تھے۔

پروفیسر سید ابوالخیر کشفی

یہ ۸، دسمبر ۱۹۷۷ء کا دن ہے۔ صد سالہ جشن ولادت کے سلسلہ میں ملک اور بیرون ملک سے آئے ہوئے مندوبین گجردم مولد اقبال سیالکوٹ جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی یونین کی بسیں مہمانان گرامی کو لے کر منزل مقصود کی طرف فراٹے بھر رہی ہیں۔ میری ساتھ والی سیٹ پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور پروفیسر ابوالخیر کشفی تشریف فرما ہیں۔ میں نے کشفی صاحب اور صدیقی صاحب کے حضور اپنی گزارش پیش کی تو صدیقی صاحب نے کشفی صاحب کو انٹرویو

دینے پر آمادہ کیا۔ مگر آپ نے انٹرویو کی نسبت ان سوالات کا تحریری شکل میں جواب دینا پسند کیا۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے جوابات مرتب کر دیئے۔

پروفیسر ابوالخیر کشفی صاحب اردو کے ممتاز ادیب اور نقاد ہیں۔ آپ ان دنوں جامعہ کراچی میں شعبہ اردو کے چیئرمین ہیں میانہ قد، دھان پان جسم، مختصر چہرے پر عینک کا اضافہ، سر پر سیاہ قراقلی ٹوپی، گفتگو میں نرمی اور چال میں دھیما پن ——— یہ ہے جناب ابوالخیر کشفی کی قلمی تصویر، جن کے تحریری جواب پیش خدمت ہیں۔

۱:۔ اسلام (فرد کے لئے سُنتِ رسول کی روشنی میں قوم کے لئے مدینہ کی ریاست کے نمونہ پر مبنی معاشرہ کی تشکیل)

۲:۔ "اسرار و رموز" اس کے مطالعہ سے مجھ پر اسلام کے نکتے کھلتے ہیں۔ اور میں اپنی ذات کی دریافت کرتا ہوں۔

۳:۔ "روحِ اقبال" (ڈاکٹر یوسف حسین خان)

اقبال ایک نئی تشکیل۔ (عزیز احمد)

اقبال شاعر اور فلسفی (سید وقار عظیم)

اقبال کی شخصیت اور شاعری (رشید احمد صدیقی)

IQBAL'S EDUCATIONAL PHILOSOPHY (خواجہ غلام السیدین)

۴:۔ اس سوال کا جواب سکوت ہے۔ ویسے ان دنوں اقبال کی شاعری کے دینی پس منظر پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں بلکہ لکھ چکا ہوں۔

۵:۔ آدمی بین الاقوامیت سے آفاقیت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور اقبال اسلام کی آفاقیت کا ترجمان ہے۔

۶:۔ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

۷:۔ ؎ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

(سورہ فاطر کی پہلی آیت کے حوالے سے)

۸:۔ خلافتِ علیٰ منہاج نبوت

——— اخوت ایسی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مدعی کے ساتھ قاضی کے پاس جائیں۔

——— معاشی پہلو ——— قل العفو

۹:۔ میر اور غالب کے بعد اردو کے تیسرے سب سے بڑے شاعر۔

۱۰:۔ دونوں حیثیتوں سے ——— اقبال نے فکر کو جذبہ بنا دیا۔

۱۱:۔ پہلے سوال کا جواب دیکھئے ——— (اسلام)

بس ابھی گوجرانوالہ سے ڈسکہ کے آرائشی محرابِ اقبال کو عبور کر رہی تھی کہ کشفی صاحب نے یہ جوابات مجھے مرحمت فرما دیئے۔

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین

مناسب قدوقامت، بھرا بھرا جسم، ملیح صورت، لہجے میں گھلاوٹ اور ملائمت، گفتگو میں بنگلہ لہجہ، آنکھوں میں فہم وفراست کے چشمے، سوچ میں گہرائی اور گیرائی ـــــ یہ ہیں بنگلہ دیش کے جناب ڈاکٹر ابوسعید نورالدین جو ان دنوں صدسالہ جشنِ ولادت اقبال کے سلسلہ میں انٹرنیشنل کانگرس میں تشریف لائے ہوئے ہیں۔ آپ ان دنوں موتی جھیل ڈھاکہ کے سلیا بھون کے علاقہ میں رہائش پذیر ہیں۔ تعلیم وتعلم سے گہرا تعلق ہے۔ اور یہ بات سب سے قابلِ ذکر ہے۔ کہ آپ نے ایناپی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ حضرتِ اقبال پر ہی لکھا ہے۔ اس اعتبار سے آپ سے انٹرویو کی نوعیت بہت ہی اہم ہے۔ آپ ہوٹل کے کمرہ نمبر ۲۱۸ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کانفرنس ہال میں ملاقات ہوئی آپ نے وہیں پہ آنے کو کہا ـــــ وقت مقررہ پر میں ان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر صاحب انتظار کر رہے تھے۔ ابتدائی تعارفی گفتگو کے بعد انٹرویو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حاصل گفتگو پیشِ خدمت ہے۔

۱:۔ ڈاکٹر صاحب سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر جذبات کا ایک خاص مدوجذر تھا۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے یوں سلسلہ کلام شروع کیا۔ میرے نزدیک ان کے پیغام کا مرکزی نقطہ "خودی" ہے جو انسانی برتری اور عظمت کا حامل ہے۔ خودی کا فلسفہ علاّمہ اقبال نے قدیم اور متداول نظریہ وحدت الوجود کے ردِّ عمل کے طور پر پیش کیا۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے۔ وحدت الوجود کا ماخذ نوافلاطونیت ہے۔ جو افلاطون اور ارسطاطالیس کے نظریات کی تشریح وتوضیح کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ اور رفتہ رفتہ اسلام میں نفوذ حاصل کر گیا چونکہ صوفیائے کبار کو وحدت الوجود کا مسئلہ اسلام کے عقیدۂ توحید سے مماثل اور مشابہہ نظر آیا۔ انہوں نے اسے حقیقی توحید تصور کیا۔ وحدت الوجود کا مسئلہ درحقیقت ایک غیر اسلامی عنصر ہے جو زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ اسلام میں شامل ہو گیا۔ علاّمہ اقبال کے نزدیک توحید کی ضد کثرت نہیں، بلکہ شرک ہے۔ لہٰذا عقیدۂ توحید کے لئے کثرت کو معدوم کر دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بفحوائے قرآن مجید، خدا کے ساتھ ساتھ دوسروں کو شریک کرنا کفر ہے۔ جس کو دوسرے الفاظ میں شرک کہتے ہیں۔ توحید اصل میں اس شرک کی ضد ہے۔

علاّمہ اقبال نے اسلامی تصوف کو صحیح انداز میں سمجھنے پر زور دیا۔ اگرچہ صوفیائے کبار مثلاً حضرت ذوالنون مصری رح بایزید بسطامی، منصور ابنِ حلاج وغیرہ نے وحدت الوجود کو اپنے قول وعمل کا واحد ذریعہ بنایا۔ علاّمہ اقبال نے اس رویے کے خلاف احتجاج کیا۔ شیخ محی الدین ابن عربی رح نے اپنی مشہور کتاب "فصوص الحکم" اور "لمعات" میں نظریہ وحدت الوجود کو مکمل شکل دی۔ جس کے اثرات سے عربی، فارسی اور اردو شاعری میں اس کا رواج ہو۔ اور عوام الناس کو بے عملی کا راستہ دکھایا گیا۔

علاّمہ اقبال نے نظریۂ خودی پیش کر کے دنیا میں انسان کو عظمت وعروج کی دعوت دی۔

۲:۔ مجھے "زبورِ عجم" بہت پسند ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علاّمہ اقبال نے اس میں اپنی فکر کی توضیح خصوصاً عشقِ خدا اور

عشقِ رسولؐ کے بارے میں اپنے تعمق فکر کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے خود ضربِ کلیم میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم ؎
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں!

۳:۔ فکرِ اقبال پر مکمل کوئی کتاب اچھی نہیں ہے۔ الگ الگ مضامین میں مختلف لوگوں نے مختلف پہلوؤں پر اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ ان میں پروفیسر نکلسن کا انگریزی دیباچہ بہت وقیع ہے۔ اس میں اقبال کے فلسفہ پر صحیح طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد پروفیسر آربری نے بھی جگہ جگہ علامہ اقبال کے فلسفہ کی صحیح عکاسی کی ہے اقبالِ کامل اور سیرتِ اقبال بھی پسند ہیں۔ ڈاکٹر سچیدا نندا سنہا کی کتاب IQBAL, THE POET AND HIS MESSAGE بھی ایک اہم کتاب ہے۔ علامہ اقبال کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ان کے کلام اور لیکچرز کے علاوہ ان کے مکتوبات اور ملفوظات جو وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں۔ بہت ہی مفید اور معاون ہیں ——
ڈاکٹر یوسف حسین خان کی "روحِ اقبال" کو بھی بہترین نہیں کہا جا سکتا۔ خلیفہ عبدالحکیم کی "فکرِ اقبال" بھی مکمل نہیں ہے۔ اس ذیل میں "ذکرِ اقبال"، "حیاتِ اقبال" اور "آثارِ اقبال" کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔

۴:۔ "اسلامی تصوف اور اقبال" میرا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔ جو میں نے ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر غلام سرور صاحب کی رہنمائی میں تیار کیا تھا۔ مسئلہ خودی پر میں نے بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ ایک مضمون "انسانِ کامل" پر بھی لکھا ہے۔ "اقبال اور رومی" کے عنوان سے ایک مقالہ کراچی یونیورسٹی میگزین میں چھپا ہے۔ "ضربِ کلیم" کا بنگلہ میں ترجمہ ابوطالب منان نے ترتیب دیا اور مدون کیا۔ اور ان دنوں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہا ہے۔

۵:۔ میرے نزدیک فکرِ اقبال کا مستقبل بہت روشن ہے۔ اس لئے کہ ان کا فکر اصل میں پیغامِ حیات پر مشتمل ہے جو کہ رفتہ رفتہ دنیا میں مقبول سے مقبول تر ہوتا جا رہا ہے۔ میرا مطلب ان کے فلسفہ خودی سے ہے۔ جو ایک جامع تصور ہے۔

۶:۔ علامہ اقبال کا سب سے پسندیدہ اور قابلِ تقلید پہلو میرے نزدیک ان کی خودداری اور خود اعتمادی ہے۔ ان کا درج ذیل شعر اس کی دلالت کرتا ہے ؎

خود فرود آ از شترِ مثلِ عمرؓ
الحذر از منتِ غیر الحذر (اسرار و رموز)

۷:۔ مجھے اردو میں علامہ اقبال کا یہ شعر بہت مرغوب ہے ؎

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہٗ!

اور فارسی میں یہ شعر لکھ لیجئے ؎

تا عصائے لا الٰہ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

۸ :۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سوال سے پہلو تہی اختیار کی۔ مگر اقبال کے حوالے سے میں نے استفسار کیا۔ تو قدرے توقف کے بعد کہا کہ مسلمانوں کو ایک الگ جگہ کی ضرورت تھی۔ جس میں وہ اپنے مادی اور روحانی دونوں طرح کے عمل میں بغیر کسی رکاوٹ کے کام کر سکیں۔ یہ بات جیسا کہ خود علامہ اقبال کو اپنے تجربے سے ثابت ہوئی کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر حکومت بنانے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

۹ :۔ علامہ اقبال کا مقصد فن کا اظہار نہیں ہے۔ ان کا اصل مقصد پیغام حیات پیش کرنا ہے۔ لہٰذا فنی مقام کے سلسلے میں بحث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود فن کے لحاظ سے علامہ اقبال کا کلام ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں تمام شعری روایات کو بڑی عمدگی سے سراہا ہے۔ اور اس کے ذریعہ اپنا انوکھا اور بے مثال پیغام پیش کر کے ایک بہتر رُوپ عطا کیا ہے۔

۱۰ :۔ ظاہر ہے کہ شاعر اور فلسفی کے علاوہ اور کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ مگر ایک ریفارمر کی حیثیت سے ہم ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ علامہ صوفیانہ خیالات کے ریفارمر تھے۔ جو ہمارے دین و مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔

۱۱ :۔ فلسفۂ خودی ـــــ جس کا ماخذ قرآن مجید ہے۔ انسان اور خدا الگ الگ ہیں۔ خالق اپنی مخلوق سے ہمیشہ جُدا اور الگ ہوتا ہے۔ دونوں ایک نہیں ہو سکتے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر جزا و سزا اور حشر نشر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس انٹرویو کے دوران ڈاکٹر صاحب کا لہجہ جذبات سے مملو تھا۔ یہ مرحلہ گفتگو ختم ہوا، تو میں نے اجازت کی درخواست کی، لیکن جس پر تپاک انداز میں آپ نے الوداع کہا۔ اس نے شکستِ ربط وضبط سے پہلے کی یگانگتوں کی یاد تازہ کر دی۔

ڈاکٹر محمد ریاض

تنومند جسم اور کشادہ چہرہ، نشہ علم میں غرق، تحقیق و تنقید کا ذوق رکھنے والے ڈاکٹر محمد ریاض صاحب ۱۹۳۵ء میں پنجاب کے صحت افزا مقام مری میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم کراچی اور تہران کی جامعات سے حاصل کی۔ ۱۹۶۵ء میں فارسی ادبیات و زبان میں تہران سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ چار سال تک تہران یونیورسٹی میں اردو اور پاکستانیات کے استاد رہے۔ آپ تین کتابوں اور متعدد مقالات کے مصنف ہیں۔ مقالات میں سے بیشتر اقبال پر ہیں۔ تحقیق کا بہت عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔ تبحر علمی اور وسعت معلومات کے سلسلہ میں قابل رشک ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل میں ڈاکٹر صاحب علم وادب کی دُنیا کا ایک روشن ستارہ ہوں گے۔ ان دنوں اسلام آباد کے فیڈرل گورنمنٹ کالج میں تدریسی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ آپ اقبال انٹرنیشنل کانگرس کے مندوب ہیں۔ راقم الحروف انٹرویو کی غرض سے کمرہ نمبر ۳۳۲ میں پہنچا تو آپ اقبال کے محبوب لباس تہمد اور بنیان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رات کافی گزر چکی تھی، مگر یہ آپ کی علم دوستی اور شفقت تھی کہ اسی وقت انٹرویو کے لئے آمادہ ہو گئے۔ سارے دن کی تکان اور مصروفیت کے باوجود علمی گفتگو میں وہ بہت ہی تازہ دماغ نظر آئے۔ موصوف اقبالیات پر بہت عمیق نظر رکھتے ہیں۔ اور یہ سطور ان کے اسی مطالعہ و مشاہدہ کی دلیل ہیں۔

۱ :۔ اقبال کے پیغام کا مرکزی نقطہ "خودی" ہے۔ البتہ اس سے دوسرا نقطہ پیدا ہوتا ہے۔ جسے "بے خودی" کہتے ہیں۔ اس

فلسفہ کا سارا مقصود یہی ہے کہ فرد اپنی صلاحیتوں کو پہچانے اور بنی نوع انسان کے کام آئے۔ اپنے معاشرے اور پوری دنیا کے کام آئے، خودی اور بے خودی میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں آجاتے ہیں۔

۴: مجھے اقبال کی کتابوں میں" جاوید نامہ" سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ فارسی کی ایک منفرد کتاب ہے۔ عالم افلاک میں فرضی سیاحت، یونانی ادب بھی ملتی ہے۔ بعض اپنے خواب اور" بن اپنے تخیل کی مدد سے اپنے آپ کو عالم افلاک میں محسوس کرتے ہیں۔ عالم بالا میں جانے کی آرزو کا اظہار یونانی ادب کے علاوہ "ویراف نامہ" میں بھی ملتا ہے۔ جو ایک زرتشتی عالم نے لکھی ہے۔ ایرداویراف زرتشتی مذہب کا رہنما تھا۔ جس نے لوگوں کو جنت کی تشویق دلانے اور دوزخ کے عذاب سے ڈرانے کے لئے اپنے خواب کو بیان کیا ہے۔ اور اس خواب میں مختلف گناہوں کی وہی سزائیں ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف احادیث میں روایت معراج کے سلسلے میں ملتی ہیں۔ بہرحال روایات کا ایک بہت بڑا مجموعہ ان کے پیش نظر رہا ہے۔ عبدالرحیم عفیفی نے مشہد یونیورسٹی سے ۱۹۵۶ء میں اس موضوع پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ لیکن علامہ اقبال نے "ویراف نامہ" نہیں دیکھا۔ البتہ بایزید بسطامی کا سفرنامہ افلاک جسے احسن نے لکھا لیکن اس کے بارے میں چوہدری محمد حسین نے بھی علامہ سے یہ بات کہی کہ یہ کتاب نہیں ملتی۔ لیکن ان دنوں اس کتاب کا متن شائع ہو گیا ہے۔
اس ضمن میں تیسری اہم کتاب ابو عامر شہید اندلسی نے پانچویں صدی ہجری میں لکھی جس کا نام" التوابع والزوابع" ہے یہ مصنف ۴۲۶ھ میں فوت ہوا۔" رسالۃ الطیر" مصنفہ بوعلی سینا میں روح کی معراج پر بہت کچھ لکھا ہے یہ ۴۲۸ھ میں فوت ہوئے۔ اس کے بعد" رسالۃ الغفران" کا نام آتا ہے۔ یہ ایک طنزیہ کتاب ہے۔ اس کے مصنف ۴۴۹ھ میں فوت ہوئے۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنے دوست ابن القارح کا استہزا کیا ہے۔ حکیم سنائی غزنوی کا رسالہ "سیر العباد علی المعاد" چھ سو شعر کی منظوم مثنوی ہے۔ جس میں شاعر نے روح کے عالم بالا کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کتاب کے نتیجے میں" منطق الطیر" وجود میں آئی۔ اس میں بھی سات وادیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس صدی میں عطار کے معاصر ابن عربی ہیں۔ جن کا" رسالۃ الروح" اور" فتوحات المکیہ" بہت اہم ہیں۔ موخر الذکر کی تین جلدیں ہیں، جن میں تیسری جلد خصوصیت سے علامہ کے زیر مطالعہ رہی ہیں۔ ISLAM AND DIVINE COMEDY اس کی تکمیل ہے۔ ابن عربی ۶۳۸ھ میں فوت ہوا۔ دانتے دوسری صدی ہجری کا آدمی ہے۔

جاوید نامہ ان کی مذکورہ کتب کا خلاصہ ہے۔ اس کا اسلوب انتہائی اعلیٰ درجہ کا ہے۔ لیکن شاعر نے صرف چھ وادیوں کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کتاب کو تعصب سے پاک ہو کر لکھا ہے۔ فلک قمر میں وشوامتر ملتا ہے۔ اقبال نطشے کو افلاک اور بھرتری ہری کو جنت سے باہر دکھاتا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا۔ ان کی ہڈیاں برف میں لگی ہوتی ہیں یہاں تک کہ اسمٰعیلی شاعر ناصر خسرو کو بھی جنت میں دکھایا ہے۔ دراصل اقبال فرقہ وارانہ تصور سے بہت بالا نظر آتے ہیں یہاں سورج کے کرہ میں چونکہ آگ ہے۔ اس لئے اقبال نے اسے حذف کر دیا ہے۔ جاوید نامہ میں عالم انسانی اور عالم اسلامی دونوں کی تاریخ ہے۔" جاوید نامہ" میں سرسید کا ذکر نہیں ملتا۔ ان کا خیال تھا کہ دوسرے ایڈیشن میں سرسید اور مجدد الف ثانیؒ کو شامل کر دوں گا۔ اس دو ہزار بیت کی کتاب میں چالیس کردار ملتے ہیں۔ جن میں

سے کچھ اصل اور کچھ فرضی ہیں۔ یہی صورت مقامات کی ہے۔ جس انداز میں اس کتاب کو ختم کیا گیا ہے۔ وہ اقبال ہی کا کام ہے۔ مثنوی اخلاقی شاعری کی صنف ہے۔ اقبال نے چھ سو سال کے بعد اس روایت کو از سرِ نو زندہ کیا۔ یہ کتاب مجھے اس لئے بھی پسند ہے۔ کہ اس کے سمجھنے کے لئے مجھے بہت محنت کرنا پڑی ہے۔

۳:۔ اس ضمن میں مجھے تین کتابیں مرغوب ہیں۔

(۱) اقبال کامل (عبدالسلام ندوی)

(۲) فکرِ اقبال (خلیفہ عبدالحکیم)

(۳) GABRIEL'S WING BY DR. ANNEMARIE

۴:۔ گزشتہ دس سال سے اقبالیات پر کام کر رہا ہوں۔ بہت سے منصوبے زیرِ ترتیب ہیں۔ البتہ جو کچھ لکھ چکا ہوں اس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) "اقبال اور فارسی شعراء" اس کی تلخیص اہلِ فارسی کے لئے کی ہے۔

(۲) "اقبال اور ابنِ حلاج"

(۳) "اقبال اور شاہِ ہمدان"

(۴) "تصوفِ اقبال"

(۵) "تعلیماتِ اقبال" ـــــ جاوید نامہ کی روشنی میں۔

مقالات کے چار مجموعے ہیں۔ جن میں سے چھ ایک جلد میں، چودہ ایک جلد میں اور تیس ایک جلد میں شائع ہوں گے۔

"بالِ جبریل" اور "ارمغانِ حجاز" کا فارسی ترجمہ بھی کر چکا ہوں۔ جو آر سی ڈی والے شائع کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ایران سے "کشف الابیات" بھی انگریزی اور فارسی میں شائع ہو چکی ہے۔

۵:۔ جہاں تک فکرِ اقبال کے مستقبل کا تعلق ہے جس طرح میں اسلام کے مستقبل کے بارے میں روشن تصور رکھتا ہوں۔ اسی طرح وقت کے ساتھ ساتھ اقبال کے افکار بھی پھیلیں گے اور اپنا اثر دکھائیں گے۔

۶:۔ اقبال کے کردار میں تواضع اور انکساری نظر آتی ہے۔ صبح سے شام اور رات گئے تک احباب کا جمگھٹا ہے۔ اقبال کے ہاں عام انسانی کردار ملتا ہے۔ آپ نے خلوت میں تخلیقی کاموں کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

۷:۔ فارسی میں یہ شعر بہت ہی پسند ہے ؎

چناں بزی کہ اگر مرگ ماست، مرگ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد!

اردو میں یہ شعر بہت عام ہو چکا ہے۔ مگر پھر بھی بہت پسند ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

۸:۔ اقبال کا تصورِ پاکستان ہمیں ان کے خطبہ الہ آباد کے علاوہ ان کے بارہ خطوط میں بھی مل جاتا ہے۔ جو آپ نے قائداعظم کے نام لکھے ہیں۔ اقبال کا اسلام کے بارے میں جو عملی تصور تھا۔ وہ پاکستان کو اس کی عملی تجربہ گاہ بنانا چاہتے تھے
۹:۔ میں نے اصنافِ نثر میں "اقبال کی جدتیں" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ اور اس میں وضاحت کی ہے۔ اگرچہ اقبال کسرِ نفسی کی وجہ سے اپنی شاعری سے نالاں ہیں۔ مگر فارسی نقاد بیک زبان کہتے ہیں کہ ان کا اپنا ایک منفرد اسلوب ہے۔ ایک منفرد رنگ ہے۔ اگر آپ کے اشعار کا لفظی اعتبار سے بھی مطالعہ کیا جائے تو عظیم شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔
۱۰:۔ میں اقبال کو ایک شاعر کی حیثیت سے چاہتا ہوں۔ مگر اس میں ان کا فلسفہ بھی آجاتا ہے۔ اور وہ اسلام کا فلسفۂ حیات ہے۔ وہ دوسروں کی اصطلاح میں فلسفی مگر ہماری اصطلاح میں حکیم الامت ہیں۔
۱۱:۔ جہاں تک میں نے فلسفۂ اقبال کا مطالعہ کیا ہے اس کا کوئی ایک پہلو بھی میرے پیشِ نظر ایسا نہیں ہے۔ جو مجھے پسند نہ ہو۔ جزوی باتوں سے اختلاف اور بات ہے ان کے فلسفہ میں حرکت اور کوشش، جہاد اور سرگرمی کا پیغام ہے۔ اس میں سخت کوشی کی تلقین ہے۔ اور یہ پہلو مجھے زیادہ پسند ہے۔
انٹرویو کے بعد کچھ اور علمی مسائل پر گفتگو چل نکلی۔ رات صبح سے ہمکلام ہوا چاہتی تھی کہ میں انہیں شب بخیر کہہ کر لوٹ آیا۔

محمد احمد خان

میانہ قد، چوڑا چکلا چہرہ اور اس پر چشمے کا اضافہ، سر پر سیاہ رنگ کی قراقلی ٹوپی، پاجامہ اور اچکن میں ملبوس، چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی جس میں تراش خراش اور تہذیب کا عمل شامل تھا۔ آنکھوں میں سوچ کے دائرے اور گفتگو میں تفکر و تدبر کا رنگ ـــــ یہ ہیں کراچی سے تشریف لائے ہوئے اقبال انٹرنیشنل کانگرس کے مندوب جناب محمد احمد خان صاحب۔
آپ ۱۹۱۹ء میں حیدر آباد دکن کے معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم۔اے معاشیات کیا۔ اور ۱۹۴۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے قانون کی تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۴۴ء میں حیدر آباد دکن میں پریکٹس شروع کی۔ سیاسی جدوجہد میں نواب بہادر یار جنگ کی راہنمائی میں کام کیا۔ مجلس اتحاد المسلمین کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ "عثمانیہ" میگزین کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ان دنوں بہار یار جنگ اکیڈمی کراچی کے چیئرمین ہیں۔ آپ چھ کتب تحریر کر چکے ہیں۔ جن میں تین اقبال پر ہیں۔
آج ۷، دسمبر ہے اور معزز مندوب نیو کیمپس کے فیصل ہال میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کا خطاب سننے کے لئے بسوں پر سوار ہو رہے ہیں۔ میرے ساتھ والی نشست پر جناب محمد احمد خان تشریف فرما ہیں۔ راستے میں باتوں باتوں میں آپ سے کا ذکر ہوا تو آپ نے کمال خندہ پیشانی سے مغرب بعد کا وقت طے کیا۔ وقت مقررہ پر کمرہ نمبر ۴۲۸ کے دروازے پر دستک دی جناب محمد احمد خان نے اندر آنے کو کہا اور تھوڑی دیر بعد ہی ہم اقبالیات کے مختلف موضوعات پر گفتگو میں مصروف تھے۔ لیجئے آپ بھی ان باتوں کو سماعت فرمایئے۔

۱:۔ اقبال کے پیغام کا مرکزی نقطہ "خودی" ہے۔ لیکن ایسی جو مسلمان ہو۔ اقبال نے سوال کیا تھا ؎
خودی تری مسلماں کیوں نہیں ہے ؟

اور اسی مصرعہ کا جواب ان کی پوری شاعری ہے۔ "اسرار و رموز" میں انہوں نے خودی کو مسلمان بنانے کا طریقہ بتایا ہے۔

۲:۔ سوال مشکل ہے۔ میرے نزدیک "اسرار و رموز" اور "جاوید نامہ"، اسرار و رموز اس لئے کہ اس میں انہوں نے خودی کا پورا فلسفہ بیان کیا اور پیغام دیا ہے۔ اور جاوید نامے میں ان کی شاعری کا نقطۂ عروج ملتا ہے۔

۳:۔ "روحِ اقبال" ——— (ڈاکٹر یوسف حسین خاں)
"اقبال کامل" ——— (عبدالسلام ندوی)
اقبال کا تصورِ زمان و مکان اور دوسرے مضامین ——— (ڈاکٹر رضی الدین صدیقی)

۴:۔ اقبال پر کچھ تو میرا کام مطبوعہ ہے اور کچھ ان دنوں زیرِ طبع ہے۔ مطبوعہ کتاب "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ہے۔ جس میں اقبال کے عملی سیاسیات میں، کردار اور تصورِ پاکستان کے لئے خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ "اقبال اور مسئلہ تعلیم" اور "اسلامی قوانین اور اقبال" یہ دونوں کتابیں عنقریب شائع ہو جائیں گی۔

۵:۔ بڑا ہی اہم سوال ہے۔ میرے نزدیک فکرِ اقبال کا مستقبل نہایت روشن ہے۔ بشرطیکہ اس کے لئے صحیح نہج پر کام کیا جائے۔ اقبال نے جس طرح اور جس انداز میں اسلام کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے موجودہ زمانے کی جو طلب ہے۔ اقبال کی فکر اس طلب کا صحیح جواب ہے۔ لیکن ایک خطرہ یہ ہے کہ ہم اقبال کو HUMANIST ثابت کرنے کی جد و جہد میں کہیں اس کی اسلامی فکر کو گم نہ کر دیں۔

۶:۔ اقبال کے کردار کا پہلو خلوت پسندی ہے جس کے متعلق فرماتے ہیں ؎
خودی کی خلوتوں میں گم رہا میں
خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں
نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر جلوۂ دوست
قیامت میں تماشہ بن گیا میں (بالِ جبریل)

۷:۔ اردو میں یہ شعر قابلِ غور ہے ؎
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

فارسی میں عقیدت من اس شعر سے وابستہ ہے ؎
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

۸:۔ آج کے دور میں یہ سب سے اہم سوال ہے اقبال کا تصورِ پاکستان یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں اسلامی خطوط پر کس طرح

ایک جدید مملکت چلائی جا سکتی ہے۔ ان کا آئیڈیل نظام خلافتِ راشدہ ہے۔ اور یہ کہ اس نظام سیاسی کو کس طرح موجودہ دور میں روبہ عمل لایا جا سکتا ہے وہ یہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں اسلام پورے کا پورا نافذ ہو۔ ان کے نزدیک اسلام دین جزوی نہیں بلکہ دینِ کلی ہے اور وہ انسان کی انفرادی ۔ ندگی کا ایک اخلاقی ضابطہ ہی نہیں ۔ بلکہ پوری کی پوری اجتماعی زندگی کا بھی ایک اصول ہے اور اسی اصول کو وہ اس مملکت میں کار فرما دیکھنا چاہتے تھے ۔

۹ :۔ اقبال بحیثیتِ شاعر میری نگاہ میں غالب سے مماثل درجہ رکھتے ہیں ۔ لیکن اپنے پیام کی وجہ سے وہ غالب سے بھی بازی لے گیا ہے ۔

۱۰ :۔ میں نے اسے شاعر، فلسفی اور سیاستدان تینوں حیثیتوں سے پہچانتا ہوں ۔ اور ان سے بڑھ کر دورِ حاضر میں ایک خاص پیغام کا علمبردار جیسا کہ گرامی نے کہا تھا ؎

در دیدۂ معنی نگہبان حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت !

۱۱ :۔ فلسفۂ اقبال کا یہ پہلو زیادہ پسندیدہ ہے ۔ کہ انسان اپنے آپ کو پہچانے ، اپنی صلاحیتوں کا اندازہ لگائے اور ان کو اپنے طور پر ترقی دے ۔ کسی اور کا دریوزہ گر نہ بنے ۔ استفادہ سب سے کرے لیکن اس استفادہ میں سپردگی نہ ہو۔

مغرب سے وقت کا گھوڑا اعشار کی منزل پر آ گیا ۔ اب معزز مہمانوں کے کھانے کا وقت تھا ۔ ہم لوگ ہوٹل کے پیچھے شامیانوں میں گھرے ہوئے ہال میں کھانے کے لئے چلے آئے ۔

محمود الحق (برطانیہ)

ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے میٹنگ ہال میں ایک صاحب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کے پاس اگلے ماہ برٹش میوزیم عجائب گھر میں منعقد ہونے والی اقبال پر نمائش کا ذکر کر رہے تھے مجھے اس ذکرِ جمیل سے یک گونہ نسبت تھی ۔ میں اجازت لے کر ان کے قریب بیٹھ گیا ۔ گفتگو ختم ہوئی تو معلوم ہوا ۔ آپ محمود الحق صاحب ہیں ۔ جو برطانوی لائبریری اور عجائب گھر لندن میں اسسٹنٹ کیپر ہیں ۔ میں نے ان کی اقبال دوستی کے جذبات دیکھ کر ان سے انٹرویو کی درخواست کی ۔ جسے انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں تو کوئی ماہر اقبالیات نہیں ہوں ۔ مگر میں یہ دیکھ چکا تھا کہ وہ اقبال کے ذکر سے گہری محبت و الفت رکھتے ہیں ۔ میرے اصرار پر انہوں نے اپنے کمرہ نمبر ۵۰۳ میں آنے کی دعوت دی ۔ میں وقت مقررہ پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ آپ نیچے اوپن ہال میں تشریف فرما ہیں ۔ میں افتاں و خیزاں وہاں پہنچا تو آپ نو مسلم برطانوی مندوب جناب محمد عیسیٰ ویلی سے جو لندن میں ان کے ساتھ ہی کام کرتے ہیں ۔ ہمکلام تھے ۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے فوراً بلا لیا ۔ اور وہیں پر انٹرویو کے مرحلے طے ہوتے چلے گئے ۔

محمود الحق صاحب کا تعلق پاکستان سے ہے ۔ عمر سے بہت پہلے ہی ان کے بالوں میں سفیدی نے راج جما لیا ہے ۔ درمیانہ مناسب قد ، گندمی رنگت ، آنکھوں میں کسی کے انتظار کا موسم ، ہونٹ سراپا سوال اور چہرے پر محنت و مشقت کے اثرات نمایاں تھے ۔ راقم الحروف نے ان کی پیش کش کو غنیمت سمجھتے ہوئے اپنا سوالنامہ آگے بڑھایا ۔ سوال و جواب شروع ہوئے ۔

یوں قافلۂ رنگ و بو، نکہت دلنواز کی وادیوں میں کھو سا گیا۔

۱ :۔ آپ کے پیغام کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اسلام کے راستے پر واپس آنا چاہیئے۔ اور انہیں اپنی دین و دنیا کو اپنے نظام حیات کے تابع بنانا چاہیئے۔ برخلاف اس کے کہ وہ مغرب یا کسی دوسرے بیرونی نظریے سے متاثر ہوں۔ یا اس کی تقلید کریں۔

۲ :۔ میری پسندیدہ کتاب "بانگِ درا" ہے۔ اس میں ان کا بیس سال سے زیادہ کا کلام ہے۔ اس میں علامہ کی فکر کا ایک تدریجی ارتقاء دکھائی دیتا ہے۔ اس کتاب کے تیسرے حصے میں ان کا پیغام بھی شامل ہے۔ میں اسے بہترین تصنیف تو نہیں کہتا لیکن پسند اس لیے کرتا ہوں کہ برصغیر کے مسلمانوں اردو کو فارسی کی نسبت زیادہ آسانی سے سمجھتے تھے۔

۳ :۔ "اقبال اور حافظ" لیکن "روحِ اقبال" "ڈاکٹر یوسف حسین" اور "نقوشِ اقبال" (سید ابوالحسن علی ندوی) مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں۔

۴ :۔ میں کوئی مصنف یا محقق تو نہیں ہوں۔ البتہ اقبال کے فکر و فن سے گہری دلچسپی رکھتا ہوں۔ ہم لوگ اگلے سال پانچ جنوری ۲۰۰۸ء کو برٹش میوزیم میں ایک بہت بڑی نمائش کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اس نمائش کے لئے ہم نے کافی مواد دوسرے ملکوں سے حاصل کیا ہے۔ اس میں اقبال کے ORIGINAL SCRIPTS بھی شامل ہیں۔ ایک جامع کیٹالاگ میں نے اور محمد عیسیٰ ویلی نے مرتب کیا ہے۔ اور یہ برٹش میوزیم اینڈ لائبریری سے شائع ہو چکا ہے۔

۵ :۔ میرے نزدیک مستقبل بڑا روشن ہے۔ بشرطیکہ ہم اقبال کے شایانِ شان کوئی علمی اور تحقیقی ادارہ قائم کریں۔ جہاں علامہ اور علامہ پر لکھی جانے والی تمام کتب موجود ہوں۔ اس کے ساتھ تحریک پاکستان پر لکھا جانے والا لٹریچر بھی موجود ہونا چاہیئے۔ بلکہ اسلامی نظام حیات کی ترجمانی کرنے والا سارا لٹریچر وہاں موجود ہو وہاں آپ کلام پاک اور احادیث کے ساتھ فکرِ اقبال کو لے کر قوم کو درپیش مختلف مسائل کا حل سوچیں ــــ فکرِ اقبال کا مستقبل ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ہم کسی حد تک تغافلی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میرے نزدیک فکرِ اقبال کا مستقبل روشن ہے۔

۶ :۔ فقر (CONTENTMENT)

۷ :۔ اردو میں یہ شعر روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں۔

۸ :۔ اقبال کے تصورِ پاکستان میں کیا الجھن ہے۔ ان کے نزدیک وہ مملکت ایسی ہونی چاہیئے۔ جو اسلام کے متعین کردہ راستے پر چلے۔ اسے ایک فلاحی ریاست ہونا چاہیئے۔ جو جدید دور میں ترقی کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر اسلامی روح کے حوالے سے ترقی کرے۔

۹ :۔ اقبال کا فنی مقام بہت بلند ہے۔ مگر اس کا تعین کن عناصر سے ہوتا ہے۔ یہ ایک طویل بحث ہے۔ اور میں شاید

اس کا مناسب علم بھی نہیں رکھتا۔

۱۰ :۔ ہر عظیم شاعر، بغیر فلسفی ہوئے عظیم نہیں کہلا سکتا۔ لیکن اقبال تو فلسفی شاعر تھے۔

۱۱ :۔ اقبال ایک ہمہ گیر فلسفی تھے۔ کوئی خاص پہلو پیش نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری یہ مختصر سی گفتگو بھی خاصے وقت پر محیط تھی۔ اس اثناء میں دوسرے اجلاس کا اعلان ہوا۔ اور مندوبین ہال کی جانب جانے لگے۔ ہم بھی وہاں سے اٹھ کر مقالات سننے کے لئے اندر چلے گئے۔

ملک محمد رمضان

صد سالہ جشن ولادت اقبال کے سلسلہ میں پنجاب یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام منعقدہ انٹرنیشنل کانگرس کے مندوبین میں ایک شخصیت ہر شخص کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ بیرونی ممالک کے مندوبین بالخصوص انہیں محبت اور استعجاب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ یہ ہیں جناب ملک محمد رمضان صاحب جو بلوچستان میں مستونگ کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ اور بلوچستان کے علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں میں بہت احترام کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں۔ بلوچی تہذیب وثقافت کا نمونہ ہیں۔ وہی بلوچوں کی سی داڑھی اور مونچھیں جن پر سفیدی قبضہ جمانے کی کوشش کر رہی ہے۔ سر پہ روایتی پگڑی بلوچی شلوار قمیض میں ملبوس، آنکھوں میں چیتے کی سی چمک دمک، ایک چادر کندھوں کے آرپار، سگریٹ نوشی کا ایک خاص انداز، شگفتہ مزاج اور ملنسار، لہجے میں گھلاوٹ اور لفظوں میں پیار کا امرت، ہر گھڑی مہمانوں میں گھری ہوئی ایک شخصیت ـــــ یہ ہیں جناب ملک محمد رمضان صاحب جو آج بھی بلوچی تہذیب وثقافت کے نمائندہ ہیں۔

آپ عرصہ ۳۱ سال سے فنِ صحافت کے گیسوئے پیچدار کو جو ابھی منت پذیر شانہ ہیں، سلجھانے کا کام کر رہے ہیں۔ مستونگ سے نکلنے والے ایک رسالے "ساربان" کے ایڈیٹر ہیں۔ اس سے قبل وہ "کلمۃ الحق" "الحق" سندھی پرچے "معلم سریاب" اور "تنظیم" کوئٹہ سے منسلک رہے ہیں۔ ان کا رسالہ "ساربان" پچیس سال سے راہِ دراز طے کر رہا ہے۔ ملک صاحب خداداد صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اردو، بلوچی، براہوی، سندھی اور سرائیکی لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ جب کہ فارسی پشتو اور پنجابی میں اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتے ہیں۔ بلوچ۔ ثقافت، شاعری اور سماج کے خدوخال پر ان کی تصانیف ہیں۔ جب کہ "آثارِ بلوچستان" اور "اولیائے بلوچستان" پر ان کے مسودات مکمل ہیں۔ بلوچی زبان میں قرآن وحدیث کی تعلیمات پر مشتمل ایک مسودہ ترتیب پا چکا ہے۔ اردو زبان کے فروغ اور ترقی کے لئے دامے، درمے، قدمے، سخنے کوشش کرتے رہتے ہیں۔

آج انٹرنیشنل کانگرس کے مندوبین کو مقبرہ جہانگیر اور شاہی قلعہ کی سیر بھی کرنا تھی۔ سہ پہر کو ترکی کے اعزازی قونصل جناب حکیم نیر واسطی نے معزز مندوبین کے اعزاز میں ایک عصرانہ ترتیب دیا۔ یہاں اکبر کے دیوانِ عام میں کچھ فرصت کے لمحات میسر آئے۔ جن سے کام لیتے ہوئے میں نے جناب ملک صاحب سے انٹرویو شروع کر دیا۔ سگریٹ کے مرغولوں میں فکرِ اقبال کے مسائل بھی تحلیل ہوتے گئے۔ فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کرنے والا یہ مردِ کہستانی فکرِ اقبال

کے مختلف موضوعات پر کیا رائے رکھتا ہے۔ اس سے آپ بھی آگاہی حاصل کریں۔

۱:۔ علامہ اقبال نے کلام اللہ اور سنت رسولؐ کو جدید اور قدیم فلسفہ کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ ان کے تمام افکار و نظریات اسی محور کے گرد گھومتے ہیں اور تعمیر کائنات کا راز اسی میں مضمر گردانتے ہیں۔

۲:۔ علامہ کی ہر کتاب اپنے مقام پر مستقل تصنیف ہے۔ میں فقیہ نہیں ہوں کہ درجہ بندی کروں۔ اس لئے جواب دینے سے معذور رہوں۔

۳:۔ سب قابل قدر ہیں انہیں دردمندی اور اخلاص سے معرض تحریر میں لایا گیا ہے۔ ہر مصنف نے وقت نظر سے علامہ کے افکار کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

۴:۔ میں نے بالِ جبریل کا بلوچی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف دیگر نظموں کا بھی بلوچی میں ترجمہ کر چکا ہوں۔ اہلِ علم وادب نے بھی ان تراجم کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔

۵:۔ جیسے جیسے انسانی شعور بیدار ہوگا۔ اور اس پر علامہ کے کلام اور افکار کے اسرار و رموز منکشف ہوتے جائیں گے۔ علامہ کی کتابوں کی اہمیت واضح ہوتی جائے گی۔ اس لحاظ سے بھی فکرِ اقبال کا مستقبل تابناک ہے۔
آپ نے معمولی تصرف کے ساتھ جوش کا یہ شعر پڑھا ؎

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر شخص پکارے گا اقبال ہمارا ہے

۶:۔ وہ جامع الصفات انسان تھے۔ شاہین، مردِ مومن، اور اس سے قبیل کی دوسری اصطلاحیں اور علامتیں ایک نمونہ ہیں۔ اقبال کی پوری زندگی قول وعمل میں ہم آہنگی کا بہترین شاہکار ہے۔

۷:۔ اردو میں یہ شعر مجھے پسند ہے ؎

بسر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیابان میں
کہ شاہین کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

فارسی میں یہ شعر نوٹ کر لیجئے ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

۸:۔ انفرادی طور پر تو ہر آدمی اپنے میلانات پر عمل پیرا ہے، مگر تصورِ پاکستان اجتماعی عمل کی ایک مؤثر ترکیب تھی۔ یہاں ایک ایسی ریاست مطلوب تھی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر مبنی ہو۔

۹:۔ فنی اعتبار سے اقبال اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہیں۔ اردو شاعری کو انہوں نے نیا آہنگ اور نیا لب ولہجہ دیا ہے انہوں نے فن میں ادب کی مقصدیت اور افادیت کے تمام تقاضوں کو سمویا ہے۔

۱۰:۔ اقبال ایک ہمہ پہلو شخصیت ہیں۔ ان کی زندگی فکر اور پیغام میں بھی ہمہ جہتی ہے۔ جادۂ حق کے رہرو مفکر اقبال

کی روشنی میں منزلِ مراد تک پہنچتے جاتیں گے۔

۱۱:۔ اقبال کا تمام فلسفہ مکمل وحدت ہے۔ اقبال نے دوسرے فلسفیوں کا مطالعہ تو کیا ہے۔ مگر خوشہ چینی نہیں کی۔ بلکہ ان کی اصلاح کا کام کیا ہے۔

اکبر کے دیوان عام میں مغلیہ سلطنت کے جاہ وجلال کے نقوش رفتہ کے مطالعہ کے ساتھ فکر اقبال کے یہ زاویے بھی مکمل ہو گئے۔ مہمانان گرامی کے کوچ کا اعلان کیا گیا۔ آج اقبال کی یاد ایسے مقامات پر منائی جا رہی ہے۔ جن سے ان کے کلام میں نفرت کا احساس ملتا ہے۔ سائے ڈھل رہے تھے۔ اور سورج اپنا منہ چھپائے کسی اور وادی کی طرف شب باشی کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔

اعجاز الحق قدوسی

اقبال کانگرس کے بزرگ مندوب جناب اعجاز الحق قدوسی ہماری قدیم تہذیبی روایات میں ڈھلے ہوئے بزرگ ہیں۔ میانہ قد، گندمی رنگ، وجیہہ چہرہ، جس پر کہولت نے جھریاں ڈال دی ہیں۔ شیروانی پاجامہ اور قراقلی ٹوپی میں ملبوس چہرے پر سفید داڑھی کے ساتھ نظر کی عینک نے بزرگی میں کچھ اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ قلب ونظر میں روحانیت کی دولت سمیٹے ہوئے ہیں قدوسی صاحب جالندھر میں ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے اور مشہور دینی درسگاہ مظاہر العلوم سہارنپور میں تعلیم حاصل کی مدت العمر یک حیدر آباد دکن میں مذہبی امور کے شعبہ سے متعلق رہے۔ سندھی ادبی بورڈ کراچی، انجمن ترقی اردو، اردو ترقیاتی بورڈ کراچی، اور کئی دوسرے اداروں سے منسلک رہے ہیں۔ اسلامی موضوعات پر بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ مسلم صوفیا۔ کی سوانح لکھنے میں آپ کو خصوصی کمال حاصل ہے۔ علامہ پران کی ایک کتاب اہل علم سے خراج وصول کر چکی ہے۔ جب کہ دوسری ان دنوں زیر ترتیب ہے۔ آپ ان دنوں مستقلاً کراچی میں مقیم ہیں۔

آپ سے انٹرویو لینے کی غرض سے جب کمرہ نمبر ۲۱۶ کے دروازے پر دستک دی تو آپ نے بڑی محبت سے بٹھایا۔ میں نے اپنی آمد کی غرض بیان کی تو فرمانے لگے کہ ہم کہنہ دماغ لوگوں سے آپ کو کیا حاصل ہوگا۔ میں مولانا کی انکساری سے بیحد متاثر ہوا۔ پھر سلسلۂ کلام شروع ہوا۔ اور اس نے یہ صورت اختیار کی۔

۱:۔ اقبال کا پیغام لا الٰہ الا اللہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۲:۔ مجھے یوں تو سبھی کتابیں پسند ہیں مگر فارسی مجموعوں میں جاوید نامہ، پیام مشرق اور زبورِ عجم پسند ہیں۔ لیکن میرے دل کی تشفی صرف "جاوید نامہ" سے ہوتی ہے۔

۳:۔ اقبال کامل ـــــ عبدالسلام ندوی

اقبال کا سیاسی کارنامہ ـــــ محمد احمد خاں

۴:۔ "اقبال کے محبوب صوفیہ" چھپ چکی ہے۔ جب کہ "اقبال اور علمائے پاک وہند" چھپ رہی ہے۔ "کلام اقبال میں تصورِ پاکستان کے عناصر" کے موضوع پر ایک مقالہ بھی لکھا ہے۔

۶ :- ان کا فکر، ان کا تعقل، اثر انگیزی اور وجد آفریں کلام۔

۷ :- فارسی کا یہ شعر پسند ہے ؎

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند

جہانے را دگرگوں کرد یک مردے خود آگاہے (زبورِ عجم)

اردو میں یہ اشعار پسند کرتا ہوں ؎

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی امروز

نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود

ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

۸ :- دوانوہ منزل الہ آباد میں ۱۹۳۰ء میں فرمایا تھا کہ برصغیر میں مسلمانوں کے لئے ایک ایسی اسلامی مملکت کی ضرورت ہے۔ جس میں مسلمان اپنی ثقافت، تہذیب اور معاشرت کو پروان چڑھا سکیں۔

۹ :- ایشیا کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اور وہ مغرب کے شعراء میں فکر کے اعتبار سے ممتاز اور نمایاں مقام رکھتا ہے۔

۱۰ :- میں تو اقبال کو صرف مسلمان ہونے کے ناطے سے پہچانتا ہوں۔ ان کی فکر اسلامی کی وجہ سے ان کا عاشق ہوں۔ وہ بہت بڑے مفکر اور شاعر ہیں۔ سینکڑوں برس بعد کہیں ایسا شاعر پیدا ہوتا ہے۔

۱۱ :- خودی ــــ کیونکہ قرآن مجید میں ہے کہ عزت اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے لئے ہے میرے خیال میں علامہ کا فلسفۂ خودی قرآن کی اسی آیت سے ماخوذ ہے۔

منزل اقبال کی یہ مختصر داستان سفر جلد ہی طے ہو گئی۔ لیکن قدوسی صاحب کی بزرگی اور جلالت کے نقش ابھی تک ذہن میں مرتسم ہیں۔

محمدؐ آفاق صدیقی

۸ دسمبر کو سیالکوٹ کے جذبات آفریں اور کیف آور سفر سے واپسی میں میری نشست محترم آفاق صدیقی صاحب کے ساتھ تھی۔ موقع سے استفادہ کے لئے میں نے انٹرویو لینے کی جسارت کی۔ صاحب موصوف بہت وضع دار آدمی نکلے۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ والی صورت پیدا ہو گئی۔

آفاق صاحب انڈیا میں مین پوری میں ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جس میں اقبال پر ایک "دانائے راز" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ فرید مقالات بھی ہیں۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج میرپور خاص میں شعبۂ اردو کے استاد ہیں۔ اقبال کے مطالعہ سے موصوف کو خصوصی شغف ہے۔

۱ :- میرے نزدیک ان کے کلام و پیام کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اسلام جو تمام بنی نوعِ انسان کے لئے خیر کثیر اور

امن و آشتی کا داعی ہے۔ اس کی اعلیٰ اقدار کو سنجیدگی، جگرداری، ثابت قدمی اور خلوص کے ساتھ ہم اپنے فکر و عمل میں بروئے کار لائیں۔ اور عالم انسانیت کو نہ صرف مادی وسائل کے لحاظ سے بلکہ روحانی قدر و قیمت کے لحاظ سے زندگی کی صحیح سمت سے آشنا کریں۔

۲ :- اردو میں "ضرب کلیم" اس لئے کہ اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ فارسی میں "پس چہ باید کرد ـــــ اے اقوام شرق" مشرق کی پسماندگی اور بے راہ روی کے پیش نظر علامہ اس تہذیبی اور ثقافتی ورثے کیطرف از سر نو رجوع کرنا چاہتے ہیں۔ جو اقوام عالم میں ان کو سرخرو کر سکے۔

۳ :- رُوحِ اقبال ـــــ ڈاکٹر یوسف حسین خاں

فکرِ اقبال ـــــ خلیفہ عبدالحکیم

STUDIES IN IQBAL BY S. A. VAHID

۴ :- میں نے اقبال پر مختلف موضوعات پر مضامین و مقالات لکھے ہیں۔ جن کا نام "دانائے راز" ہوگا۔ اس کانگرس میں "مکاتیبِ اقبال کا ادبی جائزہ" کے نام سے ایک مضمون پڑھا ہے۔

۵ :- بڑا اچھا اور اچھوتا سوال ہے فکرِ اقبال کا مستقبل میرے نزدیک ساری دُنیا کے عظیم دانشوروں سے زیادہ روشن ہے اہلِ علم و فکر جیسے جیسے اقبال کے کلام سے آشنا ہوتے جائیں گے۔ علامہ عمومی اور خصوصی مقبولیت حاصل کر لیں گے۔

۶ :- اقبال کے کردار کا جو پہلو مجھے پسند ہے اس کا تذکرہ اس شعر میں ہے ؎

خوش آگئی جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر میرا کیا ہے، شاعری کیا ہے

۷ :- اردو کا پسندیدہ شعر تو یہ ہے ؎

دِل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دِل کا نور نہیں!

۸ :- اقبال کا تصورِ پاکستان تو سیدھے لفظوں میں یہ تھا کہ بّرِصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک ایسی تجربہ گاہ کا قیام عمل میں آئے جو پُورے عالمِ اسلام اور پُوری انسانیت کے لئے ایک نمونہ ہو۔

۹ :- اقبال کا نظریۂ فن ہمیں پیش نظر رکھنا ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ فن کو بامقصد رجائیت سے آشنا کیا جائے اور ایسی فنکاری کو قبول نہ کیا جائے۔ جس کا مقصد محض تفنن طبع اور سطحی تفریح ہو۔

۱۰ :- علامہ اقبال کی کئی حیثیتیں ہیں۔ وہ ایک جامع الصفات مصلح ہیں۔ شاعری، فلسفہ اور خطبات وغیرہ عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہیں۔

۱۱ :- فلسفۂ اقبال کا وہ پہلو پسند ہے جو اسلام کے اجتہادی عمل کو عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرے۔

ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل

ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل چہرے بہرے کے اعتبار سے سرسید نما ہیں۔ پاجامہ اچکن سر پر ٹوپی اور چہرے پر گھنی داڑھی نے ان کی شخصیت کو بہت بارعب بنا رکھا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ لیکن سندھی اور اردو زبان کے بہت اچھے شاعر اور ادیب ہیں۔

آپ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے بمبئی سے ۱۹۲۵ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی اور آسٹریا میں پوسٹ گریجویشن کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ لیاقت میڈیکل کالج حیدرآباد ڈو میڈیکل کالج کراچی میں پڑھاتے رہے ہیں۔ بہت سے ہسپتالوں میں بطور میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کام کر چکے ہیں۔ ان دنوں حیدرآباد صدر میں اپنا کلینک چلا رہے ہیں۔ آپ سندھی زبان کے مایہ ناز ادیب ہیں اور سندھی میں علامہ پر بہت سے مضامین لکھ چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو اور سندھی میں اہم موضوعات پر کتب لکھی ہیں۔ آپ کی ذاتی لائبریری گیارہ ہزار کتب پر مشتمل ہے۔ کانگرس کے آخری روز آپ سے انٹرویو حاصل کیا گیا جو اگرچہ مختصر مگر جامعیت کا حامل ہے۔

۱ :۔ اقبال کے پیغام کے مرکزی نقطہ کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا از بس ضروری ہے کہ آپ قرآن کے شارح اور مفسر ہیں دوسری بات آپ کے جذبۂ عشق رسول کے سلسلہ میں کہنا چاہتا ہوں۔

۲ :۔ علامہ کی تصانیف میں "اسرار و رموز" کو اولیں حیثیت دیتا ہوں۔ قرآنی ضابطۂ حیات کی اس سے بہتر تشریح ممکن نہ تھی۔

۳ : اس ضمن میں صرف ایک کتاب کا ذکر کروں گا۔ اور محمد علی میکش اکبرآبادی کی کتاب "نقد اقبال" ہے۔

۴ :۔ سندھی زبان میں بہت سے مضامین فکر اقبال پر لکھ چکا ہوں۔ اب سندھی زبان ہی میں میری کتاب "اقبال — سوانح و افکار" کے نام سے چھپ رہی ہے۔

۵ :۔ یہ بہت جاندار سوال ہے اقبال کی فکر کا مستقبل وہی ہے۔ جو اسلام کا ہے۔ لہٰذا مستقبل میں اقبال کی فکر زیادہ موثر ہوگی۔ اقبالیات پر کتب کی اشاعت سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۶ :۔ اقبال اخلاقیات اور قرآنی تعلیمات کی طرف سے رغبت دلاتے ہیں۔ اس سے نوجوانوں کے کردار کی تعمیر نو ہوگی۔ یہ پہلو بہت عمدہ ہے۔

۷ :۔ کسی ایک شعر کا انتخاب میرے لئے نہایت مشکل ہے معاف فرمائیے۔

۸ :۔ یہ بالکل واضح ہے کہ الہ آباد کے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کی سیاسی آزادی کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاکہ مسلمان اپنے سیاسی افکار و نظریات کے مطابق زندگی کو ڈھال سکیں۔

۹ : اقبال تو فن کو مانتا ہی نہیں لیکن اس نے فن کو استعمال کیا ہے۔

۱۰ : ہے تو صرف شاعر اور نرا شاعر مگر مقصدیت کا شاعر ہے۔ قرآنی تعلیمات کو شعر کے پیرائے میں پیش کرتا ہے۔

اور اس کا فلسفہ بھی اسلامی رنگ لئے ہوئے ہے ۔

۱۱ :۔ فلسفہ میں آپ نے مشرق و مغرب کے سب فلسفیانہ نظریات کا مطالعہ کیا ہوا تھا۔ مگر ان کی نظر صرف اسلامی فلسفۂ حیات پر ہے ۔ وہ مسلمانوں کے عظیم فلسفی ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب نے انٹرویو کے بعد مجھے حیدر آباد آنے کی دعوت دی جسے میں اپنے لئے سعادت تصور کرتا ہوں اس طرح مجھے ان کی عظیم و ضخیم لائبریری کو دیکھنے کا موقع میسر آئے گا۔

انور سدید

پیشے کے لحاظ سے انجنیئر اور ذوق کے اعتبار سے ادیب، جناب انور سدید کا تعلق سرگودھا کی سرزمین سے ہے ۔ اردو تنقید میں آپ کا نام ایک خاص انفرادیت کا حامل ہے۔ تنقید اگر کسی درجہ تخلیق کے درجہ میں شمار کی جا سکتی ہے ، تو اس کے ثبوت کے لئے ان کی کتب "فکر و خیال" اور "اختلافات" کا مطالعہ فرمائیں۔ ان مضامین سے موصوف کے وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ نے اگرچہ اقبالیات پر کچھ زیادہ نہیں لکھا لیکن جس قدر مضامین آپ نے اس موضوع پر لکھے ہیں۔ ان سے آپ کے مزاج کی جدت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اگر یہی رفتار رہی تو یقین جانئے کہ مستقبل قریب میں آپ کے قلم سے اقبالیات کے اہم ترین موضوعات پر مثبت سوچ کا اظہار ملے گا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ میرے سوالنامے کے لئے آپ نے تحریری جوابات رقم کئے ہیں یہ لیجئے مطالعہ فرمایئے ۔

۱ : میری رائے میں اقبال کے پیغام کو کسی ایک نقطے پر مرکوز کرنا ممکن نہیں ۔ اقبال نے شوکت و عظمت اسلام کو اپنے افکار کا محور بنایا اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کو قریب تر لانے کے لئے مذہب کی نئی تعبیر پیش کی۔ انہوں نے انسان کے داخلی اوصاف کو اہمیت دی۔ اور بساطِ حیات پر اس کی نئی حیثیت متعین کی۔ بیسویں صدی کی مادیت نے انسان کا وجدانی رشتہ کمزور کر دیا تھا۔ اقبال نے عالم مادی کی حدود متعین کیں۔ اور انسان کے وجدان کو دوبارہ بیدار کیا۔ اقبال نے عقل کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ اور انسان کو پابہ گل ہونے کا مشورہ دیا۔ تاہم ان کے ہاں عشق کی جست میں جو مراحل طے ہو جاتے ہیں۔ وہ عقل کی رہنمائی میں شاید کبھی طے نہ ہو پائیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اقبال نے خدا کی وحدانیت میں یقین کا بل پیدا کیا۔ اور وہ تمام اوصاف جو یزدانی ہیں ان کا عکس مردِ مومن میں دیکھنے کی آرزو کی۔ اس اجمال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال نے انسانی زندگی کے بے شمار گوشوں کو منور کیا۔ اور عقائد و نظریات و اقدار و اخلاقیات کو ایک واضح حیثیت دی۔ یہ سب فکر اقبال کے مرکزی نقطے ہیں۔ ان افکار کے ارتکاز کا نام اقبال ہے۔ اور اقبال کو ریزہ ریزہ کر کے اس کی ادبی و فکری حیثیت متعین کرنے کے بجائے پورے اقبال کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے ۔

۲ :۔ اول الذکر سوال کی طرح یہ سوال بھی اقبال کے صرف ایک جزو کو موضوع بناتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا فکری ارتقاء اس قدر مربوط اور ہم آہنگ ہے کہ اس کے پورے مطالعے کے لئے ایک کڑی کو دوسری کڑی سے

ملانا ضروری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ "بانگِ درا" اور "اسرارِ خودی" سے لے کر "ارمغانِ حجاز" اور اب "باقیاتِ اقبال" تک فکرِ اقبال کا پورا ایک سلسلہ ہمارے سامنے ہے۔ مطالعہ اگر صرف ایک کتاب تک محدود کیا جائے۔ تو اقبال کے بعض تضادات بری طرح کھٹکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ادبا، جنہوں نے بطلانِ اقبال کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ درحقیقت اقبال کو سیاق و سباق سے الگ کر کے پڑھتے اور غلط نتائج اخذ کر کے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ اقبال کو اس کی منظومات سے دریافت کرتے ہیں اور نثر کی کتابوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے وہ بھی سخت غلطی کرتے ہیں۔ اور اقبال کے افکار کے ایک بڑے ماخذ سے محروم رہ جاتے ہیں۔ میری رائے میں اقبال پر ایک کامل نظر ڈالنے کے لیے اس کی کتابوں کو ہمیشہ نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کا سچا محب "بانگِ درا" سے "ارمغانِ حجاز" تک سب کتابوں کو عزیز رکھتا ہے۔ میں نے اقبال کی ادبی حیثیت متعین کرنے کے لیے اس کی شاعری کی کتابوں کا مطالعہ بنظرِ غائر کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ میری کتاب "اقبال کے کلاسیکی نقوش" کے مضامین میں انہی کتابوں سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے۔ فکرِ اقبال کا اصلی ماخذ "اسلام میں الہیات کی تشکیلِ نو" ہے اور اس طرف شاید بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ حال ہی میں سید عبداللہ نے اس کی طرف توجہ دی اور ایک کتاب "متعلقاتِ فکرِ اقبال" شائع کی جس میں متعدد اہلِ علم نے اقبال کے خطبات پر خیال افروز مضامین لکھے اور اقبال کے فکر کو دوبارہ دریافت کرنے کی کوشش کی مجھے اقبال کی یہ کتاب سب سے پسند ہے۔ اور اس کا مطالعہ ہر دفعہ ذہن و فکر کو نئی تازگی عطا کرتا ہے۔

۳:۔ فکر و فنِ اقبال پر اب تک جو سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ڈاکٹر یوسف حسین خان کی "روحِ اقبال" خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب "فکرِ اقبال" پروفیسر رفیع الدین کی کتاب "حکمتِ اقبال" اور ایم ایم شریف کے متعدد مضامین کو اہمیت حاصل ہے۔ عبدالسلام ندوی کی کتاب "اقبالِ کامل" اور عزیز احمد کی "اقبال ایک نئی تشکیل" بھی قابلِ قدر کتابیں ہیں۔ ان کتابوں میں اقبال کے فکر و فن کی انفرادیت کی بڑی خوبی سے متعین کیا گیا ہے بعض مصنفین نے فکرِ اقبال کے ماخذات تک بھی عمدہ رسائی حاصل کی ہے۔ اور یوں برگساں، سپائی نوزا، میکٹے گارٹ، میکڈوگل، ہیگل، نیٹشے وغیرہ کے افکار پر بحث بھی کی ہے۔ تاہم ان سب پر ایک اجتماعی نظر ڈال کر عالمی فلسفے میں اقبال کی حیثیت متعین کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حال ہی میں اقبال اکادمی نے اس طرف توجہ کی اور ڈاکٹر وزیر آغا سے "تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں" لکھوائی۔ اس کتاب کا موضوع اگرچہ عشق و خرد تک محدود ہے۔ لیکن ڈاکٹر وزیر آغا نے اس میں وسعت پیدا کی ہے۔ اور اقبال کو عالمی تناظر میں پرکھنے کی سعی کی۔ میری رائے میں متذکرہ کتاب اقبال کو ایک جداگانہ انداز میں موضوع بناتی ہے۔ اور مجھے تاحال شائع شدہ کتب میں سے زیادہ پسند ہے۔

۴:۔ اقبال اگرچہ میرے مطالعے اور ذوق کا اساسی جزو ہے۔ تاہم مجھے اعتراف ہے کہ میں اقبال پر حسبِ خواہش کام نہیں کر سکا۔ کچھ عرصہ قبل میں نے اقبال کی غزل پر کام کرنا شروع کیا۔ لیکن یہ کام ابتدائی دور کی غزل سے آگے

نہ بڑھ سکا۔ ایک زمانے میں میں نے DEATH INSTINCT کو شعراء کے کلام سے دریافت کرنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ اس زاویے سے میں نے اقبال کے تصورات مرگ کا تجزیہ بھی کیا اور بالعموم پسند کیا گیا۔ اقبال کا نسبتاً طویل مطالعہ میں نے "اقبال کی تحریک" میں کیا اور وسیع تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ سب مضامین میری کتاب "اقبال کے کلاسیکی نقوش" میں شائع ہو چکے ہیں۔ چند موضوعات جن پر میں مواد جمع کر رہا ہوں۔ وہ اقبال کا "تصورِ باری تعالیٰ" اور "اقبال اور غالب کے مماثلات" ہیں۔ ایک کتاب اقبال شناسوں پر لکھنے کی آرزو ہے۔ چنانچہ "اقبالیات کی تحریک" کے زیرِ عنوان میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وزیر آغا پر مقالات لکھ چکا ہوں۔ معلّمِ اقبال کے تحت سید وقار عظیم، مورّخِ اقبال کے طاہر فاروقی، تنقیدِ اقبال کے تحت یوسف حسین خان اور مصوّرِ اقبال کے تحت چغتائی وغیرہ پر مضامین لکھنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ اور ان موضوعات پر مواد جمع کر رہا ہوں۔ اقبال پر یہ کام درحقیقت اقبال فہمی کی ایک کاوش ہے۔ اور یہ میرے ذاتی انشراحِ قلب کا بھی وسیلہ ہے۔

۵ :۔ فکرِ اقبال زندگی کے تمام زاویوں پر محیط ہے۔ اور یہ دینِ فطرت کو ہی دائرہ نور میں لاتا ہے۔ اس کا پیغام عالمگیر اور تاثر دوامی ہے۔ یہ زندگی میں ولولہ اور تازگی پیدا کرتا ہے۔ قنوطیت اور مایوسی کے بجائے حوصلہ پرور ہے اس لئے اس کا مطالعہ جوں جوں زیادہ ہوگا۔ فکرِ اقبال کا دائرہ وسیع تر ہو جائے گا۔ اقبال نے فکر کے مستقبل کو روشن کیا ہے اس لئے اس کی تابندگی روز افزوں زیادہ ہوگی۔

۶ :۔ اقبال کی شخصیت خود شناسی اور خدا شناسی کا مرکب ہے۔ وہ عظمتِ انسان کے قائل ہیں اور انسان کو شانِ خداوندی سے ہمکنار کرنے کے آرزومند، دوسری طرف انہوں نے تعظیم و تسلیم و نیاز کے لئے حضور سرورِ کائنات ﷺ کو دنیا کا مثالی انسان تصور کیا اور ان کے اسوۂ حسنہ کو فلاح کا وسیلہ قرار دیا۔ چنانچہ اقبال کے کردار کا یہ پہلو بھی سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے کہ وہ خودی اور انکساری کی انتہاؤں میں بُعد پیدا کرنے کے بجائے ان میں توازن پیدا کرتے ہیں۔ اور انسان کو زندگی میں اعتدال کی روش اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں

۷ :۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا بے حد مشکل ہے کہ مجھے اقبال کا کونسا شعر زیادہ پسند ہے۔ اقبال تو زندگی کے ہر قدم پر معاونت کرتا ہے۔ آپ نے اگلے سوال میں اقبال کے فنی مقام کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ اور مجھے اقبال کے نظریۂ فن پر جو شعر یاد آیا ہے فی الحال اسے ہی پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں ؎

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے، خونِ جگر سے نمود

۸ :۔ اقبال کا تصورِ پاکستان — "ہمارا پاکستان" ہے۔ لیکن یہ صورت کچھ یوں ہے کہ ؎

میرِ سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف
آہ وہ تیرِ نیم کش، جس کا نہ ہو کوئی ہدف

- - -

۹:۔ اقبال شاعر امروز و فردا ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنے عہد کو اور اپنے مستقبل کو یکساں انداز میں متاثر کیا۔ ان سے ترقی پسند شعراء نے مقصدیت کے زاویے سے، رومانی شعراء نے تخیلی اڑان کے انداز اور نظم جدید کے شعراء نے دروں بینی حاصل کی۔ اقبال ایک ایسا مینارۂ نور ہے جو ہمارے ادب میں اپنی روشنی دُور دُور تک پھیلا رہا ہے۔ اور آنے والی نسلیں اس کی بتائی ہوئی راہوں پر سفر کر رہی ہیں۔ حال ہی میں "اوراق" نے "جدید نظم نمبر" شائع کیا ہے۔ اور اقبال کو نظمِ جدید کا پیش رو قرار دیا ہے۔

۱۰:۔ بنیادی بات یہ ہے کہ شاعرِ اقبال فلسفی اقبال سے الگ ہرگز نہیں۔ اقبال کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے فلسفے کی موضوعیت کو شاعری پر غالب نہیں آنے دیا۔ اور معروضی کیفیت کو بوجھل بنائے بغیر فن کی اقدار کو زندہ رکھا۔ وجدانی سطح پر اقبال کا تجزیہ جمالیاتی ہے۔ اور وہ جب مخفی قوت سے رشتہ قائم کرتے ہیں۔ تو واپس اپنی دُنیا میں بھی آتے ہیں۔ اور اس تجربے میں عامۃ الناس کو بھی شریک کرتے ہیں۔ اقبال کی تیسری حیثیت تصوّرِ پاکستان کے خالق کی ہے یہ ان کی شخصیت کا سیاسی زاویہ ہے۔ اقبال کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے بحیثیت شاعر جو خواب دیکھا۔ بحیثیت فلسفی اسے فکری اساس عطا کی۔ اور اس کی کامیابی کی نہایت یہ ہے کہ ان کی وفات کے چند سال بعد اس خواب کی عملی تعبیر ہمارے سامنے آگئی۔ میں جس اقبال کا ثناخوان ہوں وہ انہی تین زاویوں کا کیمیائی مرکب ہے۔

۱۱:۔ ؎ جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

پروفیسر سلیم اختر

اقبال شناسوں کے لئے پروفیسر سلیم اختر کا نام اور کام محتاجِ تعارف نہیں۔ انٹرنیشنل کانگرس میں ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں اقبالیات کی جو نمائش ترتیب دی گئی۔ اس میں ڈاکٹر وحید قریشی اور پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے ساتھ مل کر آپ نے اقبال دوستی کا حق ادا کیا۔ لیکن مجھے اس ضمن میں جو بات کہنا ہے وہ یہ کہ آپ نے اقبالیات کے ان گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ جنہیں اقبال دوست بزرگ بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ نے اس سال اقبالیات کے ضمن میں جس مقدار اور معیار سے لکھا ہے اس کی تفصیل تو آپ کو اس انٹرویو میں نظر آئے گی۔ لیکن اقبال شناسی میں آپ نے ایسی بنیادیں تلاش کی ہیں۔ جن سے فکرِ اقبال کے نئے گوشے سامنے آئیں گے۔ اقبال کی شخصیت اور فکر کے نفسیاتی مطالعہ پر آپ کی تحقیقی اور تنقیدی کاوش ان دنوں اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے موضوعِ بحث ہے۔ جہاں تک انٹرویو کا تعلق ہے۔ وہ پیشِ خدمت ہے۔

۱:۔ اقبال کے پیغام کا مرکزی نقطہ "خودی" ہے۔ یوں تو اقبال نے عشق، مردِ مومن، عقل وغیرہ کے بارے میں بھی خصوصی تصوّرات پیش کئے ہیں۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سب تصوّرات اپنے تنوع کے باوجود خودی کے مرکزی تصوّر کی تابع ہیں۔ اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ جیسے نظامِ شمسی میں تمام سیارگان بظاہر آزاد اور خود مختار گردش کناں ملتے ہیں۔ لیکن درحقیقت سورج کی ڈور سے بندھے ہیں۔

۲ :- "RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM"

اقبال کے ان خطبات کا مطالعہ آسان نہیں ہے۔ اور شاید اسی لئے اقبال شناسوں کی اکثریت نے اسے بھاری پتھر سمجھ کر چوم کر چھوڑ دیا ہے۔ یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ اس کا ترجمہ اچھا نہیں ہوا۔ اس سے بھی کتاب کی مقبولیت کو دھچکا پہنچا ہے۔ حالت یہ ہے کہ اردو کے ترجمہ کے مقابلہ میں اصل زیادہ آسان کو محسوس ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے بعض اصحاب نے ان خطبات کے خلاصے لکھنے کی بھی کوشش کی تاکہ اسے قبولِ عام نصیب ہو۔ اس پسندیدگی کی وجہ واضح ہے کہ اس مطالعہ کے بغیر فکرِ اقبال کے درست تناظر کا سراغ نہیں مل سکتا۔ ہمارے اقبال شناسوں کی اکثریت اس کتاب سے بے بہرہ ہے اور اس لئے ان کے مقالات محض اشعار کی تشریح پر مبنی کلاس نوٹس کی صورت میں ملتے ہیں۔

۳ :- ڈاکٹر یوسف حسین خان کی "رُوحِ اقبال"

۴ :- سالِ اقبال کے دوران مندرجہ ذیل کتابیں لکھی یا مرتب کی ہیں۔ ان میں سے اول الذکر تین چھپ چکی ہیں جبکہ باقی ابھی کتابت و طباعت کے مراحل طے کر رہی ہیں۔

(۱) اقبال کا نفسیاتی مطالعہ
(۲) فکرِ اقبال کے منوّر گوشے
(۳) اقبال کا ادبی نصب العین
(۴) اقبال ممدوحِ عالم
(۵) اقبالیات کے نقوش
(۶) اقبال شاعرِ صد رنگ
(۷) اقبال اور ہمارے فکری رویّے
(۸) ایران میں اقبال شناسی کی روایت
(۹) فکرِ اقبال کا تعارف (فرانسیسی اقبال شناس لیوس کلاڈ میتری کی کتاب کا ترجمہ۔)

۵ :- فکرِ اقبال کا مستقبل تابناک ہے۔ کہ ہم پاکستانیوں کو رہنمائی کے لئے ہمیشہ اقبال کے افکار کی ضرورت رہے گی۔

۶ :- میں نے ایک مقالہ لکھا ہے "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" اور اس پر خوب گالیاں کھائی ہیں اس لئے اصل جات تو نہیں کرتا لیکن جواب کی حد تک اقبال کا یہ مصرع کافی سمجھئے ؎

یہ مردِ تن آساں تھا، تن آسانوں کے کام آیا

۷ :- اردو شعر یہ ہے ؎

میری نوائے شوق سے شورِ حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

فارسی شعر یہ ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم!

۸ : کم از کم یہ تو نہ ہوگا۔ جو آج نظر آ رہا ہے۔

۹ : ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے کلاسیک شاعر کے لئے جن خصائص کو لازم قرار دیا ہے۔ اگر انہیں ملحوظ رکھیں۔ تو یقیناً اقبال اردو کے کلاسیک ہیں۔ اقبال نے اصناف شعر کے مروج سانچوں سے بغاوت نہ کی۔ واضح رہے کہ وہ نظم معریٰ کے مخالف تھے۔ اور شاعری کے لئے پابندیٔ عروض اور قافیہ ردیف کو لازم گردانتے تھے۔ بحیثیت شاعر اقبال کا کمال ان کی فنی عبارت میں مضمر ہے انہوں نے غالب کی مانند تنگنائے غزل کا شکوہ بھی نہ کیا۔ لیکن مضامین نو سے غزل کی کایا پلٹ دی۔ اقبال اسی لئے عظیم شاعر ہیں کہ انہوں نے نظم و غزل سے وابستہ اظہار کے تمام امکانات کو بروئے کار لاکر انہیں فنی بلندی کے ارفع مقام تک پہنچایا۔

۱۰ : اقبال بنیادی طور پر معلم تھے۔ ان کا فلسفہ اصلاح قوم کے لئے تھا۔ اور ان کی شاعری خشک فلسفہ کے ابلاغ کا ایک خوبصورت ذریعہ تھی۔ مگر اقبال دیگر معلمین قوم سے اس بنا پر ممتاز اور منفرد ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے تمام زندگی کو اس کی گوناگوں پیچیدگیوں سے ہٹ کے کر جو نتائج اخذ کئے۔ پھر ان کی روشنی میں جہد زیست کے جو اصول مرتب کئے وہ بظاہر مسلمانوں کے لئے تھے۔ لیکن اپنی عمومی صورت میں وہ کل انسانیت کے لئے علمی دوست ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے اقبال روایتی معنوں میں شاعر یا فلسفی یا مصلح نہیں رہتے۔ اور اپنے پیغام کی آفاقیت کی بنا پر اگر پیغمبر نہیں تو پیغام بر یقیناً قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

۱۱ : فلسفۂ اقبال ہمہ جہت ہے اور مختلف تصورات اپنے اندر دل کشی کا ایک جہان لیے ملتے ہیں۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر ان کے فلسفہ میں جدوجہد کی تلقین پسند ہے۔ اقبال نے مرد مومن اور شاہین کے جو تصورات پیش کئے تھے وہ اپنی اساس میں جہد زیست کے لئے ہیں۔ اسی طرح جب اقبال نے جبریل پر ابلیس کو فوقیت دی اور اسے خواجہ اہل فراق کہہ کر اس کی زبان سے یہ کہلوایا تھا۔

سوز و ساز و درد و داغ و جستجوئے و آرزو

تو در حقیقت یہ بھی جہد زیست کے لئے ہی تھا۔ اسی طرح جب اقبال نے مسولینی اور لینن ایسی شخصیات کو سراہا تو یہ بھی جہد زیست کے لئے ہی تھا۔ یا جب انہوں نے وصال پر فراق کو، قیام پر سفر کو ترجیح دی تھی تو وہ عمل اس جہد زیست کے لئے ہی تھا۔ الغرض اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی جہد زیست کو متنوع انداز سے واضح کرنے کے لئے وقف کیا گیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر شمس الدین صدیقی

ڈاکٹر صاحب اردو ادبیات کے جید اساتذہ میں سے ہیں۔ آپ نے جامعہ عثمانیہ اور وسکنسن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل

کی۔ لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج لاہور میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان دنوں پشاور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے چیئرمین ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے تحت شائع ہونے والی "تاریخ ادبیات" میں تیرہ ابواب لکھے۔ تیس سے زیادہ تحقیقی اور علمی مقالات ملک کے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ بہت سی کتابوں کے مرتب ہیں۔

ڈاکٹر صاحب علم و حلم کی تصویر، شرافت و متانت کا پیکر اور عجز و نیاز کا جوہر ہیں۔ طبیعت میں سادگی لیکن وقار دکھائی دیتا ہے۔ آپ کا ظاہر مغربی تہذیب کا مرقع لیکن باطن اسلامی اقدار سے مرصع ہے۔ مجھے ان سے اقبال کانگرس میں ملنے کا موقع ملا۔ مگر یہ انٹرویو سوات میں جہاں زیب کالج میں منعقدہ ایک تعلیمی کانفرنس میں مکمل ہوا۔

۱ :۔ ان کے پیغام کا مرکزی نقطہ خودی ہے۔ یعنی انسان کا اپنی استعدادوں اور صلاحیتوں کو پہچاننا، ان سے کام لینا اور اپنی شخصیت کو تکمیل تک پہنچانا تاکہ نیابتِ الٰہی کا منصب حاصل ہو۔

۲ :۔ "بالِ جبریل" سب سے زیادہ پسند ہے۔ کہ اس میں شعریت بہت ہے۔

۳ :۔ فن شعر پر "شعر اقبال" اور فکر پر "رُوحِ اقبال" اور "اقبال کا نظریۂ اخلاق"

۴ :۔ تحقیقی کام تو کچھ نہیں کیا البتہ اقبال کی فکر کے مختلف پہلوؤں پر کئی مقالات لکھے ہیں۔ اور ڈاکٹر عشرت حسن انور کی کتاب " THE METAPHYSICS OF IQBAL " کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

۵ :۔ اقبال کے افکار و تعلیمات کا مستقبل میرے خیال میں روشن ہے۔ کہ اس کی اساس اسلام پر ہے اور میں اسلام کے مستقبل کے بارے میں پُر امید ہوں۔

۶ :۔ محبتِ رسولؐ اور قلندری۔

۷ :۔ آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ ۔
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

ــــ بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است ۔

۸ :۔ مثالی اسلامی مملکت جہاں مساوات، اخوت اور عدل و انصاف کا دَور دَورہ ہے۔

۹ :۔ شاعر کی حیثیت سے میں اقبال کو عالمی ادب کے بلند ترین شعرا کی صف میں جگہ دیتا ہوں۔

۱۰ :۔ شاعر کی حیثیت سے جس کا کلام "نغمۂ جبریل" بھی ہے۔ اور "صورِ اسرافیل" بھی۔

۱۱ :۔ اقبال کا فلسفہ خودی۔

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، اقبالیات پر تحقیق و تنقید میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ آپ ۱۹۴۲ء میں ضلع اٹک

میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۶۶ء میں ایم۔ اے اردو درجۂ اول میں پاس کیا۔ ماہنامۂ "سیارہ" اور "اردو ڈائجسٹ" میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج سرگودھا میں شعبۂ ادبیات اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ اقبال اکیڈمی اور رائٹرز گلڈ کے ممبر ہیں۔ علمی و ادبی حلقوں میں آپ کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ اقبالیات پر ملک اور بیرونِ ملک چھپنے والی سینکڑوں کتب اور رسائل و جرائد آپ کی لائبریری میں موجود ہیں۔ اقبالیات پر بیسیوں مقالات اور پانچ کتب کے مصنف ہیں۔ اقبالیات ہی کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کیلئے تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔ یقیناً آپ کا شمار عظیم اقبال شناسوں میں ہوتا ہے۔

۱:۔ پیغامِ اقبال کا مرکزی نکتہ خود شناسی اور خدا شناسی ہے (یہ دونوں لازم اور ملزوم ہیں) جس کے بغیر خودی کا استحکام ممکن نہیں۔

۲:۔ اقبال کی سب کتابیں پسند ہیں۔ مگر "بالِ جبریل" سب سے زیادہ پسند ہے۔ مسجدِ قرطبہ، ذوق و شوق اور ساقی نامہ جیسی منظومات اس کا بڑا سبب ہیں۔

۳:۔ پسندیدہ کتابوں میں سے چند ایک یہ ہیں۔

(ا) ایقانِ اقبال ——— پروفیسر مرزا محمد منور

(ب) نقوشِ اقبال ——— سید ابوالحسن علی ندوی

(ج) شعرِ اقبال ——— عابد علی عابد

(د) A STUDY IN IQBAL'S PHILOSOPHY از بشیر احمد ڈار

(س) اقبال کی شخصیت اور شاعری ——— پروفیسر حمید احمد خاں

۴:۔ تصانیف :

(۱) اقبال کی طویل نظمیں	(تجزیہ و تنقید)	لاہور ۱۹۷۴ء
(۲) کتبِ اقبالیات	(ببلوگرافی)	لاہور ۱۹۷۵ء
(۳) خطوطِ اقبال	(تدوین و حواشی)	لاہور ۱۹۷۶ء
(۴) اقبال بحیثیت شاعر	(تدوین و حواشی)	لاہور ۱۹۷۷ء
(۵) کتابیاتِ اقبال	(ببلوگرافی)	لاہور ۱۹۷۷ء

مختلف اقبالی موضوعات پر تقریباً پندرہ مقالات، علمی و ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ "تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھ رہا ہوں۔

۵:۔ تصورِ پاکستان، فکرِ اقبال کے نتیجے میں سامنے آیا۔ (بعد ازاں پاکستان قائم ہوا) اس لئے میرے نزدیک فکرِ اقبال کا (بڑی حد تک) پاکستان کے مستقبل پر موقوف ہے۔ پاکستان کے ناسازگار حالات کی وجہ سے فکرِ اقبال کو خاطر خواہ فروغ نہیں مل سکا۔

۶ :- درویش صفتی اور استغنا۔

۷ :- مجھے اقبال کا ہر شعر پسند ہے، انتخاب مشکل ہے کیونکہ ہر شعر ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

۸ :- پاکستان کے بارے میں علامہ اقبال کا تصور (خواب) کم از کم وہ نہیں تھا جس کا ہم بدقسمت لوگ گزشتہ تیس برسوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اقبال کا خواب ایک آزاد، ہر اعتبار سے خصوصاً ذہنی غلامی سے ۱۰ اور خود مختار اسلامی مملکت کا خواب تھا۔

۹ :- اردو شعر و ادب کی تاریخ میں علامہ کا فنی مقام کسی بھی بڑے سے کم نہیں۔ اردو کا کوئی اور شاعر فنی اعتبار سے شاید ہی اقبال سے لگا کھاتا ہو۔

۱۰، ۱۱: ان سوالات کے جوابات مرحمت نہیں ہوئے۔

پروفیسر رحیم بخش شاہین

اقبالیات کے شائقین کے لئے پروفیسر رحیم بخش شاہین کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ مشرقی پنجاب کے مردم خیز خطہ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ شعر و ادب سے زمانہ طالب علمی ہی میں لگاؤ پیدا ہو گیا۔ ۱۹۶۶ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے اردو میں ایم اے کیا۔ مختلف کالجوں میں ادبیات اردو کی تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ مشہور ماہرِ تعلیم اور محقق ڈاکٹر محمد اسلم قریشی کی زیرِ ہدایت اقبالیات پر تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ جو ابھی تک جاری ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی کچھ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ کچھ زیرِ طبع یا زیرِ تصنیف ہیں۔ اقبال پر تقریباً پچاس مقالات پاکستان کے وقیع علمی و تحقیقی رسالوں اور موقر اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اقبالیات کے ضمن میں آپ کی تحقیقات ہمیشہ روشن رہیں گی۔

۱ :- فکرِ اقبال کا مرکزی نقطہ "خودی" ہے۔ یہ لفظ قبل ازیں خود غرضی، غرور و تکبر کے معنوں میں مستعمل تھا۔ لیکن اقبال نے اسے قوتِ نفس، رفعتِ روح اور شعورِ ذات کا مفہوم دیا۔ دیگر ادیان و مذاہب کی روش کے خلاف اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا کرنے کی بجائے ان کے عمل کے لئے حدود متعین کرتا ہے۔ حدود کی اسی تعین کا نام اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔ خودی کا کمال یہ ہے کہ احکامِ الٰہی اس میں بدرجہ اتم سرایت کر جائیں حتیٰ کہ اس کے ذاتی میلانات باقی نہ رہیں۔ اور صرف رضائے الٰہی مقصودِ حیات بن جائے۔ خودی سے بیگانگی کی روش نے مسلمانوں کو زوال آشنا کیا اور غلامی و محکومی کے منفی اثرات نے اس روش کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اقبال نے اپنے کلام سے ان اثرات کو مٹانے کی زبردست کوشش کی۔ اور عالمِ اسلام کو ملوکیت اور غیر اسلامی تصوف کی زنجیروں سے آزادی حاصل کرنے اور عرفانِ خودی کا درس دیا۔ ان کے خیال میں صرف اسی طرح عالمِ اسلام اغیار کی جسمانی و ذہنی غلامی سے نجات حاصل کر کے اپنی عظمتِ گم گشتہ کی بازیافت میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

۲ : یوں تو اقبال کی ہر کتاب اس قابل ہے کہ اس کو ذوق و شوق سے پڑھا جائے۔ اور ان کی کسی ایک کتاب کو ان کی دوسری کتاب پر ترجیح دینا بھی درست نہ ہوگا۔ لیکن میرے نزدیک "پیام مشرق" (۱۹۲۳ء) کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے یہ کتاب مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب میں ہے۔ اس میں اقبال نے مغرب کی بالادستی اور برتری کے دعویٰ کی بھرپور تردید کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی دنیا کے دورِ زوال کے آغاز سے لے کر زمانہ بیداری تک صرف علامہ اقبال کی ذات ہے جس نے مشرق میں رہتے ہوئے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن میں مغربی غلبہ و تفوق کو للکارا اور اہل مشرق کے احساس کہتری کے خاتمے کی کامیاب جدوجہد کی۔ اقبال نے "پیام مشرق" میں ایک طرف تو مغربی تمدن کی "سست بنیادی" کو واضح کیا۔ جس کے پیشِ نظر صرف مادی غلبہ کا حصول ہے۔ اور دوسری طرف عالم انسانیت کی باطنی تربیت اور روحانی تزکیہ کے سلسلہ میں مشرق کے کردار کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ انہوں نے اقوام مشرق کو طویل خواب غفلت سے جگانے اور زندگی کی کشمکش میں نئے عزم و حوصلہ سے حصہ لینے کی ترغیب بھی دی ہے اور اقوام مغرب کو اخلاقی و روحانی اقدار اپنے اپنانے کا مشورہ دیا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ ان اقدار کے بغیر مادی ترقی انسانیت کے لیے رحمت کی بجائے زحمت ثابت ہوگی۔

۳ :۔ اقبال پر لکھی جانے والی مندرجہ کتب مجھے خاص طور پر پسند ہیں۔

"روحِ اقبال"۔ از ڈاکٹر یوسف حسین خاں
"حکمتِ اقبال"۔ از ڈاکٹر محمد رفیع الدین
"فکرِ اقبال کے منور گوشے"۔ از پروفیسر سلیم اختر

۴ :۔ اقبال پر میری مطبوعہ تصانیف یہ ہیں۔

(۱) اوراقِ گم گشتہ (نوادرِ اقبال) اسلامک پبلیکشنز لاہور ۱۹۷۵ء
(۲) اقبال کے معاشی نظریات۔ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس لاہور ۱۹۷۶ء
(۳) MEMENTOS OF IQBAL آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس لاہور ۱۹۷۶ء

غیر مطبوعہ اور زیرِ طبع کتب یہ ہیں۔

(۱) اقبال کے تعلیمی نظریات۔
(۲) نوادرِ اقبال۔
(۳) بیا بمجلس اقبال۔
(۴) اقبال و اکبر
(۵) حیاتِ اقبال
(۶) تعارفِ اقبال (اقبال پر لکھے گئے مقالات کا مجموعہ)

۵ :۔ فکرِ اقبال کا مستقبل مجھے بے حد روشن نظر آرہا ہے، لیکن مجموعی طور پر ہمارا رویہ مایوس کن ہے۔ ایک اقبال

ہی کا ذکر کیا ہم لوگوں نے تو سرورِ کائنات ؐ تک کی تعلیمات کو فراموش کر دیا ہے۔ اس امر کی شدید ضرورت تھی کہ سرکاری سطح پر فکرِ اقبال کو عام کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن اس سلسلہ میں جس غفلت کا مظاہرہ کیا جاتا رہا ہے وہ انتہائی قابلِ افسوس ہے۔ فکرِ اقبال کی اشاعت کے سلسلہ میں قائم کردہ سرکاری اداروں کے در و بام پر جو لوگ مسلط ہیں۔ ان کے پیشِ نظر اقبال فہمی کی راہ ہموار کرنے سے زیادہ مادّی منفعت اور ذاتی شہرت کا حصول ہے اس سلسلہ میں ہمارا دانشور طبقہ بھی اپنے فرائض صحیح طور پر سرانجام نہیں دے رہا۔ ورنہ اقبال کی جس فکر نے ہمیں فرنگی استعمار سے آزادی کے قابل بنایا تھا۔ وہ آج ہمیں قومی تعمیر و ترقی کی شاہراہ پر بھی کامزن کر سکتی ہے۔

۶:۔ اقبال نے خودی کا جو تصور پیش کیا ہے۔ اس کی بعض خصوصیات مثلاً سادگی، قناعت، حق گوئی و بے باکی وغیرہ ان کے اپنے کردار میں بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ لیکن مجھے ان کی قناعت پسندی خاص طور پر اچھی لگتی ہے۔ انہیں دولت کی حرص نہیں تھی۔ وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے باوجود انہوں نے روپیہ کمانے کی کبھی کوشش نہ کی۔ وہ ایک مشہور آدمی تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر لوگ ان کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، لیکن اقبال صرف اتنے مقدمے لیتے جن کی آمدنی سے ان کا خرچ پورا ہو جاتا۔ اور پھر اس بات کا بھی خیال رکھتے تھے کہ مقدمہ جھوٹا تو نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے بعض معاصر وکلاء کی طرح نہ تو پیشہ وارانہ شہرت حاصل کر سکے۔ اور نہ زیادہ مال و دولت جمع کر سکے۔ وکالت کے دوران بھی ان کی توجہ زیادہ تر علمی و ادبی سرگرمیوں اور قومی و ملی مسائل کی طرف مبذول کرائی۔

۷:۔ میرا پسندیدہ فارسی شعر یہ ہے؎

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

اور اردو شعر یہ ہے؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

۸:۔ علامہ اقبال کا تصورِ پاکستان کیا تھا؟ یہ موضوع تفصیل کا متقاضی ہے۔ میں نے اپنے مقالے "اقبال کا خطبۂ آلہ آباد۔ منظر و پس منظر" (اقبال ریویو، جنوری ۱۹۷۷ء) میں اس پر بحث کی ہے۔ مختصراً یہ کہ اقبال، کانگرس کے متحدہ ہندوستانی قومیت کے نعرے کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے تباہ کن خیال کرتے تھے۔ غیر مسلم اقوام کے ساتھ ایسا اشتراک جس میں مسلمانوں کا تہذیبی تشخص مجروح ہوتا ہو اور ان کا عقیدہ و مسلک قانونی حیثیت اختیار کرتا ہو ان کے نزدیک کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں تھا۔ انہوں نے واضح کیا کہ خاص طور پر ہندوستان میں جہاں ایک طرف متعصب ہندو اسلام کو ملیا میٹ کرنے کے درپے ہو اور دوسری طرف فرنگی استعمار مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی فکر میں ہو، مسلمانوں کے لئے اپنی عددی اکثریت کو نظر انداز کر کے کوئی سیاسی حل قبول کرنا ان کے لئے پیغامِ موت کے مترادف

ہوگا۔ لہذا انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے اکثریتی علاقوں میں اختیار و اقتدار کی نعمت سے بہرہ ور ہوں۔ تاکہ وہ کسی بیرونی دباؤ اور خوف سے آزاد ہو کر اپنی تہذیبی ترقی اور عالم انسانیت کی فلاح کے لئے اسلامی اقدار حیات کے عملی نفاذ کی جدوجہد میں مصروف ہوں۔ اقبال کا یہی تصور تھا جس نے بعد ازاں "پاکستان" کا نام پایا۔ قدرت نے مسلمانوں کو زریں موقع دیا ہے کہ وہ اپنی تہذیبی بالاتری کو عملاً ثابت کریں۔ اور دنیا کو عدل، امن، خوشحالی اور مادی ترقی کے ساتھ روحانی عظمت کا سبق دیں۔

۹ :- اقبال نے اپنے شاعرانہ مقام کے بارے میں ہمیشہ عجز و انکساری کا اظہار کیا ہے۔ ان کے نزدیک ان کا اصل منصب فن کی داد طلب کرنا نہیں، بلکہ انسان کو حیاتِ ابدی کے راز سے آشنا کرنا ہے۔ اس کے باوجود یہ سمجھنا یا کہنا جہالت کے مترادف ہوگا کہ اقبال فن شاعری سے بے بہرہ تھے، اقبال نے نہ صرف شاعری کا ذوق پایا تھا، بلکہ سید میر حسن جیسے جید اور مستند استادِ ادب سے کسب فیض بھی کیا تھا جگت استاد نواب مرزا داغ سے اصلاح لی تھی اور لاہور کی ثقہ علمی و ادبی محفلوں میں شرکت کی تھی۔ ان سب چیزوں نے مل کر انہیں آہستہ آہستہ شاعر مشرق کے مرتبے تک پہنچا دیا۔ آپ کے ہمعصر مشاہیر علم و ادب نے آپ کی شاعرانہ حیثیت کو تسلیم کیا۔ اقبال نے شاعری کو فکر و تخیل کا جو بیش قرار سرمایہ فراہم کیا ہے۔ اس کی مثال تاریخ ادب میں تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اقبال نے شاعری کو نئے مضامین، نئے تخیلات اور نئے اسالیب سے روشناس کرایا، نئے الفاظ و تراکیب اور اصطلاحات کو رواج دیا۔ پرانی اصطلاحات کو نئے معانی عطا کئے۔ اور علامات و رموز کے مفاہیم کو جدت و وسعت بخشی۔ اس اعتبار سے اقبال کی شاعری ایک معجزۂ فن سے کسی طرح کم نظر نہیں آتی۔

۱۰ :- جب میں فنی حسن کے قدر دان کی حیثیت سے اقبال کا مطالعہ کرتا ہوں تو ان کی شاعرانہ عظمت کا سکہ دل پر ثبت ہو جاتا ہے اور جب ملی نقطۂ نظر سے اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو اس کی مفکرانہ حیثیت مجھے اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ اقبال بیک وقت ایک عظیم شاعر اور عظیم فلسفی ہے۔

۱۱ :- عصر حاضر میں۔ ایک طرف مادہ پرستی کے غلبہ نے نہ صرف انسان کو روحانی اور اخلاقی طور پر قلاش بنا دیا ہے بلکہ اسے مستقبل سے بھی مایوس کر دیا ہے۔ دوسری طرف مشرقی اقوام خصوصاً مسلمان مغربی اقوام کی سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ ان کی تہذیب کی خیرہ کن چمک سے بہت مرعوب ہیں فلسفہ اقبال کی خوبی یہ ہے کہ اس نے روحانی اور اخلاقی اقدار پر انسان کے یقین کو از سر نو مستحکم کیا ہے۔ اور مستقبل کی امید کا چراغ دلوں میں روشن کیا ہے۔ اس کے ساتھ اس نے اسلامی حقائق پر تخلیقی انداز میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے ان جہتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جن کو پیش نظر رکھے بغیر مسلمانان عالم عصر حاضر کے علمی و تہذیبی تقاضوں کی تکمیل نہیں کر سکتے۔

نالۂ پابندِ نَے

حفیظ ہوشیار پوری

"عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں" (زبورِ عجم)

سُنائیں کیا کسی کو قصۂ دردِ نہاں اپنا
نہ کوئی ہم زباں اپنا نہ کوئی رازداں اپنا

وہی ہم ہیں، وہی دیرینہ ماتم بدنصیبی کا
نہ رفتارِ زماں اپنی، نہ دَورِ آسماں اپنا

ابھی کچھ داد باقی تھی ہماری سخت جانی کی
ابھی منظور تھا قدرت کو شاید امتحاں اپنا

"مقدر" کو "تدبر" سے کیا تھا سرنگوں جس نے
نظر آتا نہیں ہم کو وہ "میرِ کارواں" اپنا

کدھر کو جائیں اہلِ کارواں "بانگِ درا" گم ہے
درا کا ذکر کیا اس کارواں کا رہنما گم ہے

ہُوا ہے قوم کے اقبال کا لبریز پیمانہ
گیا وہ ساقیٔ بزمِ خودی، ویراں ہے میخانہ

جو قندیلِ نوا سے راہِ مستقبل دکھاتا تھا
جو رو رو کر سناتا تھا غمِ ماضی کا افسانہ

غلاموں کو کیا "ذوقِ یقیں" سے آشنا جس نے
گداؤں کو بتائی جس نے راہ و رسمِ شاہانہ!

"یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم"!!
زمانے کو دیا جس نے یہ پیغامِ حکیمانہ!

رُلائے گا ہمیں اقبال کا عزمِ سفر برسوں
نہ ہوگی اس شبِ تاریکِ ہجراں کی سحر برسوں

بظاہر خاک میں پوشیدہ اہلِ دل بھی ہوتے ہیں
زمین پیوند دنیا میں مہ کامل بھی ہوتے ہیں

یہ گردابِ فنا ساحل ہے عمرِ جاودانی کا!
کبھی گرداب کی تہہ میں نہاں ساحل بھی ہوتے ہیں

یہ دنیا رہ گزر ہے اور غبارِ راہ ہیں انساں — غبارِ راہ اکثر واصلِ منزل بھی ہوتے ہیں!
تلاشِ ناقۂ لیلیٰ میں رہتے ہیں جو سرگرداں — وہ اک دن روشناسِ پردۂ محمل بھی ہوتے ہیں
"برون از گنبدِ در بستہ پیدا کردۂ راہے — کہ از اندیشہ برتر مے پرد آہِ سحرگاہے"

یہ ممکن ہے رگِ گلبرگ تر سے ہو شرر پیدا — نہیں ممکن کوئی اقبال سا ہو پھر بشر پیدا
حیاتِ آوارۂ دیر و حرم رہتی ہے صدیوں تک — تو بزمِ عشق سے ہوتا ہے اک صاحب نظر پیدا
کئی پرویز دارِ عیش و عشرت سے کے مرتے ہیں — تو ہوتا ہے کہیں فرہاد سا خونیں جگر پیدا
"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"
نہ جانے کتنی مدت آفتاب اس غم میں جلتا ہے — تو سنگِ تیرہ لعلِ بے بہا بن کر نکلتا ہے!!

دیارِ شوق سے یارب کوئی معنی طراز آئے — بآہنگِ حجازی پھر صدائے دلنواز آئے
فلک نے مشعلِ خورشید سے کر جس کو ڈھونڈا تھا — کہیں سے وہ امینِ دولتِ سوز و گداز آئے
فقیرِ رہ نشیں کو جو غرورِ خسروی بخشے! — خمستانِ خودی سے وہ شرابِ خانہ ساز آئے
"سرودِ رفتہ" کی پھر آرزو ہے کوششِ معنی کو — کسی وادی سے پھر اقبال سا دانائے راز آئے

ترا قسمت شناس اے گلشنِ ایجاد پیدا ہو
کوئی نوحہ گرِ غرناطہ و بغداد پیدا ہو!!

آفتاب اقبال اپنے بچوں کے ہمراہ
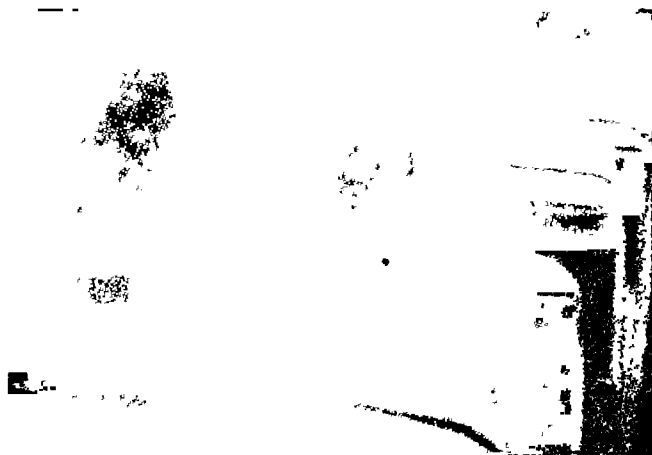
Mrs Brenda Yasin and
Editor Marghzar
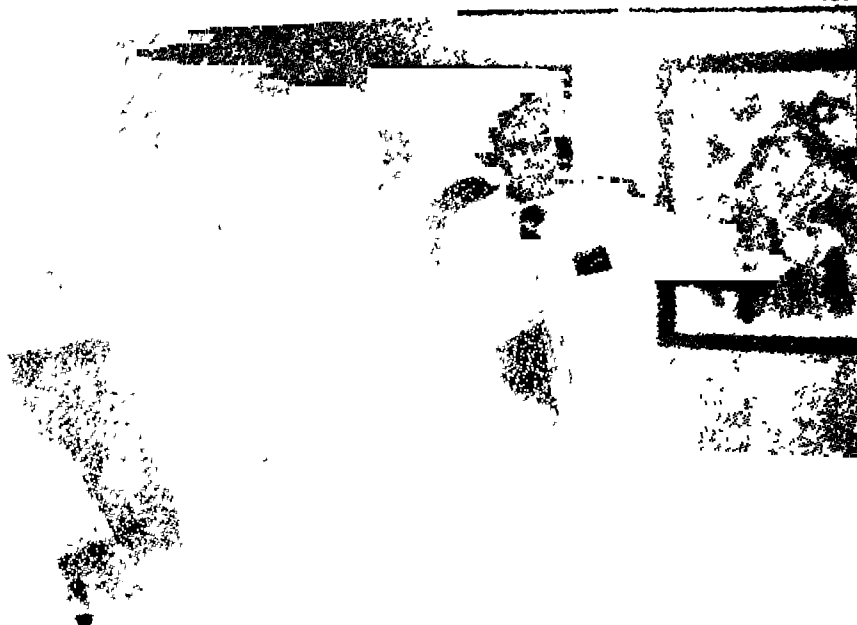
Dr Jan Marek, Dr Bausani, Dr Agafarov Dr A S Sukhochov
and Editor Marghzar (Right to Left)

ڈاکٹر محمد سعید جمال الدین اور مدیر مرغزار

★

ڈاکٹر حسین مجیب المصری اور مدیر مرغزار

Prof. Syed Abdul Hai and

Editor Marghzar

Dr Wojciech Skalmowski

and Editor Marghzar

* * *

Prof Dr Sheila Mc Donough

and Editor Marghzar

Prof Dr Alessandro Bausani and

Editor Marghzar

پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور مدیر مرغزار

★

پروفیسر آل احمد سرور اور مدیر مرغزار

I have seen its mountains trembling and quaking ;
It is packing up to quit the station of Azar,
At last to forswear for ever idolatry.
Happy is the people whose soul has fluttered,
That has created itself anew out of its own clay.
For the throne-angels that hour is the dawn of festival
When the eyes of a nation at last awake ".

8. I think to achieve social democracy and guidance from God. Anyone, who is a Muslim needs the guidance of God.

9. He was a powerful poet as it is shown by his world wide influence He is one of the greatest poets of this age. He is equally popular in East as well as West

10. His philosophy and his poetry are one, we cannot separate them.

11. His ability to bring religion into life

★
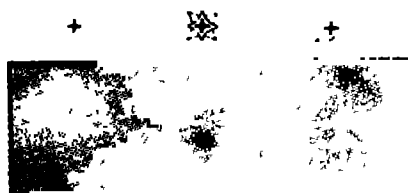
جاوید اقبال
اور
منیرہ بانو
کے
جرمن آیا

★

buildings and she was so much impressed that she composed some very beautiful lines on these buildings and one of the same was read out by her at the concluding session of this Congress. On the last day, we were on our way to Sialkot to see the birth place of Allama Iqbal Fortunately, I again found a seat near her and so this interview was taken during the journey by bus. I am grateful that she gave both the poems in original as a token of her generosity

1 Iqbal extols the dignity of human being by his philosophy of Divine light in every man.

2 Javen Nama, for the same reason cited above.

3 (a) Iqbal, His Art and Thought by S.A. Wahid.

(b) A Message From the East by Hadi Hussain.

(c) The Tulip of Sinai by A S Arberry

4 I have delivered lectures comparing Iqbal with my national poet W B Yeats and also George Russell and James Stephen

5. I hope that pure teachings of Islam and Iqbal have a future

6. His concept of " The Self of the Self". His philosophy solved the problems of mankind

7 I like these lines from Javed Nama.

" He said, it is the hour of the East's arising;

The East has a new sun shining in its breast.

Rubies come forth from the stones of the road,

Its Josephs are issuing out of the well.

I have seen a resurrection happening in its bloom,

5 I think it will continue in the Muslim world and his message will lead to Muslim unity. He was not a man of extreme but he was a man of moderate views.

6. His extra ordinary diversity. The manhood in his life is credible.

7. Many a night I wept for Man's sake. That
I might tear the veil from life's mysteries,
And extract the secret of Life's constitution
From the laboratory of phenomena.

(The Secret of the Self)

8. He thought to live with God and with religious conventions to develop our humanity. This was the basis for Pakistan.

9. He is one of the greatest poets of this century He will be more popular in future.

10. I love him as a poet philosopher but I cannot separate his poetry from philosophy.

II. His Humanism and views about mankind because I am also a humanist. His view of humanity is very beautiful I hate to be negative and he is most positive.

❋ ❋ ❋

XX. MRS. BRENDA YASIN (IRELAND)

Mrs. Brenda Yasin, who has embraced Islam and now called as Mrs. Said Yasin, is a great poetess. Luckily, I was with her while she was visiting Jahangir's Tomb and the Shalimar Gardens. I was explaining the historical aspects of these

9. Iqbal is a simple writer because he is people's poet. He did not write any poetry but with meaning and content.

10. We cannot separate Iqbal's philosophy from his poetry and religion from his works. All these make Iqbal and we have to look at him as a whole.

11. Iqbal stressess on the importance of material and natural world for social and scientific development. In other worlds Iqbal's philosophy is a practical philosophy.

* * *

XIX. DR. MURIEL LATHAM PFEIFER

Born in U.S.A. Did her B.Sc. from Columbia University and M.A. from Eastern New Mexico University Ph D from the University of New Mexico Did her Post Graduation from the University of London. Now, She is Dean of Humanities, University of Albuquerque, New Mexico

Her generosity gave a chance for this interview just after breakfast, without any prior preparation, while sitting beside a grassy plot at the Hotel Intercontinental.

2 'The Secret of the Self" by Nicholson, because it has universal value to speak to all mankind. It was written in the early days of Iqbal's poetry.

3. (i) Iqbal Poet Philosopher of Pakistan" by Hafiz Malik.

(ii) 'Introduction to Iqbal' by S. A. Wahid. This book for beginners.

4. I am comparing him with Walt Whitman an American Scholar in my book "East and West Meet".

3 (i) Gabriel's Wing by Dr Annemarie Schimmel.

(ii) (اقبال اور اس کا عہد) by Jagan Nath Azad

4 (a) " Iqbal's social outlook "

(b) " Iqbal's relevance to the present world ".

(c) " Individual and society in Iqbal's thinking "

(d) " Iqbal as a Muslim revolutionary poet ".

(e) " Iqbal against imperialism and colonialism ".

5. As I said in the beginning, Iqbal stresses the value and creativity of human self or personality and opposes any social discrimination These two ideas are the basis of democratic and just society where every individual must have a chance of developing his or her creative personality This chance includes economical and educational facilities which Iqbal recorded most essential for human development

6. Iqbal read a lot but used it in the way of his own thinking, so one can not say that he was really a follower of any writer or philosopher He admired Rumi because Rumi had the same concept of man as Iqbal did We can say that he was influenced by the positive and progressive ideas of Rumi. The idea of individual or 'self' is to build such a society where materialistic conflicts may not occur

7 فرد را ربط جماعت رحمت است

جوہرِ وے را کمال از ملت است (اسرار و رموز)

8. Iqbal wanted to destroy the idea of Indian Nationalism and he also wanted to get rid of British imperialism. Iqbal wanted to save this wrecked mass from this exploitation and humiliation by giving them the sense of place and personality.

8. I want to remain silent on the topic.

9. I think Iqbal is one of the greatest poets of this century No history of literature can be completed without mentioning his name.

10. First of all I like him as a poet and then in other capacities like philosopher, and politician.

11 I am not a student of philosophy.

⁂ ⁂ ⁂

XVIII. DR. GHULAM RAZA SABRI - TABRIZI

Born in 1932. Educated at Tabriz University (B.A., Diploma Education) and University of Edinburgh (Ph. D). Started his teaching career in 1958 as a school teacher. Served as Assistant Lecturer at University of Istanbul, 1960-61. Presently, Lecturer in Persian in the University of Edinburgh. Trustee of Iqbal Academy in U.K.

1. Iqbal's main message is that the human beings from the beginning had got a creative quality or " Self " this creative quality of personality should be developed in favourable social conditions but such a valuable creative personality has become passive by the negative and abstract teachings of "Mullas " and the economic hardships in the society which were caused by the exploitation of man by man. He belived that Islam stressed on the importance and value of man and regarded him as a successor of God on the earth. By understanding and realizing this power with one self, himan being can assert his ability to control his destiny

2. Basically, I am the teacher of Persian Literature and I like all Persian poetry of Iqbal. But Asrar-o-Rumuz is best due to his philosophical outlook.

No. 212. Dr A. Gafarov was also present there to show his co-operation in this respect. They often exchanged their ideas and views in their mother tongue before giving any particular answer to my questions. I am thankful to Prof. Rafi-ud-Din Hashmi in this connection.

1. Iqbal's humanistic approach and his attempt to awaken the people and to uplift the suppressed people.

2. I am not a specialist on Iqbal but his " Bang-e-Dara " is best as he has conveyed his true message through these poems.

3. (a) Poetry of Muhammad Iqbal by arine, N. E.
   (b) Iqbal by Dr. A. Gafrov.
   (c) " اقبال شناسی " by Ali Sardar Jaffary.

4 I have written only two articles on Iqbal i.e.
   - Iqbal's Thought on Education,
   - Muhammad Iqbal in the eyes of Hindustani and Pakistani writers.

5. We mostly appreciate Iqbal as a great poet but little as a thinker.

6. I think he was a very simple and honest man. It was easy to approach him or meet him. He was living with the common people.

7. تو شب آفریدی، چراغ آفریدم سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار، باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم (محاورہ مابین خدا و انسان، پیام مشرق)

6. His intense love for truth that is Islam,

7

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

نشان مرد مومن با تو گویم چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

8. Iqbal wanted a separate homeland for Muslims, where Islamic ideology could be practised and interpreted. It would be a state where the rulers are practically the servants of the people (سید القوم خادمھم).

9. I am not expert but as a layman I can say that he is one of the poets of first rank both in Urdu and Persian.

10. I love him as a philosopher first then a poet and most of all as a lover of Islam.

11. I think that the answer to this question has been given in the answer to the first question.

❋ ❋ ❋

XVII. DR. A. S. SUKHOCHOV (U.S.S.R.)

Head of the Section of Literature ; South Asia Literature : Institute of Oriental Studies ; Academy of Science, Armyansky Lane, Mascow, U.S.S.R.

I requested for this interview to Dr. A. S. Sukhochov at the exhibition of paintings, sculpture and graphics arranged in connection with the centernary of Allama Muhammad Iqbal held at Lahore Museum on 3rd of December, 1977. I presented my questionaire and he very graciously accepted my request. So, it was completed at the Hotel Inter-Continental in his room

at this University. Author of 10 books on Philosophy, including " Iqbal ", His Contribution " and "Muslim Renaissance and Iqbal". Has written a large number of research articles on philosophy and psychology published in reputed journals of Dacca and Culcutta

I took this interview in two sittings in the very Hall of Iqbal Congress in the intervals of the academic session.

1. The main point of Iqbal's message is to speak in modern terminoloy about his activism or dynamism Iqbal is the exponent of Islam and has seen it in his universal aspect, both from the view point of space and time. In my speech in congress entitled, Iqbal and his message", I have described Iqbal's philosophy in a very simple formula, "work while you live and smile while you talk".

2. Asrar - i - Khudi and Reconstruction of Religious Thought in Islam Asrar-i-Khudi gives the activistic and dynamic philosophy, which only can give the human beings their proper position in this universe. The cause for my liking of " Reconstruction " is the same. He has shown the same truth in this book from different philosophical angles.

3. It is very difficult to say because I usually do not like commentaries.

4. (i) Iqbal, his contributions.

(ii) Muslim Renaissance and Iqbal.

5. Iqbal's philosophy is sure to attract people and it has been evident from this centenary congress. We can hope that within a few years Iqbal's message will reach every corner of the of the world.

as a polymath of his time but very few people were aware of his genius and message.

7 I like most his poems but these lines above all :

ساحل افتادہ گفت: گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم گر نروم نیستم! (زندگی و عمل۔ پیام مشرق)

8. I would like to be silent on the topic

9. Iqbal was avery imaginative man but unlike other poets of the Eastern countries, he has seen and imagined new contents and set ancient patterns to the poetry of Sub-continent. Iqbal like other poets of " Sabak-e-Hindi " (سبک ہندی) sought novelty in term of literary decorative devices, but he also sought problems of the people, spiritual and material. He greatly emphasised on human talents.

10. I love Iqbal because he revealed deep philosophical ideas in a very sweet and tender language of poetry

11 His philosophy of Self awareness

❖ ❖ ❖

XVI PROF. SAIYED ABDUL HAI (BANGLADESH)

Born 1919, Tetulia, Khulna. Bangladesh. Obtained B.A. (Hons) in Philosophy. Culcutta University, 1939. M.A. in Philosophy from University of Dacca 1941. Served as Lecturer, Saadat College, Karatia, Government College Chittagong, 1943-44, Government College Dacca 1959-61. Joined University of Dacca in 1961. Presently Chairman. Department of Philosophy

1. Instead of the revolutionary Muslim, he has given the message of unity and having their own identity to the Muslims of India. He also tried to make man understand that the life is dynamic. The oppressed people should known their dignity and they should not worship imperialism but one God

2. My favourite books are "Payam-i-Mashriq" پیام مشرق his Musafir (مثنوی مسافر) as well as his Asrar-o-Rumuz (اسرار و رموز). In "Payam-i-Mashriq aside from the context, the Ruba.iyyats in it are songs of folk type, for this it is very popular in Afghanistan. Moreover, in " Payam-i-Mashriq " he criticises the western philosophy in a very skilful way. In "Asrar-o-Rumuz" the main point for man is to know himself.

3. "Iqbal His Life and His Works" written in Dari by Abdul Hadi Dawai, who was a friend of Iqbal.

4. I have written some articles on Iqbal in Dari and Pashto published in the Afghan Press. Now, I have started writing a book entitled "Jawab Musafir" (جواب مسافر) in which I have made an attempt to comment on what he had said in the " Musafir " in poetry. The preface of this book is being read in this congress at Lahore.

5. Iqbal's thought could be divided into two compartments. The first are very highly humanistic thoughts that would be everlasting and always meaningful and distinct for humanity like his philosophy of " Selfhood " and the respect for man and so on these things will always be lessons for the generation of the future. The second part is of his political ideas that partly has served its purpose and the rest might be relevant or irrelevant according to situation in the future.

6 His awareness of himself as a genius of his time was realised a little bit later. He felt lonely and thought of himself

5. The fundamental principles on which Allama based his philosophy are in accordance with the teaching of our prophet Muhammad (Peace be upon him). In certain matters of inter-pretation, Iqbal's views are controversial but one has only to read him to see how very clearly he understood how the world was developing in the 20th century

6. I think that the first and foremost I admire his combination of Zikro-Fikir (ذکروفکر) and his passionate devotion to the prophet and the cause of Islam.

7. There are many verses that I love but I should prefer to quote one sentence in prose, "Nations are bron in the hearts of poets, they prosper and die in the hands of politicians" (stray reflections).

8. His ideology of Pakistan is simply Islam. Islam is the only reason why Pakistan exists.

9. He is one of the very greatest of all the poet philosophers of the world.

10. Above all he is a human being.

11. His conviction that the world can only be made a better place if its inhabitants can be induced to purify and to discover their own innerself.

❋ ❋ ❋

XV. PROF MUHAMMAD RAHIM ELHAM

o Faculty of letters and Humanities,

o Head of the Department of Dari & Pashto.

o University of Kabul, Afghanistan.

9. He is one of the greatest poets of the East.

10 He is both a great poet and philosopher

11. The aspect of " Selfhood "

XIV. MR MUHAMMAD ISA WALEY

Mr. Muhammad Isa Waley has embraced Islam recently. He is Assistant Keeper in the British Museum and Library, London. He wears a beard and looks like the Arabs. I was keen to meet him for interview and I got a chance after a session in the lecture hall He was kind enough to give this interview with out any prior and proper notice

1 Tuheed (توحید) and Islam

2. I have special feelings for Armghar i-Hijaz (ارمغان حجاز) because in this Allama displays the " شوق " of the young man and the " Hikmat " (حکمت) of the old wise man

3 As a Librarian I have come across so many admirable books on Allama Iqbal but I feel incompetent to pass judgement as to which is the best, however, as an appreciation of Iqbal's poetry for the non-specia ..t, I would humbly recommend Syed Abu-ul-Hasan Ali Nadvi's book (روائع اقبال) in English, "Geory of Iqbal "

4 Together with a colleague in the British Library, I have written a short book on the works of Muhammad Iqbal, which is intended partly as a guide to the exhibition that we are holding in London from January to March, 1978 ' Insha-Allah ' I have also written a short paper on Allama's advice to the young generation and its implications for the present situation in Pakistan and the Muslim world in general.

Text Committee. Has published articles on Iqbal and Quaid-e-Azam. Has been awarded his country's Gold Medal for Literature, Social Sciences and Arts. Presently, he is a Civil Judge in Sudan.

The International Iqbal Congress was over but Mr. Mubarak Maghrabi was also invited to the Fourth all Pakistan Jurists' Conference held at WAPDA Auditorium on 9th December, 1977 He read out a very beautiful poem in praise of Iqbal in Arabic there I requested for this interview and it was completed in his room No. 431 in the Hotel

1 We consider Iqbal as a distinguished poet of Islam. He has described the glorious ideas of Islam and he wants to convey all this to the present generations

2 " The Secret of the Self " by Nicholson.

3 The works of Dr Abdul Wahhab Azzam and of Shaik Sawi Shallan on Iqbal

4 Some odds on Iqbal in Arabic I want to write a book entitled " In the Home of Iqbal "

5. Iqbal really has built a new generation and Islamic culture. Iqbal and Mehdi Sudani both wished to unite Muslim world The future of Iqbal's thinking is really bright.

6 (a) His faith of Islam,

(b) His abomination to colonialism,

(c) His firm idea to make a country on Islamic foundation

7. Some chapters of the " Secret of the Self ".

8. To make an Islamic state. He was also an admirer of Quaid-e-Azam.

(ii) Iqbal's ideas on the true nature of poetry.

5. It is difficult to say but he will have more impact than today. Iqbal has criticized the European civilization and told that Europe is now fed up with Materialism. Iqbal has given traditional imagery in his poetry.

6. On one hand his fusion between Western and Eastern intellect and on the other hand the Re-evaluation of superman (مردِ کامل).

7 (a) " روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے "

(b) " ہمالیہ "

(c) " حضرتِ انسان "

8. There is contradiction in him in this aspect that being the political leader of a limited area, he does not like geographical boundaries.

9. Really high, having great mastery over poetry. New context of traditional imagery.

10. His philosophy should not be separated from his poetry.

11. Philosophy of Qalandar (قلندر) and Mard-e-Kamil (مردِ کامل).

XIII. MUBARAK MAGHRABI (SUDAN)

Born 1924. A well known Arabic poet. Author of ten books in the field of poetry, literature and social sciences. Holds important offices in his country's cultural and other organizations. Chairman of the Sudan Broadcast and Television Poetic

9. His poetry stands as a mile stone in the cultural history of mankind and his poetry will continue to inspire all the forthcoming generations for all the times

10. I like Iqbal as a poet for the inspiration, he provides to the people. I like Iqbal as a philosopher for the insight, he provides to man and society

11. His social philosophy that provides insight into man and society.

* * *

XII PROFFSSOR DR J C BURGEL

Born 1931, Silesia (Now Finland). Received education at Frankfurt am Main University. During 1954-60 he studied Arabic at Frankfurt, Ankara, Bonn and Gottingen. Obtained Ph. D. in 1960. Studied medicine for one year. Served as Assistant in the Department of Arabic Studies at Gottingen from 1960-70. Besides Polish, he knows English, French, Persian, Turkish and Arabic.

I requsted for the interview while we were coming back from the Faisal Auditorium after the inaugural session of International Congress on Allama Muhammad Iqbal, Friday, December 2, 1977. This interview was completed in his room No. 425 at the Hotel Inter-Continental late at night.

1. Union between reason and love.

2. Most people love " Javed Nama " but I like " Bang-e-Dara " (بانگِ درا) due to natural poems.

3 Gabriel's Wing by Dr. Annemarie Schimmel

4. (i) Anthology of Urdu poems (120 poems).

THE MARGHZAR

I requested Professor Karunaratne for this interview wher we met together at the dinner given by Mian Salah-ud-Din (Sor in law of Allama Iqbal) at Gulburg, Lahore. There was a cultural programme after the dinner and he was enchanted by the poems of Iqbal sung by the great musician Asad Amanat Al Khan. The other day I took this interview in the exhibitior of Iqbal's works at the Hotel Inter-Continental.

1. In my view he is the Philosopher of common people His message is to destroy the old and build it on new foundations He emphasises to keep abreast of the times. Live dangerously and the philosophy of self determination was the message of Iqbal to the people of India.

2. " Message to the East " (پیامِ مشرق) because it conforms with the spirit of the people of the East

3. I like the book written by the French scholar Luce-Claude Maitre entitled, " Introduction to the Thought of Iqbal ".

4. The social Philosophy of Iqbal.

5. It is bound to have wider and more universal impact on the emergent nations of the world.

6. His social consciousness and his concern for the down trodden people of the world has appealed to me most.

7.

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند؟

(خضرِ راہ، بانگِ درا)

8. Social and political philosophy of Islam.

because you know Iqbal interprets the essence of Islam and this fact is as luminous as the sun.

6. Seriousness and his faith in Islam. He is not prejudiced.

7. His dialouge with Syed Ali Hamdani about اجبر واختیار in Javed Nama.

8. I think Iqbal infused his own feelings and faithfulness about Islam in very Pakistani. So, the ideology of Pakistan is nothing except Islam.

9. He is in the same degree as Shakespeare, Dante and Goethe because every one has built a nation of country and the big poet is that who can build and not destroy.

10. I love Iqbal as a poet rather than as a philosopher. He has given the lesson of struggle.

11. Relation between God and Man. He says that there is mutual relation between them

XI. DR. W S KARUNARATNE

Born 1928, Katugastota, Sri Lanka. Received early education at Ananda College, Colombo and did B.A. Hons. from the University of Ceylon. Obtained his Doctorate from the University of London in 1956. Appointed professor of Buddhist Philosophy at the University of Ceylon, Peradeniya in 1964 and now Dean, Faculty of Arts, Vidyalankara Campus. Member Board of Governors, University of Sri Lanka. Member, Ceylon Academy of Letters 1956-60. Has written several articles on various aspects of Buddhism.

THE MARGHZAR

X. DR. MUHAMMAD SAYEED JAMALUDDIN

Born in Egypt and got his post graduation there. Now Professor, Faculty of Literature, Jamia Ain Al Shams, Cairo Translated "Javed Nama" in Arabic prose entitled,

"رسالة الخلود او جاويد نامه"

I made request for this interview at the Shalimar Gardens, Lahore and took this interview in his room No. 406 at the Hotel Inter-Continental late at night and I returned when the throbbing town of Lahore was plunged in silence.

1 I think that the main point of Iqbal's message is that he says to all the world that Islam is the complete code of life and Islam offers to man to become. "The Vicegerent of Allah on earth" (خليفة الله فى الارض)

2 "Javed Nama", because it has all the opinions and ideas which Iqbal wanted to learn and teach us.

3 My favourite books are

(i) Rowia-e-Iqbal (روائع اقبال)

(ii) Shara Javed Nama by Prof Yousaf Chishti.

(iii) The Secret of the Self by Nicholson

4. I have translated Javed Nama in Arabic prose because I have seen that prose is better than verse to present the thought of Iqbal to the Arab world. The poems of Iqbal are very concentrated and the Arab poetry prefers brevity (ايجاز). If we translate the poems of Iqbal in Arabic verse than we cannot concentrate

5. I think that the thinking and teachings of Iqbal will spread not only into the Muslim world but all over the world

5 I believe that Iqbal will continue to inspire the coming generations. He will be more and more understood in future.

6. This is the strong character of independence and freedom. I believe that the huge majority of Muslims in India were never dominated because when there is a rebellion of soul and intellect, there is never domination. The history of sub-continent shows that the mass majority of the Muslims never accepted the foreign domination spiritually and behaviouristically. There were always continual rebellions and opposition against the foreign domination. Iqbal represented and reflected this freedom of spirit and the cause of independence of Muslims in India.

7. (Pas cheh Baid Kard Aye Aqwam-i-Sharq).

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق

8. A state in which Islamic ideals will be realised and true and real society will be created. Thus Pakistan will be an example of an Islamic state based on social Justice and higher ethical values.

9 This is a question of literary criticism and I have little command on it.

10. Neither as a poet nor as a philosopher but as a fore-runner and a great leader who showed the path of independence and creation of Pakistan to Indian Muslims. As such my preference for Iqbal and his personality is as a political leader.

11. As a true Muslim, he always defended Islamic thinking and developed Islamic thought and analysis to the level of contemporary philosophy.

❋ ❋ ❋

9. I put him very high. He is the national poet. He may influence even Europe in future.

10. We can not separate these things.

11. I think his notion of " Khudhi " or Identity. Self-hood has a negative meaning as used by William Blake.

IX. PROF. DR. NEVZAT VALCINTAS

Born 1933, Ankara, Turkey Studied at the School of Higher Economics and Commercial Studies, Istanbul and University De Caen, Faculte de Droit et des Sciences Economiques, France. Has held several important posts. Head of Social Planning Department at the State Planning Organization, Ankara, 1967-71 ; visiting professor London School of Economics and Political Science, 1962-63 and General Director, Turkish Radio and Television, 1975. Has published on subjects of Economics, Society policy, Industrial relations and Migrant workers.

1. Iqbal by his guidance delivered the Muslim World from miserable conditions. Although he studied in the most powerful and richest countries of the world yet his belief in Islam and in the future of the Muslim world remained unshaken

2. Reconstruction of Religious thought in Islam, because in this book Iqbal has given a comprehensive view of his thinking and his philosophy.

3. (a) A study in Iqbal's philosophy by Bashir Ahmad Dar.

   (b) Gabriel's Wing by Dr. Annemarie Schimmel.

4. " Social aspects of Iqbal's Thought ". This work has already been published in Turkish but this will be published in English this year.

VIII. DR. WOJCIECH SKALMOWSKI

Born 1933, Poznan, Poland. Studied oriental studies at the Jagellon University of Krakow, Poland, 1951-56. Was the post graduate student in the Iranian languages at the Humboldt Universitat, Berlin (DDR) from where he obtained his Dr. Phil. Degree. Served as Assistant Professor in Karkow, Poland, 196 -68 Did his post Doctoral studies at the University of Tehran 1968-69. Was a visiting lecturer at the institute of Middle Eastern Studies, Haward University, 1969-70. Since 1970 has been the Professor of Iranian languages, Katholicke Universiteit te Leuven, Belgium. Fellow of the institute of Applied Linguisstics at the K. V. Leuven, Belgium Has 50 publications on Iranian languages and general linguisitics.

1 His struggle and activity for the mankind is important.

2. 'Armghan-i-Hijaz' (ارمغان حجاز) because it is the essence of his philosophy. It is in short metre

3. Gabriel's Wing by Dr Annemarie Schimmel.

4. I have written some essays, some of them have been published such as " Imagery of Iqbal ".

5. I suppose it will grow in importance. His thinking is modern.

6. Eor me it is an extraordinary effort. He has the capability to workhard He used three languages to express his ideas and emotions

7. English translation of Masjid-e-Qartaba (مسجد قرطبہ) some parts of " Javeed Nama ", and translation of some quatrians of Armghan-i-Hijaz.

8. Well, a country of Islamic traditions and sound political and economic development

3 "The Secret of the Self" translated by Reynold A. Nicholson

4 (a) Critical analysis of Iqbal's Reconstruction.

(b) Some reflections on the philosophical aspect of Iqbal.

5. I think that the danger of mis-interpretation of Reconstruction of Religious thouht in Islam is very clear. The future of Iqbal's thinking is brighter even if Iqbal has erred in some of his "lectures" even then he is great. In general, his role for muslims is great.

6. In fact, I am not a student of Iqbal, but I love his "higher Tassawaf".

7. I love his philosophy more than his poetry.

8. Of course an Islamic state based on Islamic principles.

9 In my opinion he ranks among great poets of the world.

10. As a poet thinker

11. In the first place he is correct in emphasizing the paramount importance of the "Self". He has also pointed the right direction for Muslims by emphasizing knowledge, I want to say that only Iqbal has pointed out the paramount role of the individual self and his relation to knowledge instead of laying emphasis on the state and society.

10. You see, he is a Poet Philosopher, if you love him as a poet then you should love his philosophy too.

11. I think his moral and religious aspect.

* * *

VII. PROF. DR. SYED MUHAMMAD AL-NAQUIB AL-ATTAS

Born 1931, Java Indonesia, Graduated from the Royal Military Academy, Sandhurst, England and received King's commission in 1955. Voluntarily resigned from Army to take up studies at the University of Malaya. Obtained M. A. from McGill University in 1962 and Ph. D. from London University in 1965. The same year he was appointed Head of the Division o, Malaya. Served as Dean, Faculty of Arts, University of Malaya from 1968 to 1970. His academic interest is in the field of Philosophy. History and Literature. Has delivered more than 200 public lectures on Islam in Malaysia, Indonesia England, America and Russia. Was made the Fellow of the Imperial Iranian Academy of Philosophy for outstanding contribution in the field of comparative philosophy. Author of 14 books on Islam and numerous articles.

On 6th December, 1977, I got a chance at the time of breakfast to request for this interview and he graciously accepted it. This interview took place in his room No. 422.

1. It is fo, the Muslims to be strong and to awaken the slumbering world at this time of crisis.

2. In fact, all his works but especially, " Reconstruction of Religious Thought in Islam " because Iqbal calls for higher sufism in the world and criticizes the same.

time and speaking today " in the form of sonnets in the Congress Hall. After this I requested for a brief int :rview and a time was fixed and when I reached his room No. 429 he was ready for this interview.

1. To me his idea that God is continuing to reshape our world but many people do not do o. It is sublime optimism. He is trying to build up his personality.

2. I always liked " Javed Nama " I think that the idea of joining Rumi in this book has greater sublimity than the Divine Comedy. I am much inspired by this ·ook.

· 3. " Introduction to the thought of Iqbal ", written by Maitre, Luce Claude (French) and translated by Mulla Abdul Majeed Dar in English.

4. Generally, I have translated his poems but I have also written a book entitled, " Iqbal the poet who created Pakistan " and some special Iqbal Issues of my quarterly magazine, " We and World Literature, in which I have translated " Javed Nama, and some of his Persian lyrics.

5. I think it is very great and it depends on the way the world is informed.

6. As a poet he is more important. I have very little knowledge about his personal character.

7. Javed Nama.

8. A society that is constructed in such a way that human personality may grow.

9. He is one of the greatest poets of this century but it is needed that Iqbal should be introduced in the world especially in Europe.

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

(محاورہ مابین خدا و انسان، پیام مشرق)

8 A land for pure Muslim community and two nation theory is the basis of Pakistan, because the Muslims are a different community from other communites.

9 I am not in a position mainly for the reason that it is not my field of study but I am fascinated by the recitation of his poems. There is a sense of beauty in his poetry

10. It is hard to draw a line between Iqbal as a poet and a philosopher. Iqbal is like a diamond and his each side is ....?

11. I can only speak in the light of my scanty reading of Iqbal. In fact, there is no new aspect in Iqbal's philosophy. Many Muslim thinkers have told what Iqbal has said. The philosophy of Iqbal is this that man is not subject to changes but he is the agent of God on earth

❋ ❋ ❋

VI. PROFESSOR CARL ELOF SVENNING

Born 1904, Gothenborg, Sweden. He it an author, Literary Critic, Poet, Translator, Publisher and Editor. In co-operation with UNESCO he has published a number of articles on the Islamic, and other oriental cultures, including books on Ibn-e-'Khaldum and Allama Iqbal. He brought out translations of poems of Iqbal in book form and produced special Iqbal issues of his quarterly " We and World Literature ". Present address: Sodra Kungsvagen 216F, 18162 Lidingo 3, Sweden.

Mr. Carl Elof Svenning, who was a distinguished delegate from Sweden, read out his long poem entitled, "Iqbal seeing our

THE MARGHZAR

I was very much impressed by the ideas of Mr. Joel that he expressed in his lecture on Iqbal in this Congress. So, I decided to interview this young scholar and the next day I knocked the door of room No. 436, Hotel Inter-Continental where this Congress was being held. He recived and welcomed me but refused to grant his interview there and then but promised to accept my request at some other convenient time and so this interview was completed in the lounge of this hotel.

1. I think his message is to consolidate and strengthen the Muslim Community. The people of Dar-us-Salam (دارالسلام) do not know Urdu and Persian. They have got certain problems. They want to survive and they do not need poetry.

2. " Reconstruction of Religious Thought in Islam ", because the observation of Iqbal is penetrating in this book.

3. " The Secret of the Self " especially its preface

4. I have written only two essays on the topics given below :

o Iqbal and his concept of Nationalism

oo Iqbal and Jose Rizal.

5. Majority of the Muslims on earth are minorities, these minorities need their identification on cultural basis. Iqbal represents their case beautifully and strongly in his thoughts. So, the future of Iqbal's thinking is bright.

6. First it is Islam, love for people and nature and above all love for God.

7

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم

was absolutely against mysticism because he has applied the terminology of mysticism and admired what we call intuition. In comprehending the Quran, he was most rational and spiritual i.e. he consulted his mind and his heart at the same time.

7. Some Ruba,iyyat in his collection, ارمغان حجاز

8. Iqbal was a preacher of Islam. He wanted Pakistan to come close to the principles of Islam in every field of life.

9. Iqbal confessed frequently that he was not a poet but he followed the example of ancient persian poets who expressed their thoughts in poetry. He said that he had no need of poetry or eloquence because there is enough eloquence in the Holy Quran.

10. I love Iqbal as a whole. I cannot sever his thought from his imagination.

11 I like most his firm belief in " Selfhood ".

V DE LOS SANTOS, MR. R. JOEL JALALUDDIN

Born 1940, Darawi city, the Philippiness. Received his education at Xavier University and the University of Philippines. Was appointed Instructor in History at the University of Philippines in 1970. Has held important offices in various cultural and other organizations of his country. Served as a member of the Philippines Committee for the centenary celebrations of Mohammad Ali Jinnah, 1976. Author of several articles published in various journals. Present address : Institute of Islamic Studies, Philippine centre for advanced studies, University of Philippines, Diliman, Quezon City, the Philippines.

the Persian portion of "Armughan-e-Hijaz" in the Arabic language. He has also written some books and essays on Iqbal's art and thought. I contacted him for interview in his room No. 306 at Hotel Inter-Continental, where this congress was being held and he very graciously accepted my request. The interview terminated late at night but there were no signs of sleep in the eyes of this intellectual.

1. In my opinion the main point of Iqbal's message is the message of Islam. He expounded frankly and candidly the real principles of Islam.

2. It is very hard to give an answer to this question, the reason is that I have translated till now three books of Iqbal from the original Persian into Arabic word ; I cannot prefer any book.

3. "Javed Nama" translated by Anroaions "گلشن راز جدید" especially the comparative study of Iqbal and Shabastari (شبستری).

4. o Iqbal and the Quran (under compilation).

   o Iqbal and Arabic world in Arabic and English.

   o "فی السما" Arabic translation of "Javed Nama" published in Cairo in 1973.

   o "هدیته الحجاز" translation of Persian portion of ارمغان حجاز published at Cairo in 1975.

   o روضته الاسرار

5. The more we read Iqbal the more we love him and the more we have the urge to follow his lead.

6. This aspect that Iqbal is a free thinker in the real sense of the word. He has the courage to be against the Mullas and some Mystics, but it is quitewrong in my opinion that Iqbal

7 یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی !
یقیں اللہ مستی ، خود گزینی !
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار .
غلامی سے بتر ہے بے یقینی ! (رباعیات بالِ جبریل)

8. I have written an article in which I have written that Iqbal has not used the word " ideology ". For him each generation will have to struggle for changes because the process of making the world better never ceases.

9. I am not an expert, for me it is beautiful, even though I can not read Urdu or Persian , but it inspires me.

10. Certainly both as a philosopher and a poet.

11. From the Mysteries of Selflessness.

> I spent myself that there might be More
> light, more loneliness, more joy For other
> men.

I sought time for interview in her room No. 622 Hotel Inter-Continental, Lahore, but completed at the Fourth Pakistan Jurist Conference held at WAPDA Auditorium, Lahore, where she was also invited as a delegate.

❋ ❋ ❋

IV. DR. HUSSAIN MCGUIB EL-MASRY

Dr. Hussain Moguib El-Masry is a scholar in the true sense of the term. He is the Professor of Persian and Turkish Studies in Cairo. He has translated Iqbal's " Javed Nama " and

9 He is very great He ranks among the greatest Poets

10 Both of course

11. Dynamic conception of his creation He had an affinity with Bergson and Rumi. What I like most is that he has given a fresh interpretation of the Quran and he built it himself

III PROF. DR. SHEILA Mc DONOUGH

Concordia University, Montreal, Canada Dr Sheila received her education at Mc Gill University from where she obtained her Ph. D. degree. Served as lecturer, Kinnaird College for Women, Lahore, Pakistan from 1957 to 1960, and as Professor, Selby Oak Colleges, Birmingham, England, 1963-64 Her publications include, Pakistan and West (1960) : " The Authority of the Past (1970) : " Jinnah, Maker of Modern Pakistan (1970) . " Iqbal, Gandhi and Muhammad Ali " (1976) and " Women in the Quran " (1977) At present, she is Professor of Religion. Concordia University, Montreal, Canada

1. I think that it is لاالہ because the poet does not believe in conformation (تقلید) His message begins with " لا " and proceeds towards " الا "

2 " Reconstruction of Religious thought in Islam " because in this he is most serious and systematic

3 " Gabriel's Wing " written by Annemarie Schimmel.

4 You have listened my essay here in this congress entitled " Iqbal, Muhammad Ali and Gandhi "

5. I think he will have more influence on Muslims.

6. He is an intellectual giant

due to her illness and old age, they were deprived of the opportunity.

1 From my personal view Iqbal reconciled Reason and Faith iqbal told the West that there was no conflict between Reason and Faith·

2. Reconstruction of Religious thought in Islam is the first book that influenced me

3. A collection of papers entitled, " Iqbal as a thinker " and " Iqbal his art and thought " by S. A. Waheed.

4. I have translated " Javed Nama ", Reconstruction of religious thought in Islam and " Metaphysics in Persia " all in the French language entitled, " Message De L'Orient " and several essays on Iqbal translated either from Persian or from English

5. Future is just beginning now. The thought of Iqbal is a bridge between East and West. West has begun to discover Islam

6. He was a great thinker but I am influenced by his courage. He fought a political war against the British Regime. His mind does not accept تقلید · He was both very bold and very orthodox

7 خورشید به دامانم، انجم به گریبانم   در من نگری، هیچم، در خود نگری جانم

در شهر و بیابانم در کاخ و شبستانم   من دردم و درمانم، من عیش فراوانم

من تیغ جهان سوزم، من چشمهٔ حیوانم (نوائے وقت پیام مشرق)

8 I am not bound to answer every quest on and it is difficult for me but he knows only one ideology and that is Islam

of this ideology. Pakistan should be the model of this ideology and Islamic culture,but it is not.

9 I think that Iqbal is the greatest Muslim Poet

10. Both as a philosopher and poet, but as a philosopher he is more systematic.

11. His religious aspect of Monotheism, but as I have earlier said it is not the equivalent of توحید. He sometimes says that even God may be a "صنم"

* * *

II DR EVA DE VITRAY MEYEROVITCH. PARIS, FRANCE

She got her education at the University of Sorbonne and received docteur en Philosophie (Etat). Vice-President, Centre of Islamic Culture, Paris, Member, National Centre for Scientific Research, France. Was the visiting Professor Al-Azhar University, Cairo, Principal works include Mystique at Poesie en Islam, Rumi et le Soufisme, Anthologie du Soufisme, La traversee des signes and Dictionaire des symboles. Translated into French Iqbal's Payam-e-Mashriq and "Javed Nama". Fihi-ma-Fihi, by Jalaluddin Rumi, Dewan-e-Shams-e-Tabriz, Maarif by Sultan Walad and Rumi's Rubai,yat. Has also translated into French Iqbal's "The Reconstruction of Religious thought in Islam" and "Metaphysics in Persia" Author of a number of articles on Islam, sufism, Iqbal, Rumi and Muslim philosophy. President of brotherhood between Muslim and Christian friends.

Madam Meyervitch told me that she had embraced Islam. I took her interview in her room No. 336, where a number of other correspondents were also trying to take her interview but

by me is BAL-I-GIBRIL. There is philosophy and form in BAL-I-GIBRIL like and as he says

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

3 " Gabriel's Wing " by Dr Annemarie Schimmel. " Introduction to Iqbal " by Syed Abdul Wahid

4 The Translation of, " Javed Nama " in Italian

" An Anthology of Poems " including مسجد قرطبہ and شکوہ.

" Iqbal's religious philosophy in the West

" Iqbal and Dante "

" Iqbal's concept of " Iblees " translated into English and and published in " The Iqbal Review "

5 In Iqbal's view there are two aspects of this question ; one is revolutionary ard the other is conservative. There is always a danger that the people may exploit his thinking and this danger is from anti religious sentiments.

6 Iqbal has similar idea as I have i.e broadminded attitude towards philosophy.

7

ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجوست
چوں ما نیاز مند و گرفتار آرزوست
آہے سحر گہے کہ زند در فراق ما
بیرون و اندرون، زبر و زیر و چار سوست (زبور عجم)

8. Iqbal had really a modern thinking in his Presidential Address of Allahabad. Islam and cultural heritage is the basis

Persian Language and Literature, Insituto Universititario orientale, Naples in 1957 ; also held the chair of Urdu, Hindi, Indonesian, Malay and Modern languages of India. Presently, he is the Professor of Islamology and Head of the department of Islamic studies, University of Rome, Italy. He is a member of the National Academy of " Lincei ", the most important academy of Italy, founded in 1603 Ayub Regime awarded him Sitara-i-Imtiaz

His main fields of study are stylistic History of Persian Literature, Urdu Literature, Persian and Indo-Pakistani Sufism, Persian Religious History, Islamic and Indian influences on Malay Literature and Indonesian culture.

He has written a dozen books and over 100 articles published in scholarly journals. His works include, " Javed Nama's " translation (with introduction and commentary), an anthology of translations from Iqbal's poetical works and Rubaiyyat of Omar Khayyam, an Italian translation of the Quran, a history of the literatue of Pakistan

I took his interview at the Iranian Cultural Centre, Lahore on Monday, the 5th December, 1977 at 5.30 p.m. He appreciated the questionnaire and answered like this.

1. Iqbal's message is the idea of لا اله الا الله He wants to bring in the idea of Monotheism (توحید) but Monotheism is not synonymous with or equivalent of the Arabic word توحید , so it is the greatest force of the world and Iqbal wants that the mankind should come to this concept and not to adore many things.

2. I like two of his books. "Reconstruction of Religious thought in Islam" shows that perhaps he was the only Muslim in modern age who was rational in religion. His second book liked

1. What is the major and main point of Iqbal's message in your opinion ?
2. Which is your favourite book by Iqbal and why ?
3. Which are your favourite books written on Iqbal ?
4. What are the details of your research or critical work on Iqbal ?
5. What is the future of Iqbal's thinking in your opinion ?
6. Which side or aspect of Iqbal's character has fascinated your imagination ?
7. Your favourite poem or verse of Iqbal ?
8. What is the ideology of Pakistan in Iqbal's conception ?
9. What is the literary status of Iqbal as a poet ?
10. Do you love Iqbal as a poet or philosopher or in any other capacity ?
11. Which aspect of Iqbal's philosophy you like the most?

This congress was held at the Hotel Inter-continental and all the distinguished delegates were lodged in its building. Though it looked easy to contact them yet it proved an uphill task. These interviews were compiled and composed in seven days at various places. Some of them were taken in the bus while we were bound for Sialkot, the birth place of the poet of the East Allama Muhammad Iqbal. The valuable answers of the respected scholars are given below questions-wise. I have tried to give a brief introduction of each scholar, so that the readers may judge th · status and calibre of these scholars.

I. PROF. DR. ALESSANDRO BAUSANI

Professor Dr. Alessandro Bausani - born 1921, Rome, Italy : obtained Doctorate in 1943 : appointed Professor of

Anthology of Iqbal

(Interviews Edited on Iqbal's Art & Thought)

By
ABDUL JABBAR SHAKIR
M A .L L. B.

The year (1977) has got a peculiar and distinct position in the history of Pakistan as we are celebrating the first Iqbal centenary (1877-1977) to pay homage to the memory of Pakistan's Philosopher - Poet, Allama Mohammad Iqbal, an ardent and indefatigable exponent of Islam. He explored and explained the ideology of Pakistan based on the fundamentals and teachings of Islam. He was a great benefactor of the Muslim community in the sub-continent in particular and of the Muslim world in general. The first birth centenary of Allama Iqbal is being celebrated in the whole world but the Pakistani nation is paying homage to its spiritual leader and Philosopher poet in a different way and style. Especially, the University of the Punjab, Lahore has convened an international congress (2-8 December, 1977) in which hundreds of eminent foreign scholars have participated and read out their essays on the art and thought of Iqbal. It was the culminating point in Pakistan of Allama Iqbal's birth centenary celebrations. I feel honoured for having an opportunity to attend all the sessions and functions of this congress. Above all, I decided to interview the foreign scholars on Iqbal's art and thought and very fortunately I succeeded in taking 20 interviews in addition to 16 interviews taken in Urdu. The questionnaire prepared for this purpose was based on 11 points as follows :

(iii) that it consists in the upholding of the artist's personality ; and

(iv) that appreciation is the re-living of the artist's experiences.

Iqbal is strongly opposed to the first part. He endorses the second part as far as intellect grasps reality only piecemeal, while intuition grasps it in its wholeness. Regarding the remaining two parts, he is fully in agreement with Croce.

From the foregoing lines it is evident that Iqbal's theory of Art has as many facets as a diamond and each facet has a glint of its own. He is as much indebted to his predecessors as the coming generations will be indebted to him. Research or the improvement of a theory does not come to an end and it is always in the process of evolution. New comers enter the field and make further additions and amendments. May God bless all those who try to further the boundaries of knowledge by their endeavours !

میرے لئے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت
ہزار شکر، کہ مُلّا ہیں صاحبِ تصدیق!

نشانِ راہ جو دکھاتے تھے ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

From such verses one should not wrongly infer that Iqbal was not a true muslim. He criticizes them only for the sake of reform.

Iqbal started writing poetry, when the Indian nation was emerging out of decadence. His poetry acted as a catalytic agent and inspired the Indians to snatch independence from their foreign rulers. At one time he had an idea to stop writing poetry but his friends urged him to continue it so that the muslims of the sub-continent may be aroused. It is said that literature is a criticism of life and in this respect also his poetry satisfies the criterion. He has commented on every aspect of life. Even the materialism of Europe has not escaped from the fire of his criticism.

There is an equally important side of Iqbal's art and that is his *expressionism*. Plotinus was the progenitor of this view. An Italian Professor Croce, a contemporary of Iqbal, has given a new shape to this theory. Its main parts are as follows :

(i) that art is an activity, completely autonomous, and free from all considerations of ethics ;

(ii) that this activity is distinct from the activity of the intellect.

Opposed to those who hold the view 'Art for Art's sake' are the functionalists. For them art has a goal or purpose. The functionalists are divided into different groups, each of which has its own view of the function of art. The followers of Aristotle think that the main purpose of art is to give pleasure which results from the purgation of pent-up feelings. Iqbal does not subscribe to this view of art. Although he concedes the pleasure-giving qualities of classical Persian poetry yet he denounces it. Iqbal belongs to the second group of functionalists. Broadly speaking, for this group the function of art is social reform. Plato is the father of this type of functionalism. According to him, both in respect of its content and its form, art must serve ethical and instructional ends. Iqbal, though an avowed antagonist of Plato in his Methaphysics, is his disciple in his theory of art. No other poet is as great a pleader of didactic art as Iqbal. He is of opinion that art has no meaning without reference to life, man and society. The verse which brings a message of eternal life furthers the divine purpose like words of the Archangel and his voice announces the Day of Judgement. Poetry keeps the field of life green and bestows upon humanity everlasting life. The second aim of art is the making of men. The artist must infuse spirit, manliness and courage into the chickenhearted. It must create a yearning in the hearts of men for new ideals :

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے؟ یہی طغیانِ مشتاقی!

The third aim of art, according to Iqbal, is social advance. The poet is the eye of the society. He sees its ailments and criticizes it for the purpose of reform. Our national poet has criticized the religious leaders, political leaders and pseudo mystics in his poems, for he says :

In consonance with his theory of life he declares 'will' as the source of sentiments, feelings, emotions, ideas and ideals.

One of the theories of art that has come down to us from the Greeks is that of ***mimesis*** or imitation. It was held both by Plato and Aristotle. Plato was of opinion that art was twice removed from reality and hence there was no place for poets in his 'Republic'. According to him the lies told by poets about God and man have a baneful effect on the morals of the young people. He condemns drama altogether. Aristotle approves poetry as well as drama for their cathartic action on pent-up emotions. Iqbal is in agreement with Plato and condemns a certain type of poets. In one of his Urdu poems 'Theatre' he condemns drama because it destroys personality or Egohood. He agrees with Aristotle in approving poetry in so far as it is human creativeness because creativeness is a divine quality. He disagrees with Plato and Aristotle in regarding art as imitation. Although as a romantic he is a great admirer of nature yet according to him art is not the imitation of nature. Nature is an obstacle in the way of creativeness. He wishes that art should be freed from the shackles of nature for he says :

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو   صیاد ہیں مردان ہنر مند کہ نخچیر

He wishes that a poet should not imitate nature but improve upon it :

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی
گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی

In rejecting the thoery of imitation, Iqbal is not consistent with his own doctrine, for there is a type of imitation of which he himself is an advocate. It is the imitation of Divine Attributes in our own personality. He uses the word assimilation for it.

Iqbal's Theory of Art

By

Professor Syed Akbar Ali Shah

The word 'Art' has a very wide connotation. In this essay attention will be confined to Iqbal's literary art (Poetic Art only). His theory of art is eclectic and he has benefited from various sources and thus has evolved his own theory

Right from Homer to the present day, the poets and writers have said something about their art Most of the well-known English Poets like Milton, Keats, Shelley, Wordsworth, Arnold and others have left their theories of art in the form of essays In the case of Iqbal one has to depend upon his foreword to *Muraqqa-i-Chughtai* and his poems to build up a theory.

Before he started writing seriously, there were two theories of art in vogue. The first was 'Art for Art's sake' and the second was Formulism (ignoring the content of art and attaching aesthetic value to form only). He strongly opposes both these theories because he thinks that the poets are in direct lineage with the prophets and as such their duty is to make human life rich and beautiful and enable man to grapple with the problems and obstacles that crop up in the course of life. According to him that art is true which fortifies the Ego and the art that fails to do this is quite worthless He says that music without the content of volition, emotions and ideas is no better than dead fire.

نغمہ گر معنی ندارد مردہ ایست
سوز او از آتش افسردہ ایست

Alone or in the company of others.
Wherever I may be. it is the same
I notice how the lives we live disfame
Us before men unborne by earthly mothers.

The air and the soil that God created
Is now polluted and the atoms stink
From all the greedy thoughts we like to think
And from our needs to wholly over rated

It is a crime to crush what God has made.
And still we do it and are then afraid "

(X)

What Iqbal Said

14

" You know that God is present everywhere.
Performing all his tasks from day to day.
However ready men are to betray
His aims and to deny Him - He is there.

What you lament may only be a share
Of misdeeds and deceits that men display.
How wonderful if we could see a flare
Of how he works and where he walks his way

Come, let us trace at once in space and time
From bygone seeds what Herops today may grow
And see bad weeds that God will now undo
And praise his wondrous work in rhythm and rhyme

To find God's way we must today advance
On poets wings and in extatic dance

Mr. A. J. Shakir is permitted to Translate into Urdu and print these sonnets for his magazine.

Carl Elof Svenning
Carl Flof Sevenning.

As so they reach a small white bungalow.
Built on an island in a Swedish parish
Between the trees they find much peace to cherish
Their passage through the garden gate is slow

But now at once they recognize a face
That makes them feel at home in this new place

(VIII)

What Iqbal Said

12

" This is the Western poet whom I knew
To probe the anxious movements of my mind
He made me speak his tongue He stood behind
Some words I felt as fresh as falling dew.

Again we meet The sky is high and blue.
I recognize your face. Could I be blind
Enough to miss your features with their true
Deed insight which I found so rich and kind

But yet, my Rumi see his sorry eyes
His closed, pale lips have lost their happy laughter.
I only hope that he will recognize
His friends and know what work we should look after.

He must wake up His self should now refrain
From these depressions that invade his brain "

(IX)

What the Western Poet Said

13

" I am so happy to have met you, brothers.
And, please, permit me now to use this name
A deep and painful premonition bothers.
My mind and fills my heart with shame

What Iqbal Said

10-a

" So you may feel, my Master and my friend.
The world where we today have got to meet
Is full of hearts that from exhortation beat
Out doubt and distress to a waste old land

This good old Munich is like desert sand
Where mistrusts grow and living thoughts retreat.
Where no one can reach out a friendly hand,
Where safety moved away from every street.

But with its bitter loss of faith and joy
This place shall be the threshold of tomorrow
I feel as you. Today we must employ
Our wits to save these peoples from their sorrow

Come, let us find a poet from the North
To help us know how this could best come forth

(VII)

Meeting a Poet In the West

11

The shepherd will no longer travel on
In these unending foreign parts.
He looks for safety and oblivion.
But their Northwards journey starts.

In whirling dance the way is gone
And while they rest, deep in their hearts
Still as if following some mental chart
Their distant voyage seems in no time done

A poet's foresight must have filled your breast
While you returned again to Konya town
What was it then that stopped your dancing zest
That always gave you glory and renown ?

My Master, when I knew how very soon
You would be coming down to see me here
I thought how in a distant stellar sphere
You joined me once for visits to the moon

Are we again to tour that realm above
To reach for truths of paradise and love ? "

(VI)

What Rumi Said

10

" Well, I remember now how we were bound
To visit planets and to see those men
Whom we might ask, we thought so then,
If they had learned how real truth was found.

But now I walk on a disturbing ground
That moves me more. These people try to span
Their instrument to songs that lost their sound
Through every tune, I heard, discordance ran.

My soul is aching now for harmony
While I am staying on this sorry soil
I want to dance away those things that spoil
Their very lives. It is my task to be

That harmony, that recreating power
By which existence turns a fragrant flower "

There was no Shemseddin in their sphere.
He was no longer to be heard or seen
As in my book of poems he had been

But very often of one Iqbal I did hear.
And you must show me where this man is to be found
For to his whereabout we now are bound ".

(IV)

Meeting Iqbal

8

And so the shepherd and the Poet-Master
Went off by train from Konya to the West.
They hurried on, they did not stay or rest.
The shepherd found his world grow always vaster

But while the engine started to move faster
The Poet, on this train a ghostly guest,
Regarded through the window ruined plaster
In which this old and tired world was dressed.

And in a throng of children, wives and men
Who went as guests to serve in Western lands
They suddenly arrived at Munich station.

And on the platform with uplifted hands,
As if he would bring forth this strange occasion,
Stood Iqbal among crowds that cried and ran

(V)

What Iqbal Said

9

" My dear Master, how I am impressed
To see you walking in your order's gown.
In search of my abode you have come down
From endless skies, so well and saintly dressed.

(III)

What Rumi said

6

" I am the poet singing in the night
I am the prophet speaking to your mind
I am your inward peace at rest behind
All pressing fight to gain what you thought right

Today I was this dim and distant light
This memory of someone almost blind,
This guiding sign, not green, not red, but white,
To thoughts and memories deep in your mind

And you are happy who can rise and see
So slim and outcome of enter ial vision,
Far from the road to blindness and derision

And I will slowly bring you close to me
And I will open up your eyes and give
You access to those men who truly live "

(III-a)

What Rumi said

7

" Those truly great men that I saw by God,
Deep rooted in an everlasting love
Of him who rules all with his holy rod
In peaceful hands, not with a warriors glove.

Those whom I saw in prophet sandals shod
When I was scanning every path above
In Paradise and heard a turtledove
Coo, loving at whatever step I trod.

THE MARGHZAR

Our lives and bring us back from Paradise
Why should tonight it make us to appear

Again along this mountain road so near
Where once we ran like restless spies
In search of the supposed great seer
Whose life in Konya we but could despise ?

Are you related to the Shemseddin
That we were looking for so long ?
Who are you then ? Where have you been
In-spite of all our Master's mighty song ?

Like us our Master has again come down
And we should bring you back to Konya town "

(II)

Meeting Rumi

5

The shepherd answered with a slow and shy
Unwilling bow that he had long been living
In Tebriz And he left a strong misgiving
Towards these earthbound members of the sky

But they were anxious to explain just why
They must demand his kindness and forgiving :
Their master, the great Rumi, asked to pry
Into a lost world he would be reliving.

And so his sheeps and dog were taken over
And with the swiftness of a running dream
The shepherd moved away to Konya's border
There in the Blue Mosque of the Masters order,
Where he was standing in a golden stream
Of peaceful rest, great Rumi's soul did hover

But by that distant light my eyes were caught
And though the movement of my flock is slow
And though my midnight rest has come to naught
I must get closer to this friendly glow.

I must get there in time for morning prayer,
I cannot stay on this depressing slope,
I am drawn on by glowing rays of hope.
I have to run. I am no lazy strayer.

When I get there I shall be glad to rest,
For by its peaceful beams I must be blessed"

3

And so the shepherd with his sheep that bleat
And with his dog that always wants to bark
Advances slowly through the high land dark
Along a steep and narrow desert street

And suddenly the mist starts to retreat .
Quite easily the shepherd eye can now remark
How from some firebrand the light does spark :
The sheep, the dog, the shepherd here meet.

Some strange and solemn men who could not be
At home on this wild road by Ararat,
With whirling movements and a dervish hat,
They might arrive to him straight from eternity.

But all their movements emphasize the task
Of strongly stressing what they want to ask

A shepherd under mount Ararat

4

" From where are you and how did you come here?
This mountain that has learned to memorize

Carl Elof Svenning

Iqbal Seeing our Time and Speaking Today

(I)

A shepherd under mount Ararat

1

The Shepherd, on the mountain slope at night,
Assisted by his eager barking dog,
Moves with his flock towards a distant light
That flutters faintly through a dim bleak fog

But suddenly the soil is turning bright
And clouds are rising from a close-by bog
And in the water deep a hoarse old frog
Is speaking out enchantment and delight.

The Shepherd, walking on with steadfast Pace
To bring the barking dog, the bleating sheep
Off to a place where they can rest and sleep,
's holding up his earnest human face

Towards the light which leads him in his walking
And to the waning night his voice is talking.

2

' This night was darker than I ever thought,
And when I left Tebriz so long ago
I did not know how far I had to go
To reach the far off place where sheeps are brought

THE MARGHZAR

It is said that Iqbal gave the idea of perfect man. His perfect man is akin to gods and angels. This perfect man is a soldier and a firm believer in God. Iqbal calls this perfect man a Momin. This man, Iqbal desires, should fashion and mould his life strictly according to the teachings of Holy Quran. It is wrong to believe that his perfect man belongs to one region and one race. This perfect man trascends the barriers of time and place. He belongs to all Ages.

Not only Iqbal gave the idea of perfect man but also of a perfect student In School days, we almost every day prayed to God, to make our life like a candle that casts off the darkness

His ideal boy loves the old and the weak He is keen to help the poor.

Iqbal's conception of religion is also vastly different from the narrow minded Mullaism. He believes much in deeds than in words. Lip service is nothing What matters is faith. He says

Iqbal's ideas were the best amalgam of the East and the West. In spirit he was throughly an orientalist. He was the first to visualise an independent state for the Muslims of the sole continent. He presented this idea in his historical address at Allahabad

In his greatness Iqbal surpasses all the philosophers and the poets of the world, and in a few words it is not possible to write all about him.

MUHAMMAD ISHAQUE
Roll 59 IV Year

Iqbal ....

Iqbal was a great poet, a great philosopher and a great leader He was a precocious child and from his childhood he looked far behind the horizon of a common man He was endowed with a faculty and vision which was multidimensional. He was a brilliant scholar and his scholastic faculty he inherited from his father In school days he devoted himself to religion and by the time he did his matriculation he was throughly versed in theology

For higher academic pursuit Idbal had to come to Lahore. Here, at Government College, Professor Arnold, a man of discerning eye and fore-sight saw in him a prodigy. Under his guidence his abilities were replenished into fullness. Just when he was on the threshold of youth he earned recognition and admiration as a poet But his thirsty soul searched for a drink divine Contented he was not His heart ached at the misery and helplessness of the Muslims in the sub continent. They were the victims of the cruelty of the Britishers and the treachery of the opportunists Hindus The Hindus were reaping rich harvest whereas the Muslims were fed on the stubbles. This made him think to find out some means to take them out of the sphere of the sorrow And his efforts bore fruit.

He was not a pessimist and did not believe in "whatever is-is right" According to him, man himself is the master of his own distiny Through his poetry he gave a message of hope and redemption His poetry is replete with lofty ideas.

championship of 57 Kg Another student of first year Mr. Nawaz Ahmad secured the second position in 60 Kg championship Prof Abdul Khaliq and these students deserve commendation for this achievement

The following are the results of the College sports held on Inter Aiwan basis

Hockey	Champion	Aiwan Tariq Bin Ziyad
Football	..	Aiwan Salahuddin Ayubi
Cricket	..	Aiwan Khalid Bin Waleed
Volley Ball	..	Aiwan Salahuddin Ayubi
Kabbadi	..	Aiwan Khalid Bin Waleed
Badminton	..	Aiwan Tariq Bin Ziyad
Tug. of War	..	Aiwan Tariq Bin Ziyad

+ + +

College Round Up

To create innovativeness in the curricular and extra curricular activities of the College, our Principal has come out with a new Programme. The whole of the College has been devided into twenty tutorial groups. These tutorial groups have been further merged into five Aiwans, named after the great leaders, martyrs and rulers of Islam. Names of the Aiwans are Aiwan Tipu Sultan, Aiwan Khalid Bin Waleed Aiwan Tariq Bin Ziad, Aiwan Salahuddin Ayubi and Aiwan Muhammad Bin Qasim. This has been done in order to inspire the members of the Aiwans to inculcate in themselves those in trinsic qualities of the persons after whom their Aiwen has been named.

To this day this has proved to be immensely successful. Various sports, seminars and debates have been arranged on the Inter Aiwan basis. The students have participated in these contests with such gusto which never had been seen before. The contests are not yet over, they are still in the process. The interest and zeal shown by the students augers well that in future academic and extra curriculars activities will so captivate the heart of the students that they will really become an object of envy for other institutions. At the end of the academic session the Aiwan that will bag the highest number of points will be given away the trophy of the best Aiwan and till the next academic session the flag of this Aiwan will be hoisted with the flag of the College.

In the Inter Collegiate Wrestling Championship of the Lahore Board, Mr. Asghar Ali of II Year, of our College won the

we are hopeless about our young generation Now we don t need another Iqbal because we have his masterpieces with us. what we need is a new educational System a complete one This system will bring Quaid-i-Azam Iqbal and Tipu Sultan from this generation And we will prove that we are the Shaheen for whom Iqbal said

S MUTAHIR RIZVI
IV Year

Iqbal and Young Generation

As we all know that our national poet, the poet of the east Dr. Muhammad Iqbal was born on November 1, 1877 at Sialkot. He received his early education at Sialkot and higher education at Lahore and England. After spending the golden 61 years of his life he died on April 21, 1938. He was no doubt the greatest philosopher and poet of this subcontinent. He had a mission in his mind. In his rather short life he did the work that the Muslims of this sub continent cant forget. He did the work that " Ulma " and teachers could not do by their servious and teachings. He completed his mission by giving the concept of Pakistan. He arrived at this target in a very systematic manner. First he wrote the poems for the children. In these thoughtful poems he aimed at the regeneration of the Muslims of India. Then he came to the young generation and afterwords all his work was for this young generation. He had a great confidence in this generation. He was very hopeful about this young generation. But he was very sad to see that some men of this generation were moving away from their actual course. They were deviating from the right path. They were forgetting the great deeds of their ancestors. He wanted to remind them those golden days of the Muslims in the Past. He wanted to see the young men at the culmination of moral character. The young generation for him were like " Shaheen ". For him the main reason and the factor of the misleading of this generation was the wrong " Educational System ". He was not satisfied with the system and wanted some changes in it. Today, too,

THE MARGHZAR

He slumber deeps our belov a poet
His soul in anguish walks with pain,
To see his nation vile and vain,
Insincere, slavish, hollow and feign

O Men ' O Friends ' Wake up, Wakeup,
Glowing tribule to him is not all,
Make your country Great and strong,
The soul of Iqbal ask, you al'———

MUHAMMAD IQBAL
Roll No 110 IV Year

Iqbal

The Nation fettered in Slavery
Looked agape in despair,
Their path was dark and drearey
With no light but all fear.

Who will bring us out of this abyss
Of tortures, of agony, of despair,
The Oppressed Muslims, the Subdued Souls.
Questioned to heaven and pray'd to God

Who will break this chain and fetters ?
Who will cast off the coulds of despair ?
Who will infuse us to be free ?
Who will guide us through the dark ?

The Twentieth century brought new hopes,
In sable clouds, shone bright stars,
Muhammad Ali, Johar Ali and Iqbal,
With reverence and honour we them call.

The poet in fine frenzy rolling,
Glanced from earth to heaven.
And a vision, his vision brought,
Of a new country, of a new Land.

——: (✻) : ——

But alas ! soon we slumbered again,
We forgot our end. We forgot our aim.
We forgot our duty. We forgot our God.
Lost our faith, and lost our hope.

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش - اگرچہ سر نتراشد قلندری دانہ

مجلس اقبال گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Lahore, 8 December 1977

Dear Students of the Govt College at Shaikhupura,

I wish to tell you how I have enjoyed my stay in your beautiful country to which I was coming for the first time. The Congress on Allama Iqbal was excellent, and many scholars from abroad were given the opportunity of expressing their deep admiration for the great poet-philosopher of Pakistan, or rather of the world.

I am convinced that his message is of tremendous importance for our time, and that the young generation should study his thought in order to have a better understanding of our glorious religion, Islam.

Wa Salam alaikum.

Eva de Vitray-Meyerovitch
France.

(DR. Eva de Vitray-Meyerovitch, PARIS, FRANCE)

THE MARGHZAR

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش - اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

مجلس اقبال گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

To the students of the Govt. College of Shaikhupura & Marghzar Magazine.

It is my hope that your future personal & social life will embody the ideals of توحید as expressed by Iqbal. And this not in a narrow and practical sense, but as a powerful weapon to destroy all the idols that lie hidden even in the people who seem outwardly religious.

As Hafiz said:

دام تزویر مکن چون دگران قرآن را !

A Bausani . University of Rome

Coop. Buona Sorte Tre Pini
via F. De Grenet.
00128 Rome (Italy)

(PROF. ALESSANDRO BAUSANI
HEAD, DEPTT. OF
ISLAMIC STUDIES
UNIVERSITY OF ROME)

THE MARGHZAR

ما بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش ۔ اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

مجلس اقبال گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

For Marghzar Govt. College,
Sheikhupura.

Iqbal belongs to all Muslims. His message has struck a vital cord in our hearts. We Muslims must strive to gain higher selfhood and true knowledge.

Al-Attas

سید محمد النقیب العطاس

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش - اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

مجلس اقبال گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

I will quote from Javid Nama:

"I, who despair of the great sages of old, have a word to say touching the day to come!

I render my speech easy to the young, make my steps for them attainable."

If I can help in my way to render Iqbal's speech easy for the young, I would feel that I have fulfilled an urgent duty. We all have this duty.

Sheila McDonough, Dept. of Religion, Concordia University, Montreal, Canada

Iqbal's Tribute To Jinnah

In a letter to the Qaid-e-Azam

the late Allama writes

" You are the only Muslim in India

today to whom the community has a right to

look up for safe guidance through the storm which

is coming to North-West India, and perhaps to the whole

of India "

Editorial

Here in your a hand is the Iqbal Number of MARGHZAR. It is an anthology culled from the distinguished authors and scholors of the world who gathered in Lahore to pay homage to Iqbal.

We are conscious that we are bringing this issue rather too late,but we take the aegis of the oft repeated proverb and say it is better to be late than never How far we have been successful in making it worth the name of Iqbal, we leave it to you to judge

We are bringing it out at a time when our beloved country is passing through the greatest of crises Today we need determination, perseverence, dedication, unity, faith and discipline more than everbefore Let us sift our own deeds. How far we have put theteachings of Iqbal in practice ? The books of Iqbal, are merely show pieces of our shelves We do not follow them, we do not act on them. Now it is time to gird up our loins and dedicate ourselves, as teachers and taughts, with that zeal that manifested itself in the pre-independence days. The struggles and achivement of those young men, particularly of the College Students, are now a part of our history. So pine not for the lapses. No more of that It is a time when we should switch over from politics to academics. Let us begin this work whole heartedly and seek adventure among books and ideas. Let our sense of discipline pass from control to self control and educate ourself. Let us cherish for ourself,for our college honour and a fair name, good manners and civilized conduct and mutual affection."

We are greatly indebted to Professor Abdul Jabbar Shakir whose unending efforts in collecting the gems for "MARGHAZAR" lend it its present shape.

Editor

* History is a sort of applied ethics. If ethies is to be an experimental science like other sciences, it must be based on the revelations of human experience. A public declaration of this view will surely shock the susceptibilities even of those who claim to be orthodox in morality but whose public conduct is determined by the teachings of history

* I confess I am a bit tired of metaphysics. But whenever I happen to argue with people I find that their arguments are always based on certain propositions which they assume without criticism I am, therefore, driven to examine the value of these propositions The practical in all its shapes drives me back to the speculative. It seems to me to be impossible to get rid of metaphysics altogether.

* Justice is an inestimable treasure, but we must guard it against the thief of mercy.

* Philosophy is the logic of right. history the logic of might. The canons of this latter logic appear to be more sound than those of her sister logic

* There are some people who are sceptical and yet of a religious turn of mind The French Orientalist Renan reveals the essentially religious character of his mind in spite of his scepticism We must be careful in forming our opinion about the character of men from their habits of thought.

* What is the law of things? Continual struggle What must, then, be the end of education? Evidently, preparation for the struggle. A people working for intellectual superiority reveal thereby their feebleness

* The powerful man creates environment; the feeble have to adiust themselves to it.

From "Stray Reflections'

Allama Muhammad Iqbc

* Art is a sacred lie.

* Human intellect is nature's attempt at self-criticism

* My friends often ask me, "Do you believe in th existence of God?" I think I am entitled to know the meaning of the terms used in this question before I answer it. My friend ought to explain to me what they mean by "believe," "existence and "God", especially by the last two, if they want an answe to their question. I confess I do not understand these terms and whenever I cross-examine them I find that they do nc understand them either.

* Heart :- "It is absolutely certain that God doe exist"

  Head :- "But, my dear boy! existence is one of m categories, and you have no right to use it"

  Heart :- "So much the better, my Aristotle!".

* Excuse me a bit of cruel psychology. You fail i your enterprise, and now you wish to leave your home and tr your luck in other climes It is not because your ambition ha received a fresh spur from your failure; but chiefly because yo wish to hide your face from those who have witnessed you failure

* Hegel's system of philosophy is an epic poem in prose

CONTENTS

THE MARGHZAR

GOVERNMENT COLLEGE, SHEIKHUPURA

IQBAL NUMBER

Principal

Prof CH. MUHAMMAD NAWAZ

Incharge ·

Prof. ISLAM KHAN SAEED

Editor ·

AHMAD MIAN SIDDIQUE
M. A. English

Student Editor

SYED MUTAHIR RIZVI, IV Year

APRIL 1980